شاہد حمید
گئے دن کی مسافت
یادیں

شاہد حمید 1928 میں نکودر، جالندھر کے ایک گاؤں پرجیاں کلاں میں
پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد لاہور آ گئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور
سے انگریزی میں ایم اے کیا اور درس و تدریس کے شعبے سے منسلک ہو
گئے۔ پنجاب کے مختلف کالجوں میں پڑھایا اور 1988 میں گورنمنٹ
کالج لاہور سے پروفیسر ریٹائر ہوئے۔ شاہد حمید ایک مایہ ناز مترجم
ہیں۔ زمانہ طالب علمی ہی میں ڈیل کارنیگی کی ہردل عزیز کتاب
''پریشان ہونا چھوڑیے، جینا سیکھیے'' کا اُردو ترجمہ کیا اور پھر دنیا بھر
کے علم و ادب سے کتنی ہی عظیم کتابوں کا ترجمہ کر ڈالا۔ جین آسٹن کی
''تکبر اور تعصب''، طالسطائی کی ''جنگ اور امن''، دستوفسکی کی
''کراموزوف برادران''، ہیمنگوے کی ''بوڑھا اور سمندر'' اور ایڈورڈ سعید
کی ''فلسطین کا مسئلہ'' اُن کے اُردو تراجم کی چند مثالیں ہیں۔ شاہد حمید
کی زندگی کا سب سے بڑا کام دو ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل انگریزی
اُردو لغت ہے جو زیرِ طبع ہے۔ وہ لاہور میں مستقل سکونت پذیر ہیں۔
04-16 MN
www.calibritysmen.com

# گئے دن کی مسافت

# گئے دن کی مسافت

یادیں

القا پبلیکیشنز
ریختہ کا اشاعتی ادارہ
لاہور

انتظار حسین کی یاد میں

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

# 1

اڑاڑادھم۔اڑاڑادھم۔دیوار میں تریڑ آئی، بڑا سا شگاف بنا، دیوار زمین بوس ہوئی اور اپنے ساتھ چھت کو بھی لے ڈوبی۔

اڑاڑادھم۔اڑاڑادھم۔ایک اور دیوار میں تریڑ آئی، بڑا سا شگاف بنا، دیوار زمین بوس ہوئی اور اپنے ساتھ چھت کو بھی لے ڈوبی۔

اڑاڑادھم۔اڑاڑادھم۔پھر تو دیواروں میں تریڑیں آنے، شگاف بننے اور ان کے زمین بوس ہونے کا تانتا بندھ گیا، کبھی اکیلی دکیلی کا اور کبھی کئی ایک کا بیک وقت۔ایک دوڑ لگی ہوئی تھی کہ کون سب سے پہلے اپنی دھرتی ماں کی آغوش میں جاتی ہے۔دیکھتے ہی دیکھتے بستے بستے گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور وہ یوں صفحۂ ہستی سے ناپید ہو گیا جیسے اس کا کبھی وجود ہی نہ رہا ہو۔

پچھلے دو دن سے موسلا دھار مینہ برس رہا تھا اور ہر طرف جل تھل ہو گیا تھا۔گاؤں سے باہر نکلنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ پگڈنڈیاں جو مدتوں انسانوں کے پیروں کی مار سہتے سہتے سخت ہو چکی تھیں، اب ان کی مٹی اتنی نرم ہو گئی تھی کہ آدمی نے اس پر قدم رکھا نہیں کہ پیر اس میں دھنسا نہیں۔اگرچہ اب بارش میں خاصی کھروند (نرمی) آ گئی تھی اور صرف کوئی کوئی ٹپ (قطرہ) گر رہی تھی، مگر دریا پوری طرح جلال میں آ چکا تھا، اس کا پاٹ اتنا چوڑا ہو چکا تھا کہ اس کے اور چھور کا کچھ پتا ہی نہیں چلتا تھا۔پھر وہی ہوا جس کا سہمے ہوئے لوگوں کو ڈر تھا۔پانی کی زبردست چھل (موج) اٹھی، اس نے دریا کا بے بس کنارہ توڑا، منہ زور ریلا بنا اور آناً فاناً گاؤں میں داخل ہو گیا۔موسلا دھار بارش پہلے ہی کچی دیواروں کو سیلن زدہ اور کمزور کر چکی تھی، مرے کو مارے شاہ مدار، رہی سہی کسر دریائی چڑھت (طغیانی) کے ریلے نے پوری کر دی۔دو پلک جھپکنے میں گرتی اور زمین بوس ہوتی رہیں۔ہر طرف ہاہاکار مچ گئی۔مائیں شیرخواروں کو اور مرد بچوں اور بزرگوں کو سنبھالنے لگے لیکن پاؤں زمین پر ٹکتے ہی نہیں تھے، مسلسل ڈگمگائے جا رہے

تھے، کتنے ہی لوگ ریلے میں بہہ گئے اور جو باقی بچے، پتا نہیں کس طرح گاؤں سے باہر نکلنے اور اپنی جانیں بچانے میں کامیاب ہوئے۔ کچھ قدرت بھی مہربان ہوئی، دھوپ چمکنے لگی اور پانی کا ریلا جتنی تیزی سے آیا تھا اتنی ہی تیزی سے واپس مڑنے لگا۔

چھوٹے اور دور دراز کے علاقوں کی تاریخ نہیں لکھی جاتی اور نہ وہاں کے باشندوں کو جن ابتلاؤں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان کا کوئی ذکر کرتا ہے۔ یہ واقعہ کب پیش آیا تھا، کسی کو پتہ معلوم نہیں تھا۔ ہم نے اس کے متعلق اپنے بزرگوں کو باتیں کرتے اور انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا لیکن یہ واقعہ پیش ضرور آیا تھا۔ اس کی تصدیق دو باتوں سے ہو جاتی تھی۔ ایک تو یہ کہ گاؤں دو حصوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ جہاں یہ پہلے آباد تھا وہاں بہت وسیع و عریض قبرستان بن گیا تھا۔ دیہاتوں میں اتنے لمبے چوڑے قبرستان نہیں ہوتے۔ پھر اس قبرستان میں ٹوٹے پھوٹے برتنوں کی ٹھکریاں ٹھیکرے اب تک جگہ جگہ بکھرے پڑے تھے۔

گاؤں کا نام پرجیاں تھا۔ پرجی ارائیوں کی ایک گوت ہے اور ہمارے بزرگوں نے اپنی گوت کے نام پر اس کا نام رکھا تھا۔ جب سیلاب نے گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجادی، اُس کے باسیوں کو وہاں سے نکلنے اور کسی دوسری جگہ نیا پنڈ بسانے کے سوا اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ کچھ لوگوں نے پرانے گاؤں سے کوئی آدھ میل دور جنوب مغرب میں اپنے گھونسلے تعمیر کر لیے۔ ان کا گاؤں چھوٹیاں پرجیاں (پرجیاں خرد) کہلایا۔ مگر لوگوں کی کثیر تعداد مغرب کی جانب میل سوا میل آگے چلی گئی۔ وہاں زمین کا ایک ٹکڑا قدرے اونچائی پر واقع تھا۔ جس کو جہاں جگہ ملی، اس نے وہاں شتم پشتم اپنا گھر بنالیا۔ نتیجہ؟ گاؤں سے باہر نکلنے کے راستے تو خاصے فراخ تھے لیکن بعض گلیاں اتنی بھیڑی (تنگ) تھیں کہ اندرون لاہور کی گلیاں بھی شرما جائیں۔ اس گاؤں کا نام وڈیاں پرجیاں [لکھنے میں پرجیاں کلاں] تھا۔ راقم الحروف اسی گاؤں میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا تھا۔

جس علاقے میں یہ گاؤں آباد تھا، اسے بیٹ (بروزن پیٹ بمعنی شکم) کہا جاتا تھا۔ [اردو کے جانے مانے نقاد اور عربی کے بے مثل عالم جناب محمد کاظم نے مجھے بتایا کہ بہاولپور میں بھی اس قسم کے علاقے کو بیٹ ہی کہا جاتا ہے۔] کسی زمانے میں پنجاب کے دریا بہت منہ زور اور سرکش ہوا کرتے تھے اور دو دوڑیں مارتے ہوئے [کسی رکاوٹ کے بغیر من مانی کرتے ہوئے آگے بڑھنا] جدھر جی چاہتا، ادھر چل پڑتے تھے۔ راوی کسی زمانے میں لاہور کے شاہی قلعے کی دیواروں کے ساتھ بہتا تھا، پھر کھسکتے کھسکتے اس نے موجودہ گزرگاہ اختیار کر لی اور بڈھا راوی اور ایک خاصا بڑا نشیبی علاقہ پیچھے چھوڑ گیا جس میں آج کل قلعہ لچھمن سنگھ، مصری شاہ، فیض باغ جیسی آبادیاں بن چکی ہیں۔

بیاس بھی قصور، پاک پتن، بورے والا وغیرہ سے چند میل کے فاصلے پر بہتا تھا اور پھر کہیں دریائے ستلج

سے ملتا تھا۔ اس کی یہ پرانی گزرگاہ آج بھی موجود ہے اور جب برسات کا موسم آتا ہے تو یہ دوبارہ رواں دواں ہو جاتی ہے اور بعض اوقات تو سارا سال بہتی رہتی ہے۔ پھر شاید یہ دریائے ستلج سے اتنی بھی جدائی برداشت نہ کر سکا، اس نے اپنا رخ بدلا اور فیروز پور کے قریب ہی اس سے ہم آغوش ہو گیا۔

ستلج تو تھا ہی من مَتیا اور منہ زور دریا۔ برسات کے موسم میں اس کا پاٹ اتنا زیادہ پھیل جاتا کہ شمالی کنارے سے جنوبی کنارہ دیکھنا مشکل ہو جاتا۔ پھر اس کی ایک بھیڑی[1] (بری) عادت یہ تھی کہ یہ اپنے اردگرد کی زمین کو برباد بہت کرتا تھا۔ زمین کے اس طرح دریا برد کرنے کے عمل کو پنجابی میں ڈھاہ[2] لگانا کہا جاتا ہے۔ کسی زمانے میں جب دریا نے ڈھاہ لگانے کا شغل اختیار کیا تو وہ جنوب کی جانب کھسکتا چلا گیا اور اپنے پیچھے زرخیز دریائی مٹی سے بنی زمین کی خاصی لمبی پٹی بناتا چلا گیا۔ یہ پٹی کہیں آٹھ دس میل چوڑی تھی اور کہیں آدھ میل سے بھی کم تھی۔ یہ ضلع جالندھر کی تحصیل نکودر سے شروع ہوتی تھی اور تحصیل پھلور میں سے گزرتی تحصیل نواں شہر تک پہنچ جاتی تھی۔ [تینوں تحصیلیں دریائے ستلج کے شمالی کنارے کے متصل واقع تھیں۔ دریا نے جو نئی پٹی بنائی تھی، ہمارے ہاں اسے بیٹ کہا جاتا تھا۔ جہاں سے دریا نے ڈھاہ[3] لگانے کا عمل شروع کیا تھا، وہ خاصی اونچائی پر واقع تھا۔ ہمارے ہاں اسے ''ڈھاہا'' کہا جاتا تھا۔ (شفقت تنویر مرزا نے مجھے بتایا کہ پنجاب کے بعض دوسرے علاقوں میں بھی اسے ڈھاہا ہی بولا جاتا ہے۔]

بیٹ میں تقریباً نوے دیہات آباد تھے۔ یہ تقریباً سارے کے سارے مسلمانوں کے تھے، سکھوں کے گاؤں خال خال ہی تھے۔ رہے ہندو، وہ موجود ضرور تھے مگر آٹے میں نمک کے برابر۔ مثلاً 1941 کی مردم شماری کے مطابق ہمارے گاؤں کی آبادی 4200 سے اوپر تھی، اس میں ہندوؤں کی تعداد پندرہ بیس سے زیادہ نہیں تھی، شاید اتنی بھی نہیں، یہی حال باقی دیہاتوں کا تھا۔

پھلور اور نواں شہر کی تحصیلوں میں بیٹ کا جو حصہ تھا، میں اس سے کوئی زیادہ واقف نہیں تھا کیونکہ ادھر ہمارا آنا جانا بہت کم ہوتا تھا، لیکن نکودر کا بیٹ میرا اچھی طرح دیکھا بھالا تھا۔ اس بیٹ میں ارائیوں کی

---

1۔ پنجابی زبان کے بے شمار الفاظ ایسے ہیں جن کا صحیح تلفظ صرف پنجابی ہی ادا کر سکتے ہیں۔ اسے نہ سمجھایا جا سکتا ہے اور نہ اردو یا انگریزی میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ بھائی، بہن، بھیڑا، گھسٹ (اوسے میں تیرا گل (گلا) گھٹ دیاں گا)، ڈھاہا وغیرہ چند ایسے ہی الفاظ ہیں۔ بھائی میں بھ کی آواز بھ اور پ اور گھ کی گ اور ک کے مابین ہے۔ اردو کے عظیم فکشن نگار انتظار حسین 65 سال لاہور میں رہنے کے باوجود اس آواز کو سمجھنے میں غچا کھا گئے۔ انھوں نے اپنی ایک تصنیف میں بھا سعید کو پا سعید بنا دیا ہے۔ اگر غیر پنجابی بھیڑا کا صحیح تلفظ جاننے کے خواہش مند ہوں تو وہ پنجابی فلم پوتی کا گانا ''جا بھیڑا اپوتی'' سن لیں۔ اس میں شمشاد بیگم نے اسے بالکل صحیح انداز سے گایا ہے۔ یہ گانا You Tube پر دستیاب ہے۔

2۔ ایضاً

3۔ ایضاً

آبادی اسی فیصد سے بھی زیادہ تھی اور تقریباً سبھی کسی نہ کسی حوالے سے ایک دوسرے کے رشتہ دار تھے، کوئی قریب کے، کوئی دور پار کے۔ اگر کوئی براہ راست آپ کا قرابت دار نہ بھی ہوتا تو قرابت داروں کا قرابت دار نکل آتا۔ پنجابی کی ایک ضرب المثل بہت مشہور ہو چکی تھی: اٹ پٹو تو ڈھوں ارائیوں دا رشتے دار نکل آوے گا۔ یوں یہ ساری برادری ایک وسیع خاندان کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ آپس میں یگانگت، موانست اور جدید امریکی ماہرین نفسیات جسے connectivity[1] کہتے ہیں، وہ ان میں وافر مقدار میں پائی جاتی تھی۔ آپ کسی بھی گاؤں میں چلے جاتے، آپ کو اجنبیت کا قطعاً احساس نہ ہوتا کیونکہ اگر کوئی رشتے دار نہ بھی ہوتا، کوئی نہ کوئی واقف کار ضرور مل جاتا۔

1907 کا جالندھر گزیٹیر (gazetteer) ہمیں بتاتا ہے کہ 1901 کی مردم شماری کے مطابق جالندھر پنجاب کا گنجان آباد ترین ضلع تھا۔ [ پنجاب (انڈیا) کی سرکاری ویب سائٹ میں بتایا گیا ہے کہ دریائے ستلج اور دریائے بیاس کے درمیان کا علاقہ، جو عرف عام میں دوآبہ کہلاتا ہے اور جس میں ضلع جالندھر بھی واقع ہے، دنیا کے زرخیز ترین علاقوں میں شمار ہوتا ہے اور بھارت میں جو سبز انقلاب آیا تھا، اس کا مرکز بھی یہی علاقہ تھا، آج بھی فی کس زیادہ سے زیادہ گندم اگانے والے علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ ] ہمارا علاقہ کوئی خاص بڑا علاقہ نہیں تھا لیکن دریائی مٹی سے بنے ہونے کے طفیل زرخیز بہت زیادہ تھا۔ پانی کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس لیے یہاں آبادی کا دباؤ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ یوں تو پورے ضلع میں بہت بڑا زمیندار، جاگیردار یا وڈیرا کوئی نہیں تھا [ اس تعلق سے ہمارا واسطہ پاکستان بننے کے بعد پڑا ]، اور بیٹ میں تو بالکل ہی نہیں تھا۔ تمام کسان اپنی زمینوں کے خود مالک تھے۔ مگر یہ زمینیں نسل بہ نسل تقسیم در تقسیم ہوتے صرف اتنی رہ گئی تھیں کہ ہر خاندان کے حصے میں صرف چند ایکڑ ہی آتے تھے، کسی کے پاس پانچ ایکڑ، کسی کے پاس سات ایکڑ، دس بارہ ایکڑ والے تو خال خال ہی تھے۔ نہ کوئی اتنا غریب کہ بالکل ہی بھوکوں مرنے لگے اور نہ اتنا امیر کہ دوسروں پر حاوی ہو جائے۔

یہ معاشرہ صحیح معنوں میں egalitarian[2] معاشرہ تھا۔ کسی کو کسی پر تفوق حاصل نہیں تھا۔ اگر منجیوں (چارپائیوں) پر بیٹھے ہیں تو سبھی منجیوں پر، اور اگر زمین پر تو سبھی زمین پر۔ جہاں تک کہ وہ لوگ جن کا

---

1- اپنے آپ کو دوسروں سے منسلک کرنے، ان کی بات سننے، ان کی خوشیوں، دکھ درد وغیرہ میں شریک ہونے کی صلاحیت وغیرہ۔ اپنائیت اور یگانگت کا احساس۔ جدید دور کا المیہ یہی ہے کہ ہم سب اپنی اپنی ذات کے اسیر ہو گئے ہیں اور ایک دوسرے سے کٹ کر رہ گئے ہیں۔

2- مساوات پسند۔ اس قسم کے معاشرے میں اونچ نیچ نہیں ہوتی اور اسے اس اصول پر استوار کیا جاتا ہے کہ سب لوگوں کو مساوی / یکساں حقوق اور مواقع ملنے چاہئیں۔

تعلق حرفت سے ہوتا تھا اور جنھیں عرف عام میں کمین (پنجابی: کمی) کہا جاتا ہے، انھیں بھی باعزت سمجھا اور برابری کا درجہ دیا جاتا تھا۔ انھیں کمی ضرور کہا جاتا تھا مگر اس میں حقارت نام کا کوئی پہلو نہیں پایا جاتا تھا، محض شناخت کے لیے انھیں اجتماعی طور پر کمی کا نام دیا جاتا تھا۔

چونکہ آبادی بے تحاشا بڑھتی جا رہی تھی اور ضروریات پورا کرنے کے دستیاب وسائل میں کوئی اضافہ نہیں ہو رہا تھا، لوگوں کو اس گمبھیر صورت حال سے چھٹکارا حاصل کرنے کے صرف تین راستے بھائی دیے اور انھوں نے وہ تینوں کے تینوں اختیار کیے۔ لیکن یہ جو کچھ ہونے لگا تھا، کسی منصوبے کے تحت شروع نہیں ہوا تھا بلکہ ایک روچل پڑی تھی جس میں سب بہنے لگے تھے۔

1- پنجاب کے جن اضلاع میں نہریں تعمیر ہو رہی تھیں، وہاں جاتے، زمینیں خریدتے، انھیں آباد کرتے اور اپنی روزی کماتے۔

2- غیر ممالک کا رخ کرتے، کوئی ذریعہ معاش ڈھونڈتے، روپیہ پس انداز کرتے اور اپنے گھر والوں کو بھیجتے۔

3- تعلیم حاصل کرتے اور ملازمتیں تلاش کرتے۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ساندل بار (لائل پور اور جھنگ کے اضلاع) اور نیلی بار (منٹگمری (موجودہ ساہی وال) اور ملتان کے اضلاع) وغیرہ میں جب نہریں تعمیر ہوئیں تو ان سے سیراب ہونے والی زمینوں کو آباد کرنے کے لیے نفری کی ضرورت پیش آئی۔ چونکہ پانی کی کمی کی وجہ سے بیشتر زمینیں ویران پڑی تھیں اور مقامی آبادی اتنی کم تھی کہ انھیں سنبھال نہیں سکتی تھی، چنانچہ پنجاب کے نسبتاً خوش حال مگر گنجان آباد اضلاع کے باشندوں کو ترغیب و تحریص دی جانے لگی کہ وہ آئیں، کوڑیوں کے بھاؤ زمینیں خریدیں اور انھیں آباد کریں۔ پراپیگنڈا کرنے والی ٹیموں میں اکثر خود انگریز بھی شامل ہوتے تھے۔ بے شمار لوگ تو صاف انکار کر دیتے [ان میں ہمارے بزرگ بھی شامل تھے کیونکہ وہ کسی قیمت پر بھی اپنے آبائی گھر چھوڑنے اور جمے جمائے معاشرے سے کٹ جانے کے لیے تیار نہیں تھے]۔ پھر بھی ایک خاصی بڑی تعداد پراپیگنڈا ٹیموں کی چکنی چپڑی باتوں سے متاثر ہو جاتی، جو جمع جتھا ہوتی، اسے سمیٹتے، رخت سفر باندھتے اور نئی منزل کی جستجو میں نکل کھڑے ہوتے۔ ان نوآبادکاروں کو بنجر، ویران اور نامانوس علاقوں میں کیا کیا مشکلات پیش آئیں، آج بھی ان کا تصور کرتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پہلی مشکل تو پینے کے صاف اور میٹھے پانی کا حصول تھا۔ اتنا وقت تھا نہ سرمایہ، نہ ساز و سامان اور نہ کاریگر کہ وہاں کنویں کھودے جاتے۔ اگر بعض لوگ کھود بھی لیتے، بیشتر مقامات پر کھارا پانی نکل آتا۔ ہر طرف ویرانہ ہی ویرانہ تھا، دور دور تک ہُو کا عالم طاری تھا، کوسوں کے

بعد کہیں مقامی آبادی کی کوئی بستی نظر آتی تھی۔ اس مشکل کا ایک حل یہ ڈھونڈا گیا کہ جگہ جگہ بہت گہرے اور بڑے بڑے تالاب کھودے گئے۔ [ان تالابوں کو ٹوبے کہا جاتا تھا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا گاؤں اور اب ضلعی صدر مقام اسی قسم کے ٹوبے کے گرد آباد ہوا تھا۔ اسے ایک سکھ سردار ٹیک سنگھ نے بنوایا تھا۔] انھیں نہر کے پانی سے بھرا جاتا۔ کچھ دنوں کے بعد یہ پانی قدرے نتھر جاتا۔ انسان اور ان کے مویشی دونوں یہی پانی پیتے۔ لوگ اپنے پینے کے پانی کو کچھ مزید صاف کرنے کے لیے اس میں پھٹکری ملا دیتے۔ وہ اسی پانی سے اپنے بدن اور کپڑے دھوتے اور اسی سے کھانا پکاتے۔ بعض علاقوں میں یہ ٹوبے اب بھی موجود ہیں۔ راقم الحروف نے ایک ضلع بہاولنگر کی تحصیل ہارون آباد میں اپنے رشتے داروں کے گاؤں میں دیکھا تھا۔

دوسری مشکل یہ تھی کہ رہائش کہاں اختیار کی جائے۔ مکان بنانے کے لیے وقت، سرمایہ، کاریگر اور مختلف قسم کی تعمیراتی اشیا چاہییں۔ ایک اور دقت یہ تھی کہ مقامی طور پر لکڑی بھی دستیاب نہیں تھی۔ پانی کی قلت کی وجہ سے ان ویرانوں میں کوئی بڑا درخت پنپ نہیں سکتا تھا، صرف پیلو، ڈیلوں جیسی ٹنڈ منڈ جھاڑیاں کہیں کہیں اگ آتی تھیں۔ اس قسم کی جھاڑیوں سے وقتی گزارے کے لیے جھگیاں بنائی گئیں یا پراتے سرانے کپڑوں سے خیمے (تمبو) کھڑے کیے گئے۔ چونکہ اونچے اور تناور درخت مفقود تھے، تیز ہواؤں کی روک ٹوک ناممکن تھی۔ اکثر آندھیاں چلتی رہتیں، جس چیز پر ان کا بس چلتا، اسے اپنے ساتھ اڑا لے جاتیں اور اپنے پیچھے گرد و غبار کی دبیز تہیں چھوڑ جاتیں۔ بعض اوقات اس قدر دھند حل (دھول) سے اٹی ہوتیں کہ دن کو بھی رات کا سماں بندھ جاتا۔ انسان، حیوان اور گھر بار کی تمام اشیا پر اس قدر گرد جم جاتی کہ صفائی کرنا کارے دارد بن جاتا۔

ان ویرانوں کو آباد کرنے کے لیے حکام دوسرے علاقوں کے کسانوں کو بہلا پھسلا کر اور تسلیاں دے کر لے تو آئے تھے لیکن یہ لوگ خالی ہاتھ تو کام نہیں کر سکتے تھے، انھیں بیج اور آلات کشاورزی کی بھی ضرورت تھی۔ انھیں وہ دور و نزدیک کی مقامی آبادیوں سے خریدتے ہوں گے یا شاید خود سرکار ہی سستے داموں مہیا کر دیتی ہوگی۔ لیکن زرعی آلات کی مرمت کرنے اور بلدوں (بیلوں) کے کھروں کے نیچے کھریاں (نعل) لگانے کے لیے بھی کاریگروں کی ضرورت بھی پیش آتی ہوگی۔ ان بے آب و گیاہ ویرانوں میں کاریگروں کو کیا کشش نظر آتی ہوگی کہ وہ اس خواہ مخواہ کی مصیبت میں پڑتے۔ نو آبادکار اس مشکل کا کیا حل ڈھونڈتے ہوں گے، مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔

پنجاب کے متعدد دیگر اضلاع کی طرح ہمارے ضلع کے بے شمار لوگ، طوعاً و کرہاً ہی سہی، یہاں آباد

ہو گئے۔ جب وہ ایک دفعہ گھر سے نکل پڑے، پھر انھوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر ہی رہیں گے۔ انھوں نے اپنے عزم صمیم اور دن رات کی محنت مشقت کے بل بوتے پر تمام مشکلات پر قابو پالیا اور بعد میں خوشحالی کا منہ بھی دیکھ لیا۔ مگر اب اس خوشحالی کے مفقود ہونے کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں۔ ہمارے بیٹ کی طرح آبادکاروں کی زمینیں بلکہ مشرق پنجاب سے ہجرت کر کے آنے والے اکثر لوگوں کی زمینیں بھی تقسیم در تقسیم ہوتے چند ایکڑوں بلکہ کنالوں میں باقی رہ گئی ہیں۔ یہاں کے جاگیرداروں نے دیہاتوں کی اکثریت کو عمداً ناخواندہ رکھا ہے۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ غریب، نادار اور پس ماندہ کسان جوق در جوق بڑے شہروں کی طرف بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ شہروں پر دباؤ بڑھتا جا رہا ہے، کچی آبادیوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور نت نئے لاینحل مسائل کھڑے ہو رہے ہیں۔ خود غرض حکمرانوں کو بس اپنے اپنے تخت بچانے کی تشویش لاحق رہتی ہے۔ کسی کو ان مسائل کو حل کرنے کی کوئی فکر ہے نہ فرصت۔

ارائیں بنیادی طور پر شریف النفس، بھلے مانس، امن پسند، لڑائی جھگڑوں سے دور بھاگنے والے لوگ ہیں۔ آپ انھیں بزدل یا ڈرپوک بھی کہہ سکتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ پولیس کے کسی معمولی سے سپاہی کی شکل دیکھتے ہی اپنا راستہ تبدیل کر لیتے اور کسی دوسری گلی میں پڑ جاتے تھے۔ انگریزوں کو ان کے شاید یہی اوصاف بھا گئے۔ انھوں نے لائل پور (اب فیصل آباد)، منٹگمری، سمندری، ٹوبہ ٹیک سنگھ جیسے نئے شہروں اور قصبوں کے ارد گرد کی زمینیں آباد کرنے کے لیے ان لوگوں کو ترجیح دی اور سکھوں کو قدرے دور دراز کے علاقوں میں بھیجا۔ سکھ تو تقسیم ہند کے بعد بھارت چلے گئے لیکن ان ارائیوں کی اولادیں اب بھی انھیں علاقوں میں آباد ہیں۔

ولایت، دساور یا ملک غیر، آپ جو جی چاہے کہہ لیں، جانے کا رواج انیسویں صدی کے وسط میں ہی ہو گیا تھا۔ اس زمانے کے ہندوستان میں، بلکہ بعد میں پاکستان میں بھی ذوالفقار علی بھٹو کے عہد حکومت تک، پاسپورٹ کا حصول جوئے شیر لانے سے بھی مشکل کام تھا۔ جزائر غرب الہند، جنوبی افریقہ اور مشرقی افریقہ میں انگریزوں کو لیبر کی سخت ضرورت تھی۔ کالوں کو غلام بنانے کا سلسلہ بند ہو چکا تھا کیونکہ یورپ میں غلامی کو قانوناً ممنوع قرار دیا جا چکا تھا۔ چنانچہ اس خلا کو پورا کرنے کے لیے انگریزوں نے حقیقی یا فرضی قرضوں کی عدم ادائیگی کو بہانہ بنا کر ہندوستان کے مختلف علاقوں کے لوگوں کو پکڑنا اور انھیں زبردستی مندرجہ بالا ممالک میں بھیجنا شروع کر دیا۔ [اس قسم کے مزدوروں کو bonded labour کہا جاتا ہے۔ اس کا رواج اب بھی امریکا اور برصغیر کے تمام ممالک سمیت دنیا کے ہر خطے میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ پاکستان میں اینٹوں کے بھٹوں کے محنت کشوں اور خرکاروں کے بیگار کیمپوں میں کام کرنے والوں کو

اس زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔ ان ملکوں میں آج بھی برصغیر کے لوگوں کی جو معقول تعداد موجود ہے، وہ زیادہ تر انھیں زبردستی بنائے گئے مزدوروں کی اولاد ہے۔ انگریزوں کے اس عمل سے بعض دیگر لوگوں کو یہ ترغیب ملی کہ روزی اپنے ملک میں ہی نہیں، باہر کے ملکوں میں جا کر بھی کمائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ جب برضا و رغبت باہر جانے کا سلسلہ ایک بار شروع ہو گیا، تو اس نے ختم ہونے کا نام نہ لیا، بلکہ آج تک جاری ہے۔

باقی ہندوستان کے لوگ پاسپورٹ کے حصول کے لیے کیا طریقے استعمال کرتے تھے، مجھے ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں لیکن گوردہیت کے لوگ جو کچھ کرتے تھے، میں اس سے بخوبی آگاہ تھا۔ پاکستان بننے تک متحدہ پنجاب میں صرف ایک ہی پاسپورٹ آفس تھا اور وہ لاہور میں تھا۔ پاسپورٹ بنوانے کے لیے آپ لاہور جاتے، کسی نہ کسی طرح فارم حاصل کرتے (چونکہ اکثر لوگ ناخواندہ ہوتے)، کسی ایجنٹ (اگر یہ جنس اس وقت وجود میں آ گئی تھی) یا کسی رحم دل اور مہربان شخص سے اسے پر کراتے، مقررہ فیس اور فارم پاسپورٹ آفس میں جمع کرا دیتے۔ یہاں سے ان کی مشکلات کا نیا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ دفتر نذرانہ وصول کر کے یا منتیں ترلے کرانے کے بعد آپ کی درخواست یوں وصول کرتا جیسے آپ پر بہت بڑا احسان کیا جا رہا ہو۔ بعض اوقات درخواستوں پر طرح طرح کے اعتراضات لگائے جاتے اور انھیں واپس کر دیا جاتا۔ بے چارہ نادار، ناخواندہ، بے وطن سائل ادھر ادھر دھکے کھاتا پھرتا، فارم دوبارہ کسی سے پر کراتا اور پر رعونت بابو صاحب کی خدمت میں پیش کرتا۔ اگر آپ کی درخواست کو شرف قبولیت حاصل ہو جاتا تو پھر اسے لاپروائی سے کسی ٹوکری، رجسٹر یا الماری میں پھینک دیا جاتا۔ چند دن کے بعد اگر کسی کو خیال آ جاتا، اس پر دفتری کارروائی شروع ہو جاتی۔ فائل جوں کی رفتار سے چلتی ایک میز سے دوسری میز تک پہنچتی تا آنکہ وہ بڑے صاحب کی خدمت میں دست بستہ پہنچتی، وہ اس پر نگاہ غلط انداز ڈالتا [وہ بھی اس وقت جب بڑے صاحب کے پاس ان فالتو کاموں کے لیے فرصت ہوتی ورنہ فائل کئی کئی دن اس کی میز پر پڑی اپنے مقدر کو روتی رہتی)، اس پر کمال استغنا سے اپنے دستخط گھسیٹتا اور حکم دیتا کہ سائل کے مقامی تھانے کو چٹھی لکھ کر اس کی نیک چلنی کی تصدیق کرائی جائے۔ پولیس کے پاس اتنی فرصت اور نفری کہاں کہ وہ تھانے سے کئی میل دور آپ کے گاؤں میں اپنے کسی ادنیٰ سپاہی ہی کو بھیجتی اور اس کے ذریعے آپ کے چال چلن کی تفتیش کراتی۔ پاسپورٹ آفس کی چٹھی یوں ہی پڑی رہتی۔ پھر محرر تھانے دار کو یاد دلاتا کہ اس قسم کی چٹھی آئی ہوئی ہے، سرکاری چٹھی ہے، اس پر کارروائی تو کرنا ہی ہو گی۔ "اچھا" تھانے دار جواب دیتا: "فلاں سپاہی کو بھیج دو۔ سالا سارا دن تھانے میں ویلا (بیکار) پڑا رہتا ہے، اسے بھی

کچھ ہاتھ پاؤں ہلانے چاہئیں۔" محرر سپاہی کو بلاتا اور اسے سائل کے گاؤں بھیج دیتا۔ سپاہی صاحب اپنی شکن آلود وردی میں خراماں خراماں گاؤں میں داخل ہوتے۔ اکثر لوگ تو اس کی شکل دیکھ کر ہی لرزہ براندام ہو جاتے اور بہ عجلت کسی دوسری گلی میں مڑ جاتے۔ سپاہی صاحب نمبردار اور چوکیدار کو حکم دیتے کہ سائل کو ان کی خدمت میں حاضر کیا جائے۔ سائل کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی اور اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہوتیں، بعض اوقات اس کی گھگھی بھی بندھ جاتی۔ وہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر سپاہی بلکہ نمبردار کی بھی تواضع کرتا اور حسب توفیق ان کی خدمت کرتا۔ پھر سپاہی صاحب اگر سائل پر مائل بہ کرم ہو جاتے تو تھانے رپورٹ جمع کراتے کہ سائل واقعی نیک چلن ہے، اس نے کبھی چوری چکاری نہیں کی (اس کی گواہی نمبردار اور چوکیدار دیتا ہے) اور نہ کبھی انگریز کی حکومت کے خلاف کسی سازش میں شریک ہوا ہے۔

اس "گمبھیر" تحقیق و تفتیش میں کئی دن گزر جاتے۔ ادھر پاسپورٹ آفس بھنگ پی کر لمبی تان کر خواب خرگوش کے مزے لیتا رہتا اور کبھی یاد دہانی کرانے کی مشقت گوارا نہ کرتا۔ ادھر سپاہی صاحب کی رپورٹ موصول ہونے کے بعد تھانیدار صاحب بہادر چاہے اسے اسی روز پاسپورٹ آفس روانہ کر دیتے، چاہے کئی کئی دن تک یونہی پڑا رہنے دیتے تا آنکہ ان کا اپنا مال پانی انھیں موصول نہ ہو جاتا۔

پولیس کی رپورٹ وصول ہونے پر پاسپورٹ آفس انگڑائی لے کر بیدار ہوتا اور آپ کا پاسپورٹ بنانے کی منظوری حاصل کرنے کی کارروائی شروع ہو جاتی۔ فائل حسب معمول مختلف مراحل طے کرتی بالآخر بڑے صاحب کی میز تک پہنچتی۔ وہ اس پر دستخط ثبت فرماتے اور فائل اپنی واپسی کا سفر شروع کر دیتی اور جانے پہچانے مراحل طے کرنے کے بعد دوبارہ کلرک صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جاتی۔ کلرک صاحب الماری کھولتے، خالی پاسپورٹ نکالتے، اس کے مختلف خانے پر کرتے اور فائل سمیت بڑے صاحب کی خدمت میں بھیج دیتے تا کہ وہ اس پر اپنے دستخط ثبت کر سکیں۔ لیجیے جناب، آپ کا پاسپورٹ تیار ہو گیا۔ اگر اس نیک کام میں آپ کے پانچ سات ماہ صرف ہو گئے، آپ کو بار بار لاہور کے چکر لگانا پڑے اور آپ زیر بار ہوتے چلے گئے، تو کوئی مضائقہ نہیں، آپ کو تو اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھنا چاہیے، خوشی سے آپ کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکنا چاہئیں، آخر آپ کے ہاتھ ایک نادر و نایاب چیز آ گئی ہے۔ واہ، انگریز بہادر، مقامی لوگوں کا شکنجہ کسنے کے لیے کیا نظام وضع کیا۔ خود تو چلا گیا مگر اپنی سوغات یہیں چھوڑ گیا جو ہمیں چھنا مار کر یوں چپٹی ہوئی ہے کہ اس سے پیچھا چھڑانا ممکن ہی نظر نہیں آتا حالانکہ اگر صدق دل سے امریکا کی طرز کا مقامی حکومتوں کا نظام یہاں بھی رائج کر دیا جائے تو لوگوں کو اپنے مسائل حل کرانے کے لیے ملک یا صوبے کا دارالحکومت تو بہت دور کی بات ہے، ضلعی یا تحصیل ہیڈ کوارٹر بھی نہ جانا

پڑے، بیشتر امور یونین کی سطح پر ہی طے پا جائیں۔ امریکا جا کر دیکھ لیں وہاں یہی کچھ ہوتا ہے۔ اس صورت میں لوگوں کو نئے صوبوں کا مطالبہ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ لیکن جاگیرداروں اور سیٹھوں کی حکومتیں یہ کام کبھی نہیں کریں گی، وہ لوٹ مار کیسے اور کہاں کریں گی؟ دھونس کسے دیں گی؟ اپنے خود ساختہ اختیارات کہاں استعمال کریں گی؟

جو کہہ دیا بندہ۔ مشکلات کے اس پہاڑ کو سر کرنے کے لیے بیٹ کے لوگوں کے ہاتھ ایک آسان نسخہ آ گیا تھا۔ (قیاس کہتا ہے کہ اس نسخے پر ہندوستان کے دیگر علاقوں کے لوگ بھی عمل کرتے ہوں گے ورنہ گوروں کی ٹریول ایجنسی ٹامس کک کا کاروبار کیسے چلتا؟) وہ پیدل گوجر خان پہنچتے، گاڑی پکڑتے اور لدھیانہ چلے جاتے۔ وہاں سے بمبئی جانے والی کسی گاڑی پر سوار ہوتے، سٹیشن پر اترتے اور سیدھے انگلستان کی مشہور ٹریول ایجنسی ٹامس کک (Thomas Cook) کے مقامی دفتر میں حاضر ہو جاتے [مقامی ٹریول ایجنسیاں ابھی وجود میں نہیں آئی ہوں گی]۔ ایجنسی کے کارندے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتے، خود ان کے پاسپورٹ بنواتے، ٹکٹ بناتے اور برطانیہ جانے والے کسی بحری جہاز میں سوار کرا دیتے [برطانوی ایمپائر کا حصہ ہونے کی وجہ سے اس زمانے کے ہندوستان کے شہریوں کو ویزا لگوانے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی]۔ ان کا جہاز نہر سویز اور بحیرہ روم میں سے گزرتا انگلستان کی کسی بندرگاہ (عموماً ساؤتھمپٹن) پر لنگر انداز ہوتا۔ باقی مسافروں کی طرح یہ لوگ بھی اترتے اور عام طور پر سیدھے لنکا شائر چلے جاتے۔ وہ مانچسٹر اور گرد و نواح کے قصبوں کی ملوں میں کام نہیں کرتے تھے [ان ملوں میں کام کرنے کے لیے جانے والوں کا تانتا جنگ عظیم دوم کے بعد بندھا جس میں برطانیہ کے نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد ہلاک ہو گئی تھی اور ملوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد میں شدید کمی آ گئی تھی]۔ وہ ہوزری (از قسم بنیان، جانگیا، انگیا وغیرہ) اور چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں کے باسیوں کی ضرورت کی دیگر چھوٹی موٹی اشیا خریدتے جنھیں کسی بڑے تھیلے میں آسانی سے ترتیب وار رکھا جا سکتا اور کمر پر لادا جا سکتا تھا اور اپنی نئی منزل کی جانب چل پڑتے۔ وہ پھیری والوں کی طرح گلیوں کے چکر لگاتے، گھر گھر دستک دیتے اور گاہک پھانسنے کی کوشش کرتے تھے۔ انھیں انگریزی مطلق نہیں آتی تھی، ادھر ادھر سے دو چار الفاظ سیکھ کر اپنا کام چلا لیتے تھے۔ ان کی گاہک زیادہ تر گھریلو خواتین ہوتی تھیں اور خواتین برصغیر کی ہوں یا ولایت کی، مول تول ضرور کرتی ہیں۔ بعض اوقات قیمت پر جھگڑا بڑھ جاتا اور یہ غصے میں آ کر کچھ اس قسم کی زبان بولنے لگتے: ''ٹیکنا ہے تو ٹیک (take)، ورنہ اگلی شاپ (shop) دیکھ۔ وہ اپنا سمندری سفر کچھ اس طرح بیان کرتے تھے: بھری سی (sea) تے سٹرم (storm) آ گیا، ونڈے (windows) کلوز (close) تے ڈورے (doors)

شٹ (shut)۔ خود یہ لوگ بہت کفایت شعار بلکہ جز رس ہوتے تھے۔ چار چار چھ چھ بلکہ آٹھ آٹھ مل کر ایک کمرا کرائے پر لے لیتے تھے، مجدی بستری بچھا لیتے تھے اور اس پر رات گزار لیتے تھے۔ مانچسٹر کی سردی وہ کیسے برداشت کرتے ہوں گے، یہ تو سمجھ میں نہیں آتا۔ غذا بھی سستی سے سستی کھاتے تھے۔ ان کی زندگی کا صرف ایک ہی مشن ہوتا تھا: زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانا اور وطن میں اپنے عزیزوں کو بھیجنا۔ آپ ان لوگوں کے متعلق جو مرضی سوچتے اور کہتے رہیں، لیکن وہ بے حد محنتی اور مخلص لوگ تھے۔ اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ کر اور اپنا آرام تج کر اپنی خون پسینے کی کمائی کا بہت بڑا حصہ پس انداز کرتے، اپنی بیوی بچوں اور دوسرے عزیز و اقارب کو، جنھیں وہ پیچھے چھوڑ آئے ہوتے تھے، منی آرڈر کے ذریعے بھیج دیتے۔ ہمارے گاؤں کے ڈاک خانے میں شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا تھا جب ان کا فرستادہ منی آرڈر موصول نہ ہوتا ہو۔ آج کل غیر ممالک میں مقیم لوگ اپنی رقوم چیکوں یا ہنڈی کے توسط سے ارسال کرتے ہیں لیکن اس زمانے کے انگریز کے نظام کی داد دیجیے کہ منی آرڈر کے ذریعے رقوم بھجوانے کا طریقہ انتہائی قابل اعتبار اور محفوظ ہوتا تھا، کبھی کسی رقم کے گم ہونے کی شکایت نہیں ملتی تھی۔ یہ رقوم پاکستان بننے کے دو چار دن بعد تک بحفاظت اور باقاعدگی سے ملتی رہیں تا آنکہ ہمیں مجبوراً اپنے گھر چھوڑنا پڑے۔

دیارِ غیر میں مقیم ان لوگوں کے عزیز و اقارب ان رقوم کا عموماً بے جا استعمال نہیں کرتے تھے۔ انھیں نمود و نمائش کا کوئی چسکا تھا نہ وہ پکے مکان بنانے کی فکر میں مبتلا ہوتے تھے۔ وہ اچھے کپڑے ضرور پہننے لگتے تھے مگر ان کی توجہ زیادہ تر نئی زرعی زمینیں خریدنے اور اپنے بچوں کو اچھی سے اچھی تعلیم دلانے پر مرکوز رہتی تھی اور یوں اس علاقے میں جو خاموش انقلاب برپا ہو رہا تھا، یہ اس میں برابر کا حصہ ڈال رہے تھے۔

لیکن لوگ محض انگلستان ہی نہیں جاتے تھے، بعض منچلے مہم جو نوجوان امریکا اور آسٹریلیا کا رخ بھی اختیار کر لیتے تھے۔ (وہ امریکا کو ملکن اور آسٹریلیا کو تیلیا کہتے تھے۔) وہ پاسپورٹ ضرور ناسں ٹکٹ والوں کی وساطت سے بنواتے تھے، لیکن ٹکٹ کہاں سے خریدتے تھے، خریدتے بھی تھے یا نہیں اور بحری جہازوں پر کیسے سوار ہوتے تھے، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ نہ مجھے اس بارے میں کسی نے کچھ بتایا تھا اور نہ میں نے کبھی کچھ پوچھا۔ واپس آنے والوں کی زبان سے ہم عجیب و غریب باتیں اور قصے بہت غور سے سنا کرتے لیکن ناتجربہ کار اور ناسمجھ ہونے کے باعث اس قسم کے سوال پوچھنے کا خیال تک کبھی دل میں نہیں آیا تھا۔ جنگ عظیم اول کے آغاز سے کچھ ہی عرصہ پہلے جن نوجوانوں نے امریکا جانے کا قصد باندھا تھا، ان میں وہ نوجوان بھی شامل تھا جس کی بیٹی سے بعد میں میری شادی ہوتی تھی۔ یہ سات آٹھ نوجوانوں کی ایک ٹولی تھی جو پتا نہیں کہاں کہاں گھومتے گھماتے کیلی فورنیا کی کسی بندرگاہ پر لنگر انداز ہو گئے۔ امریکی آسانی سے کسی غیر ملکی کو

اور وہ بھی غیر سفید فام کو اپنے ملک میں گھسنے نہیں دیتے تھے اور اگر آپ کے پاس ویزا نہ ہو، پھر تو آپ کا کوئی چانس باقی نہیں رہتا تھا۔ جب امیگریشن والوں نے دیکھا کہ یہ لوگ بالکل ہی بن بلائے مہمان ہیں، تو انھوں نے انھیں پولیس کی تحویل میں دے دیا۔ پولیس نے انھیں اپنی گاڑیوں میں بٹھایا اور میکسیکو کی سرحد پر چھوڑ آئی۔ یہ لوگ گوناگوں مصائب برداشت کر کے اس لیے تو امریکا نہیں آئے تھے کہ انھیں میکسیکو جیسے پسماندہ اور مفلس ملک میں دھکیل دیا جاتا، پھر وہاں بھی خدا جانے ان کے ساتھ کیا سلوک ہوتا۔ وہ وہاں سے نکلے اور دوبارہ کیلی فورنیا پہنچ گئے۔ وہ ایک مرتبہ پھر پولیس کی نگاہوں میں آ گئے، اس نے انھیں پکڑا اور دوبارہ میکسیکو چھوڑ آئی۔ وہ بھی اپنی دھن کے پکے تھے اور انھوں نے پولیس کے ہاتھوں ہار ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ واپس آتے، پولیس انھیں ایک بار پھر وہیں چھوڑ آتی جہاں اس نے پہلے انھیں چھوڑا تھا۔ آنکھ مچولی کا یہ کھیل کوئی سات آٹھ بار کھیلا گیا۔ پھر ان لوگوں کے بخت نے یاوری کی، کیلی فورنیا کی حکومت نے اپنی ہار مان لی۔ انھیں نہ صرف امریکا میں مستقل قیام کی اجازت مل گئی بلکہ سیکرامنٹو (Sacramento) کے قریب اور چیکو (Chico) کے درمیان میں ایک بہت بڑا غیر مزروعہ اور بے آباد قطعۂ زمین بھی الاٹ کر دیا۔ ان لوگوں نے کچھ اپنی محنت سے اور کچھ امریکیوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کاشتکاری کے جدید طریقے اور آلات استعمال کر کے اسے بہت تھوڑے عرصے میں گل و گلزار بنا دیا لیکن وہ زمین پر قبضہ ملنے کے فوراً بعد آپس میں طے کر چکے تھے کہ جو شخص ہندوستان واپس جانا چاہے گا اس کا حصہ دوسروں کے حق میں ضبط ہو جائے گا۔

یہ لوگ جب اپنے گھروں سے باہر نکلے اور امریکہ کے سفر پر روانہ ہوئے تھے، تو سبھی کے سبھی کنوارے تھے۔ امریکا میں کئی سال گزارنے کے بعد انھیں نہ صرف وطن کی یاد بلکہ یہ احساس بھی ستانے لگا تھا کہ اچھی اور بھرپور زندگی بسر کرنے کے لیے عورت کی رفاقت بھی زبردست کردار ادا کرتی ہے۔ چنانچہ وہ ایک ایک کر کے اپنی تنخواہ سمیٹتے اور واپس آنے لگے۔ آخر میں صرف ایک شخص باقی رہ گیا اور وہ آخری سانس تک تجرد کی زندگی بسر کرتے کرتے وہیں ڈٹا رہا۔

واپس آنے والوں میں میرے ہونے والے سسر میاں محمد ابراہیم بھی شامل تھے۔ ان کی آبائی زمین بھی کافی تھی تاہم وہ امریکا سے اچھی خاصی رقم لے کر لوٹے۔ اس سے انھوں نے اپنا اور اپنے بھائی کا پختہ مکان بنایا، قریب کے گاؤں میں مزید زمین خریدی، شادی کی، تین بیٹیوں اور دو بیٹوں کے باپ بنے لیکن کچھ رقم پھر بھی بچ گئی۔ دریں اثنا جب ریاست بیکانیر کی بنجر زمینوں کو سیراب کرنے کے لیے دریائے ستلج سے نہر نکالی گئی، تو انھوں نے اپنے برادرِ نسبتی سے، جو خود بھی اچھی خاصی کمائی کر کے انگلستان سے واپس آیا

تھا، مشورہ کیا اور دونوں نے ریاست بیکانیر میں ایک ایک مربع زمین خرید لی۔

میاں ابراہیم کی عمر ڈھل چکی تھی اور انھیں تپ دق کا موذی مرض بھی لاحق ہو چکا تھا۔ وہ میری شادی سے کئی سال پہلے 1946 کے اوائل میں انتقال کر گئے۔

1956 میں میرے ایک کزن رفیق احمد کے دماغ میں سودا سمایا کہ وہ انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے امریکا جا کر ہی دم لے گا۔ اس کا بڑا بھائی فقیر احمد سعید انگلستان سے ٹیکسٹائل انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر کے آیا تھا اور ایک مل میں بطور سپننگ ماسٹر کام کر رہا تھا۔ رفیق احمد بڑے بھائی کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتا تھا لیکن جانا امریکا چاہتا تھا۔ اس نے معلوم نہیں چیکو جیسی جگہ کا ٹیکنیکل کالج کیسے ڈھونڈ نکالا۔ [شاید رشتے داروں کی باتیں سن کر اس کے ذہن میں اٹک گیا ہو۔] خیر اسے وہاں داخلہ مل گیا اور وہ عازمِ امریکا ہو گیا۔ وہاں اس نے میاں ابراہیم کا ساتھی آخری بوڑھا ڈھونڈ نکالا۔ بوڑھا رفیق سے مل بہت خوش ہوا۔ بوڑھے میاں بہت ضعیف ہو چکے تھے اور 1959 میں ان کا انتقال ہو گیا۔ چونکہ زمین کا کوئی والی وارث نہیں رہا تھا، کیلی فورنیا کی حکومت نے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ 1992 میں مجھے امریکا جانے کا موقع ملا اور رفیق نے مجھے بھی وہ قطعہ زمین دکھایا۔

ضلع جالندھر کی آبادی بے تحاشا بڑھتی جا رہی تھی۔ روزگار کے ذرائع محدود ہوتے جا رہے تھے۔ نہری پانیوں سے سیراب ہونے والی زمینوں کی تقسیم بند ہو چکی تھی اور ممالک غیر میں کتنے لوگ جا سکتے تھے۔ ضلع میں انڈسٹری نام کو بھی نہیں تھی۔ ایسے میں صرف تعلیم تھی جو سہارا بن سکتی تھی۔ ضلع جالندھر اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ یہاں کوئی بڑا زمیندار تھا نہ جاگیردار، وڈیرا نہ سردار، اس لیے عامۃ الناس کی تعلیم میں روڑا اٹکانے والا کوئی نہیں تھا۔ ضلع میں جو ڈپٹی کمشنر تعینات ہوتے تھے، وہ عموماً روشن خیال ہوتے تھے اور تعلیم کے فروغ میں خصوصی دلچسپی لیتے تھے۔ میرے اپنے گاؤں کا پرائمری سکول 1871 میں بن چکا تھا۔ پھر جب حکومت خود اختیاری کے چرچے ہونے لگے، اختیارات نچلی سطح پر منتقل ہونے لگے تو ڈسٹرکٹ بورڈ وجود میں آنے لگے [اب انھیں ڈسٹرکٹ کونسلیں کہا جاتا ہے]۔ ضلع جالندھر کے ڈسٹرکٹ بورڈ کے ارکان لوگوں کے ووٹوں سے منتخب ہوتے تھے یا انھیں ڈپٹی کمشنر نامزد کرتا تھا، مجھے کچھ معلوم نہیں البتہ اتنا وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ان میں بیشتر، خواہ وہ ہندو تھے، مسلمان یا سکھ، خاصے ترقی پسند (progressive)، لبرل (liberal) روشن خیال/ جو تنگ نظر نہ ہوں) اور forward-looking (جدید خیالات و نظریات اپنانے/سوچنے والے اور مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے والے) پُر خلوص لوگ تھے۔ سبھی ایک ہی جذبے سے سرشار تھے کہ ان کا ضلع کس طرح جہالت کی دلدل سے نکل سکتا ہے اور ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو سکتا

ہے۔ گاؤں گاؤں پرائمری سکول کھولے گئے، بڑے دیہاتوں میں، جن میں ہمارا گاؤں بھی شامل تھا، مڈل سکول قائم کیے گئے اور بڑے قصبوں میں ہائی سکول۔ حکومت پنجاب نے بھی چند مقامات پر ہائی سکول تعمیر کر دیے۔ پھر لڑکیوں کے سکولوں کے قیام کی باری آئی۔ ہمارے گاؤں کا زنانہ پرائمری سکول 1930 کے لگ بھگ قائم ہو چکا تھا۔ پاکستان بننے تک بے شمار دیہات میں اس قسم کے سکولوں کا اجرا ہو چکا تھا۔ ضلع میں پرائمری تعلیم لازمی قرار دی جا چکی تھی لیکن کسی کو والدین کو سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ اپنے بچے سکول بھیجیں، لوگوں میں تعلیم حاصل کرنے کی تڑپ خود ہی پیدا ہو گئی تھی۔ اگرچہ ہمارا چھٹی جماعت کا استاد ایک چمار تھا لیکن اب سوچ کر مجھے بے حد افسوس ہوتا ہے کہ چوہڑوں، چماروں جیسے پسے ہوئے طبقات کی تعلیم پر بحیثیت مجموعی کوئی توجہ نہیں دیتا تھا۔ پہلی سے دسویں جماعت تک کوئی چوہڑا یا چمار میرا کلاس فیلو نہیں رہا۔

تعلیم کے فروغ کے لیے مختلف رفاہی تنظیمیں بھی سرگرم ہو چکی تھیں۔ حسب معمول ہندو اس معاملے میں بھی پیش پیش تھے۔ ہندوؤں کے دو بڑے فعال طبقے تھے: آریہ سماج اور سناتن دھرم۔ ان کے سکول اور کالج بالترتیب ڈی اے وی (دیانند آیورویدک) اور ایس ڈی (سناتن دھرم) کہلاتے تھے۔ لاہور میں جہاں آج کل اسلامیہ کالج سول لائنز واقع ہے وہ اصلاً ڈی اے وی کالج کی عمارت ہے اور ایم اے او کالج سناتن دھرم کالج کی عمارت پر قابض ہے۔ جالندھر میں پہلا کالج بھی ڈی اے وی کالج کے نام سے قائم ہوا۔ یہ بہت بڑا کالج تھا۔ ڈی اے وی کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور کا مقابلہ کرتا تھا۔ پھر ہندوؤں نے ایک اور کالج قائم کیا لیکن اس کا نام غیر فرقہ وارانہ دوآبہ کالج رکھا۔ بعد میں مسلمانوں نے اسلامیہ کالج اور سکھوں نے خالصہ کالج کھول لیا۔ ان کالجوں کی موجودگی میں حکومت پنجاب کو جالندھر میں گورنمنٹ کالج کھولنے کا کبھی خیال تک نہ آیا حالانکہ پڑوس میں ہوشیار پور اور لدھیانہ میں گورنمنٹ کالج قائم ہو چکے تھے۔ جالندھر کا اکلوتا زنانہ کالج چند کنیا مہاودیالہ بھی ہندوؤں نے بنایا تھا۔

ہندوؤں نے بعض قصبوں میں ہائی سکول بھی بنائے تھے۔ مسلمانوں نے کہیں اور بنایا تھا یا نہیں، مجھے کچھ یاد نہیں پڑتا۔ تاہم ہمارے گاؤں سے تین کوس[1] دور نکل انجیاں میں اسلامیہ ہائی سکول قائم ہو چکا تھا اور اس سکول نے بیت اور گرد و نواح کے دیہاتوں کے باسیوں کی قسمت ہی بدل ڈالی۔

---

1. انگریزوں کی آمد سے پہلے برصغیر کے اکثر علاقوں میں لوگ فاصلے کوسوں میں ماپتے تھے۔ وارث سرہندی نے اپنی لغت میں اسے فرہنگ ادا ری فرخ) کا متبادل بتایا ہے اور اس کا فاصلہ تین ہزار گز یعنی سوا دو میل سے بھی زیادہ۔ فیلن کے مطابق کوس ڈیڑھ سے دو میل اور پلیٹس کے حساب سے یہ تقریباً ڈیڑھ سے دو میل کے برابر ہوتا تھا۔ پنجابی میں کوس کو کوہ کہتے تھے اور ہم بھی کوہ ہی کہتے ہیں۔ دیہاتوں میں کوسوں میں فاصلہ ماپنے کا رواج تقسیم ہند تک جاری رہا۔

ہنگل انبیا کا سکول ہمارے ایک بزرگ مولوی پیر محمد نے قائم کیا تھا۔ [وہ رشتے میں میری والدہ کے سگے ماموں تھے۔ میری اماں ابھی چھوٹی ہی تھیں کہ 1903 میں طاعون کی وبا پھیلی اور اس میں ان کے ماں اور باپ دونوں ہی صرف ایک دن کے وقفے سے فوت ہو گئے تھے۔ میری دونوں پھوپھیاں بھی اسی وبا میں چل بسی تھیں۔ میری اماں اور ان کے دونوں بھائیوں کی پرورش مولوی صاحب نے کی تھی، انھوں نے انھیں حالات کے مطابق جو تعلیم میسر تھی، دلائی اور سب کی شادیاں بھی کیں۔] مولوی صاحب غالباً انگریزی تو زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن وہ ضلع فیروز پور کی تحصیل فاضلکا میں وکالت کرتے تھے۔ (اس زمانے میں لوگ ایل ایل بی کا امتحان پاس کیے بغیر اردو میں ایک خاص امتحان پاس کرنے کے بعد تحصیل کی سطح پر وکالت کرنے کا استحقاق/لائسنس حاصل کر لیتے تھے۔) مولوی صاحب بہت دانش مند اور نیک نیت انسان تھے۔ ان کی وکالت چل نکلی۔ انھوں نے نام بھی کمایا اور پیسا بھی۔ انھوں نے مستقل رہائش کے لیے اپنے آبائی گاؤں ہنگل انبیا میں ایک دو منزلہ مکان ضرور تعمیر کرایا تھا (لوگ اسے مولوی صاحب کی کوٹھی کہا کرتے تھے)، لیکن ان کی کمائی کا ایک معتد بہ حصہ قومی اور رفاہی کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ پھر اللہ جانے ان کے دل میں کیا خیال آیا، انھوں نے چھوٹے موٹے کاموں میں دلچسپی لینے کی بجائے تعلیم کے فروغ کے لیے تہیہ باندھ لیا۔ وہ زور شور سے روپیہ پس انداز کرنے لگے۔ جب ان کے خیال میں کافی رقم اکٹھا ہو گئی، انھوں نے تقریباً ایک وقت فاضلکا اور ہنگل انبیا میں دو ہائی سکول کھڑے کر دیے اور اپنی باقی جمع جتھا بھی اس نیک کام میں جھونک دی۔ ہنگل انبیا سکول کے لیے انھوں نے گاؤں سے ذرا ہٹ کر اپنی آبائی زمین کا انتخاب کیا۔ ابتدا میں اس کی عمارت کچی تھی، بعد میں آہستہ آہستہ کچے کمرے پکے کمروں میں تبدیل ہوتے گئے۔ دور دراز کے دیہاتوں کے طلبا کے لیے ایک ہوسٹل بھی تعمیر کر دیا گیا اور ساتھ ہی کھیل کے ایک دو میدان بھی۔

ہٹ کے لوگوں میں تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ تو بہت زبردست تھا، لیکن ان میں سے بیشتر کے پاس اپنے بچوں کو موگا یا جالندھر بھیجنے کے وسائل نہیں تھے۔ جب بچے مڈل پاس کر لیتے تھے [ہمارے گاؤں کا سکول بیسویں صدی کے آغاز میں ورنیکلر مڈل سکول کا درجہ حاصل کر چکا تھا۔ جن مڈل سکولوں میں انگریزی پڑھائی جاتی تھی، وہ اینگلو ورنیکلر مڈل سکول کہلاتے تھے] تو ان کے والدین انھیں یا تو محکمہ مال میں پٹواری بھرتی کرا دیتے تھے یا پھر پرائمری سکولوں کے اساتذہ بننے کے لیے جے وی کا کورس کرنے کے لیے جھنگ یا کسی دوسرے شہر بھیج دیا کرتے تھے۔ [جے وی جونیئر ورنیکلر کا مخفف ہے۔ یہ ایک قسم کا ڈپلوما تھا جو پرائمری سکولوں میں پڑھانے کے لیے طلبا کو حاصل کرنا پڑتا تھا۔ [اس زمانے میں اس قسم

کی ملازمتیں کرنے کے لیے مڈل تک کی ہی تعلیم کافی سمجھی جاتی تھی۔ تعلیم کا معیار بھی آج کل کے زمانے سے کہیں اونچا تھا۔ میرے دادا کے بھائی پتا نہیں کتنی جماعتیں پڑھے تھے، وہ ہمیشہ ہمیں یہی بتایا کرتے تھے کہ "میں نے صرف ایک جماعت دیکھی تھی۔" "وہ پڑھی نہیں، دیکھی کہا کرتے تھے۔ لیکن اس معمولی تعلیم کے باوجود وہ شیخ سعدی کی "کریما بہ بخشا بر حال ما، کہ ہستم اسیر کمند ہوا" کا بیشتر حصہ زبانی سنا دیا کرتے تھے اور ہم ان کا منہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ محکمہ مال اور سکولوں کے علاوہ بعض لوگوں کو دوسرے محکموں میں بھی نوکری مل جاتی تھی۔ میں نے اپنی پچھلی پیڑھی کے کسی ایسے مڈل پاس (اور وہ بھی ورنیکلر مڈل پاس) کو نہیں دیکھا جو آٹھویں پاس کرنے کے بعد بھی بیکار رہا اور جوتیاں چٹخاتا پھرتا رہا ہو۔

تنگل انبیا کا سکول کیا کھلا، بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ کیا مسلمان، کیا ہندو، کیا سکھ [اگرچہ غیر مسلم تعداد میں بہت کم ہوتے تھے لیکن اس کی وجہ شوق کا فقدان یا کسی قسم کا تعصب نہیں تھا، علاقے کی آبادی میں ان کا حصہ ہی نہ ہونے کے برابر تھا] دیوانہ وار اس پر ٹوٹ پڑے اور یوں سکول کھلتے ہی کامیاب ہو گیا۔ چند ہی سالوں میں ایک ایک جماعت کے دو دو تین تین سیکشن بن گئے۔ اکیلے مولوی صاحب کی کمائی سکول کے اخراجات کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ [انھیں بجا طور پر بیٹ کا سرسید کہا جاتا تھا۔] پھر ان کے اعضا بھی مضمحل ہونا شروع ہو گئے تھے اور اوپر سے ستم یہ ہوا کہ ان کا چھوٹا بیٹا عبدالصمد جو بے حد قابل اور سمجھدار تھا، مولوی صاحب کی اس سے بے شمار توقعات وابستہ تھیں اور یوں انھیں بے حد عزیز بھی تھا، اچانک قضائے الٰہی سے فوت ہو گیا۔ مولوی صاحب اس صدمے کی تاب نہ لا سکے، اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے اور اسی کیفیت میں ایک شام گھر سے غائب ہو گئے۔ ان کے گاؤں اور آس پاس کے دیہاتوں میں ڈھنڈیا پڑ گئی۔ ہاتھوں میں لالٹینیں پکڑے لوگ انھیں ساری رات تلاش کرتے رہے۔ جب سورج طلوع ہوا، ایک شخص نے احتیاطاً کسی کنویں میں جھانک کر دیکھا، وہ نیچے پانی میں ماہل پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ماہل کی ٹنڈوں پر پاؤں رکھتے نیچے اترے ہوں گے۔ [اوائل عمر میں جب ہماری کوئی چیز کسی کنویں میں گر پڑتی تھی، اسے نکالنے کے لیے ہم بھی اسی طرح نیچے اترا کرتے تھے۔] لیکن ان کی جو ذہنی کیفیت تھی، اس میں انھوں نے یہ کام کیسے کیا، یہ عقدہ کسی سے حل نہ ہو سکا۔

ساری رات کنویں کے پانی میں بیٹھے رہنے کی وجہ سے مولوی صاحب کو سردی لگ گئی اور غالباً سرسام بھی ہو گیا۔ بے شمار مخلوق اکٹھا ہو گئی، انھیں باہر نکالنے کے لیے لوگوں کو کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑے ہوں گے، مجھے ان کی تفصیل معلوم نہیں کیونکہ یہ واقعہ میرے ہوش سنبھالنے سے بہت پہلے کا تھا۔ مولوی صاحب کو جو صدمہ برداشت کرنا پڑا تھا، وہ اس سے کبھی چھٹکارا حاصل نہ کر سکے۔ صحت بحال ہونے کے بعد بھی

انھیں کسی کام میں دلچسپی نہیں رہی تھی اور نہ ان کی ذہنی کیفیت کبھی نارمل ہو سکی۔ مجھے جب بھی تنگل انیا جانے کا اتفاق ہوتا اور میں سلام کے لیے مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا، وہ صرف ہوں ہاں کر دیتے اور کبھی کوئی فقرہ مکمل نہ کر پاتے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ اوکاڑے کے قریب ایک گاؤں 38/2R میں مقیم ہو گئے۔ 1950 کے قریب وہ شدید بیمار ہو گئے۔ ان کے بڑے بیٹے میاں عبدالرب انھیں لاہور لے آئے۔ ہر قسم کے علاج معالجے کے باوجود ان کی طبیعت سنبھل نہ سکی۔ وہ ایک روز خاموشی سے اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے اور یوں کھوور بیت کا سب سے بڑا محسن اور درخشندہ ترین ستارہ ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے اور انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

جیسا کہ اوپر تحریر کیا جا چکا ہے، اکیلے مولوی صاحب کی کمائی سکول کے اخراجات کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی، پھر وہ اپنی دماغی کیفیت کے باعث غیر فعال بھی ہو چکے تھے۔ طلبا سے فیس ضرور وصول کی جاتی تھی لیکن صرف ان سے جن کے والدین اسے ادا کر سکتے تھے اور یہ ہوتی بھی کچھ زیادہ نہیں تھی، صرف وہی جو سرکاری سکولوں میں لی جاتی تھی یعنی نویں اور دسویں جماعت کے طلبا سے یہی کوئی سوا تین روپے ماہانہ۔ باقی جماعتوں کی اس سے بھی کم ہوتی تھی۔ کچھ امداد حکومت پنجاب سے موصول ہو جاتی تھی۔ باقی اخراجات پورا کرنے کے لیے سالانہ جلسہ منعقد کیا جاتا تھا۔ اس میں علاقے کے معززین شریک ہوتے تھے، طلبا تقریریں کرتے تھے، انھیں تعلیمی کارکردگی کی بنا پر انعامات دیے جاتے تھے، حاضرین سے چندے کی اپیل کی جاتی تھی اور ہر شخص حسب توفیق حصہ ڈالتا تھا، دو روپیہ، دو روپے، کبھی پانچ، دس یا بیس۔ سکول کی مالی حالت کبھی اتنا تجیم نہیں ہوئی کہ اساتذہ کو تنخواہیں نہ دی جا سکیں۔ تنخواہیں وقت پر ملتی تھیں اور وہ بھی سرکاری سکولوں کے اساتذہ کی تنخواہوں کے برابر۔

جب میری عمر لگ بھگ تین چار سال ہوئی، ہمارے پردادا ابھی بقید حیات تھے۔ وہ اپنی طرز کے واحد آدمی تھے۔ ان کے والد گاؤں کے نمبردار تھے۔ والد کے انتقال کے بعد واحد اولاد نرینہ ہونے کے طفیل انھیں قانوناً اور اخلاقاً نمبردار بننا چاہیے تھا اور وہ بن بھی گئے۔ دیہاتوں میں نمبرداروں کو معزز اسامی سمجھا جاتا ہے۔ زرعی زمینوں کا مالیہ مالی پٹواری متعین کرتا ہے۔ جو علاقے نہری پانی سے سیراب ہوتے ہیں، وہاں ایک اور پٹواری بھی ہوتا ہے، اسے نہری پٹواری کہا جاتا ہے۔ یہ آبیانہ تشخیص کرتا ہے۔ کسانوں کی قسمت انھیں پٹواریوں کی مٹھی میں ہوتی ہے، چاہے مالیہ/آبیانہ کی رقم بڑھا دیں چاہے گھٹا دیں اور چاہے بالکل ہی معاف کر دیں کہ فصل خراب ہوئی ہے۔ نمبردار دونوں ٹیکس کسانوں سے وصول کرتا ہے (ویسے یہ ٹیکس عموماً کسان ہی ادا کرتے ہیں، بڑے زمیندار اور جاگیردار اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے

اپنے آپ کو صاف بچا لیتے ہیں) اور سرکاری خزانے میں جمع کراتا ہے۔ اس کام کے عوض اسے وصول شدہ رقم کا پانچ فیصد ملتا ہے۔ اسے پنچوترہ کہا جاتا ہے۔ یوں نمبردار کا عہدہ محض آن بان شان ہی کا حامل نہیں ہوتا، ایک منفعت بخش اسامی بھی ہے۔ کون دیہاتی ہے جو نمبردار بننا نہیں چاہتا، سوائے اس میراثی کے بیٹے کے جس کی سارا گاؤں مرنے کے بعد بھی باری نہیں آئے گی۔ جنرل پرویز مشرف نے چولستان کے جس گاؤں میں اراضی حاصل کی تھی، اس کا نمبردار بھی وہ خود ہی بن گئے تھے۔

ہمارے پردادا نمبردار بن تو گئے مگر بیچ میں آن پڑا کہ ان کے بہنوئی، جو ان کے قریبی عزیز بھی تھے، میدان میں کود پڑے اور نمبرداری پر اپنا حق جتانے لگے۔ کس حساب سے؟ ہمیں بھی سمجھ میں نہ آیا۔ جھگڑا بڑھ گیا اور نوبت عدالت تک پہنچ گئی۔ ہمارے پردادا اور ان کی ہمشیرہ آپس میں بہت پیار کرتے تھے۔ دونوں اپنا اپنا کھانا باندھتے تھے، اکٹھے سات کوس دور پیدل گوجرانوالہ جاتے تھے۔ وہاں کھانا اکٹھے کھاتے تھے لیکن عدالت میں گواہی ایک دوسرے کے خلاف دیتے تھے۔ [بیوی آخر اپنے شوہر کی حمایت نہ کرتی تو کیا کرتی؟] عدالت نے فریقین کا موقف سنا اور آخر میں فیصلہ ہمارے پردادا کے حق میں کر دیا۔ لیکن ہمارے پردادا کا ظرف دیکھیں، انھوں نے عدالت کا فیصلہ سننے کے بعد وہیں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ انھوں نے اپنے بہنوئی کے حق میں نمبرداری سے دست برداری کا اعلان کر دیا۔ اس میں شاید بہن سے محبت کا عنصر بھی شامل ہو۔ ہمارے پردادا کا نام تو اکبر تھا لیکن پنجاب کی عام ریت کے مطابق، کہ ہر نام بگاڑ دیا جاتا تھا، لوگ انھیں اکو کہتے تھے۔ جب نمبرداری سے ان کی دست برداری کی خبر ہمارے گاؤں اور ارد گرد کے دیہات میں پہنچی تو لوگ تحسین و آفرین کرنے لگے اور انھوں نے بے ساختہ انھیں ''اکو بادشاہ'' کا خطاب دے دیا۔ یہی خطاب ہمارے خاندان کی ال (nickname?) بن گیا۔ جب ہمارا واسطہ علاقے کے ناشناسا لوگوں سے پڑتا اور انھیں ہماری ال کا پتا چلتا، ان کی نگاہوں میں ہماری عزت بڑھ جاتی اور ہماری مفت کی ٹوہر ہو جاتی۔

جس کنویں (پنجابی کھوہ) سے ان کی زمینیں سیراب ہوتی تھیں، اس میں ان کی چوتھی یا پانچویں پیڑھی کے رشتے داروں سے سانجھ تھی۔ ہمارے یہ رشتہ دار جوڑے کہلاتے تھے۔ وہ غالباً جڑواں بھائیوں کی اولاد تھے۔ (اس قبیل کے بعض افراد کا ذکر آگے بھی آئے گا۔) آخر عمر میں پردادا کو احساس ہوا کہ یہ سانجھا کنواں ان کی زمینوں کو پانی دینے کے لیے کافی نہیں۔ (نوشیرواں بادشاہ نے بوڑھے باغبان سے پوچھا ''تم یہ درخت کیوں لگا رہے ہو؟'' ''حضور، اس کا پھل کھانے کے لیے۔'' ''لیکن تم تو بہت عمر رسیدہ ہو چکے ہو، کیا تمھیں توقع ہے کہ تم اپنی زندگی میں اس کا پھل کھا سکو گے؟'' ''بالکل حضور، اگر زندگی نہ رہی تو بھی کوئی

مضائقہ نہیں، بیٹے بیٹیاں پوتے پوتیاں کھا لیا کریں گے۔'') اپنا نیا کنواں کھدواتے وقت ہمارے پردادا کے دل میں بھی کچھ اس قسم کا خیال آیا ہوگا۔ کھوہ کی تعمیر مکمل ہونے کے چند ہی دن بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

اماں اکثر مجھے بتایا کرتی تھیں جب کنواں بن رہا تھا، میری عمر بھی کوئی تین چار سال تھی۔ میں ان کی انگلی پکڑ کر جہاں کنواں تعمیر ہو رہا تھا وہاں چلا جاتا تھا اور کبھی کبھار ایک آدھ اینٹ پیٹ سے لگا کر راج کے حوالے کر دیتا تھا۔ پردادا کا سراپا کیسا تھا، ان کا قد کاٹھ کیا تھا، وہ باتیں کس انداز سے کرتے تھے، کوشش کے باوجود میں کبھی اپنے ذہن میں نقشہ نہ بنا سکا۔

پردادا کا نیا کنواں کس طرح بن رہا تھا، اس وقت یہ بات میری سمجھ سے بالا تھی۔ چند سال بعد میرے دادا، ان کے بھائی اور شریکوں[1] نے سوچا کہ پرانے کنویں کی حالت خستہ ہو چکی ہے، اس کی جگہ نیا کنواں بنانا ضروری ہے۔ چنانچہ نیا کنواں تعمیر کرنے کے لیے کھدائی شروع ہوئی۔ کھدائی سے نکلنے والی مٹی پرانے کنویں میں ڈالی جاتی تاکہ اسے پُر کیا جا سکے۔ جب مٹی کی تہہ ختم ہو گئی تو ریت کی پرت شروع ہو گئی اور پانی کے آثار ظاہر ہونے لگے تو کھدائی بند کر دی گئی اور گڑھے میں چک[2] اتار دیا گیا اور اس پر پکی اینٹوں کی مدور دیوار کی تعمیر شروع ہو گئی۔ جب یہ دیوار سطح زمین کے برابر پہنچی، چوبھا (ڈبکی مارنے/غوطہ لگانے والا) بلایا گیا۔ چوبھے پیشہ ور لوگ ہوتے تھے۔ ان کا کام نہ صرف گڑھے سے بلکہ چک کے نیچے سے بھی مٹی اور ریت نکالنا اور اسے ڈول میں انڈیلنا ہوتا تھا تاکہ چک اور اس پر بنی ہوئی دیوار نیچے کھسک سکے۔ جب دیوار قدرے نیچے ہوتی، راج اس پر اینٹوں کا ایک ردا لگا دیتا تھا۔ جوں جوں پانی کی سطح بلند ہوتی جاتی، چوبھے کا کام مشکل تر ہوتا جاتا۔ آج کل کے غوطہ خوروں کو جدید آلات میسر ہیں، جن کی مدد سے وہ آکسیجن کھینچ کر خاصی گہرائی تک جا سکتے اور کافی دیر پانی کے نیچے ٹھہر سکتے ہیں۔ چوبھے اگرچہ پیشہ ور لوگ ہوتے تھے اور اپنے کام کے بہت ماہر۔ کنویں کے گڑھے میں سے اور چک کے نیچے سے ریت اور مٹی اٹھانے کے لیے انھیں جھکنا اور کچھ وقت پانی میں گزارنا پڑتا ہوگا، ایسے میں وہ سانس کیسے لیتے ہوں گے، یہ خاصا دقیق مسئلہ ہے، شاید کوئی ماہر سانسیات (breathing) اس پر روشنی ڈال سکے۔

---

1۔ جس جائیداد میں قریبی رشتے دار حصے دار ہوں، وہ ایک دوسرے کے شریک کہلاتے ہیں۔ ساجھے داری کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ یہ لفظ پنجابی میں عموماً نفرت کا اظہار کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یوں اس کے معنی حریف یا رقیب بن جاتے ہیں۔ پنجاب میں یہ ترکیب اکثر استعمال ہوتی ہے۔ ''توں میرا کتھوں دا شریک بن گیا۔''

2۔ کنویں کا چک کمہار یا معمار کے چک جیسا ہوتا ہے تاہم اس کا اندرونی حصہ کھوکھلا ہوتا ہے۔ اس کا گھیر لکڑی کا بنا ہوتا ہے جس کی چوڑائی صرف اتنی ہوتی ہے کہ اس پر اینٹوں کا ردا لگایا جا سکے اور یوں کنویں کی دیوار تعمیر کی جائے۔ اس چک کے بغیر دیوار کو نیچے کھسکانا ناممکن ہے۔ چوبھے کی کسی خامی امانت کی تہہ کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔

پہلے عمارتیں اور کنوؤں کی دیواریں چھوٹی اینٹوں سے تعمیر کی جاتی تھیں اور انھیں پونے سے جوڑا جاتا تھا۔ یہ اینٹیں کمہار کے آوے میں پکائی جاتی تھیں۔ پھر پتھر کا کوئلہ دستیاب ہونے لگا اور بڑے بھٹوں میں بڑی اینٹیں بنانا ممکن ہو گیا۔ انگریز راج کی برکت سے سیمنٹ کے کارخانے وجود میں آنے لگے۔ اب سب کچھ انھیں دو چیزوں سے بننے لگا۔ ہمارے پردادا نے اپنا کنواں انھیں سے بنوایا تھا اور ہمارے نئے کنویں کی تعمیر میں بھی یہی چیزیں استعمال ہوئیں۔

جب چوبھا چک کے نیچے ایک کھدائی مکمل کر لیتا، اوپر راج دیوار پر نیا ردا جما دیتا۔ جب دیوار پانی کی مطلوبہ گہرائی تک پہنچ گئی، راج نے اس کے اوپر سیمنٹ کا پلستر کر دیا۔ یعنی کنویں کی تعمیر کا پہلا مرحلہ مکمل ہو گیا لیکن اسے چالو بھی تو کرنا اور اس میں سے پانی نکالنے کا بندوبست بھی کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے کنویں کے اوپر ایک بہت بڑی آہنی چرخی لگائی گئی۔ پھر اس میں مال اتاری گئی جس نے اس چرخی پر چلنا تھا۔ مال ٹنڈوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ اسی طرح کی ہوتی ہے کہ جس طرح کی رسی کی سیڑھی۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ سیڑھی (پنجابی: پوڑھی) میں ڈنڈے (پنجابی: پوڈے) ہوتے ہیں جب کہ مال میں ٹنڈیں۔ پہلے یہ ٹنڈیں مٹی کی ہوتی تھیں۔ انھیں بھی کمہار کے آوے میں پکایا جاتا تھا۔ ان ٹنڈوں کو مُن کے موٹے رسے میں پرو دیا جاتا تھا۔ تاہم یہ مال قابلِ اعتبار نہیں ہوتی تھی۔ ٹنڈیں ٹوٹتی رہتی تھیں۔ مسلسل پانی میں رہنے کی وجہ سے رسا کمزور ہونے لگتا تھا اور بعض اوقات ٹوٹ بھی جاتا تھا، پوری مال یا اس کا کچھ حصہ کنویں میں گر پڑتا تھا۔ اس کی مرمت کرانا یا پوری کی پوری نئی مال بنوانا پڑتی تھی۔ پھر لوہے کی بنی بنائی مالیں دستیاب ہونے لگیں [بعد میں مقامی لوہار بھی انھیں بنانے لگے تھے]۔ ہمارے پردادا نے بھی اپنے کنویں میں یہی مال لگوائی تھی اور یہ گاؤں میں غالباً اپنی قسم کی پہلی مال تھی۔ ہمارے نئے کنویں میں بھی یہی مال استعمال ہوئی لیکن ہمارے پڑوسیوں کا کنواں اسی پرانی مال سے چلتا رہا اور قیامِ پاکستان تک انھوں نے اسے تبدیل کرانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

اب مال کو دوسرے کے ذریعے بہت بڑے چرخ سے منسلک کیا گیا۔ پہلے یہ چرخ بھی لکڑی کا ہوتا تھا اور اس کی جسامت بھی بہت بڑی ہوتی تھی۔ پھر یہ بھی لوہے کا بننے لگا اور اس کی جسامت بھی چھوٹی ہو گئی۔ اس چرخ کے ارد گرد گولائی میں بیلوں کے چلنے کی گزرگاہ بنائی گئی۔ اس گزرگاہ کو ہمارے ہاں پیڑ (پے ڑ) کہا جاتا تھا۔ بیلوں کو ہانکنے کے لیے ایک آدمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ آدمی گھنٹوں بیلوں کے پیچھے بھاگ نہیں سکتا، چنانچہ اس کے بیٹھنے کا بندوبست کرنا پڑتا ہے۔ اس مقصد کے لیے تقریباً بالے جتنا موٹا لٹھ چرخ کے ساتھ جوڑا جاتا تھا۔ اس لٹھ کے سرے پر بیٹھنے کی چوبی نشست بنائی جاتی تھی۔ اس نشست کو

گادی کہا جاتا تھا۔ اس نشست پر آدمی پاؤں لٹکا کر بھی بیٹھ سکتا تھا اور اس کے اوپر رکھ کر بھی۔ بعض اوقات کسی ضرورت کے تحت اسے کہیں جانا پڑتا تھا، تب وہ بیلوں کی آنکھوں پر چمڑے کی کھوپے باندھ دیتا تھا تاکہ وہ اس کی عدم موجودگی میں بھی چلتے رہیں۔ کولھو کا مالک تو اپنا کام چلاتا ہی اسی طرح تھا۔ تاہم بعض بیل بڑے سیانے ہوتے تھے۔ وہ مالک کی عدم موجودگی بھانپ جاتے تھے اور کھڑے ہو کر ستانے لگتے تھے۔

ماہل لگ گئی اور دھرے کے ذریعے چرخ سے بھی منسلک ہو گئی۔ اب بیل کنویں کا پانی کھینچ کر باہر لا سکتے تھے لیکن اس پانی کو کھیت (پنجابی: کھتا) تک بھی تو پہنچانا ہوتا تھا۔ چنانچہ لوہاروں نے لوہے کی نسار تیار کی۔ [یہ نسار تختے کی شکل کی ہوتی تھی۔ اس کی لمبائی محض اتنی ہوتی تھی کہ چرخی کے اوپر ماہل کے دونوں سروں کے درمیان سما کے مگر ان سے ٹکرا نہ سکے]۔ اس کے کنارے کوئی چھ انچ اونچے ہوتے تھے تاکہ پانی اچھل کر دوبارہ کنویں میں نہ گرنے پائے۔ نسار کی ایک جانب ایک خاصی چوڑی آہنی نالی لگائی جاتی تھی۔ نسار کا پانی اسی نالی میں سے گزرتا نیچے زمین پر گرتا تھا۔ زمین کے جس ٹکڑے پر پانی گرتا تھا، اسے خیلا (خ ل ا) کہا جاتا تھا۔ چوکور شکل کے اس خیلے کے گرد منڈھ بنائی جاتی تھی۔ جہاں پانی گرتا تھا وہاں روڑے، مٹی کے برتنوں کے ٹھیکرے وغیرہ رکھ دیے جاتے تھے تاکہ پانی زمین میں شگاف بنانے اور وہیں جذب ہونا نہ شروع ہو جائے۔ سیمنٹ دستیاب ہونے کے بعد خیلے پختہ بنائے جانے لگے تھے۔

کھیتوں تک پانی پہنچانے کے لیے نالیاں بنائی جاتی تھیں۔ [اس قسم کی نالی کو آڈ کہا جاتا تھا۔] کھیت کا رقبہ پانچ دس مرلے یا زیادہ سے زیادہ ایک کنال ہوتا تھا۔ [نہری پانی سے سیراب ہونے والے کھیت عموماً چار، چھ یا آٹھ کنال (ایک ایکڑ جسے کلا کہا جاتا ہے) کے ہوتے ہیں۔ چونکہ نہر کا کھال آڈ کے مقابلے میں بہت زیادہ چوڑا اور اس میں پانی کی مقدار بھی آڈ کے پانی کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہوتی ہے اور یہ آتا بھی بہت رفتار سے ہے، اس لیے ایک کلے کا کھیت بھی 40،35 منٹ میں سیراب ہو جاتا ہے۔ آڈ کا پانی جوں کی رفتار سے چلتا تھا اور ایک کنال کے کھیت کو سیراب کرنے کے لیے ایک گھنٹے سے بھی زیادہ وقت درکار ہوتا تھا اور وہ بھی اس صورت میں کہ اسے تازہ تازہ واہا (واہنا: ہل چلانا) نہ گیا ہو۔

کنواں تعمیر ہونے کے بعد اردو میں رہٹ بن جاتا ہے مگر پنجابی میں وہ کھوہ کا کھوہ ہی رہتا ہے۔ کنویں اب ناپید ہو گئے ہیں، ان کی جگہ ٹیوب ویلوں نے لے لی ہے۔ میں 1950 کی دہائی میں ملتان کے ایمرسن کالج میں پڑھتا تھا۔ یہ کالج ضلع کچہری کے پاس تھا۔ [اب اس کی جگہ لڑکیوں کا کالج قائم ہو گیا ہے۔ ایمرسن کالج کو بھی کا "دیس نکالا" مل چکا ہے اور اس کا نام بھی گورنمنٹ کالج ہو گیا ہے۔] شہر اپنی پرانی حدود سے زیادہ باہر نہیں نکلا تھا۔ میں تو اس شہر میں رہتا تھا۔ میرے راستے میں پل موج دریا پڑتا تھا۔

اس پل اور نواں شہر کے مابین شمالی جانب ابھی زرعی کھیت موجود تھے اور ان کو سیراب کرنے کے لیے ایک کنواں اکثر ریں ریں کرتا رہتا تھا۔ پھر ان چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ شہروں کے قرب وجوار کی زرعی زمینوں کو نئی آبادیاں ہڑپ کرنے لگیں۔ دیہی علاقوں میں نہریں آ گئیں یا ٹیوب ویل لگ گئے۔ کنویں بیکار ہو گئے اور اپنا وجود کھو بیٹھے۔

نکودر بیٹ میں کنویں اہم کردار ادا کرتے تھے، یہ ایک طرح سے چوپال کا کام دیتے تھے۔ جہاں کنواں گاڑا جاتا تھا، وہاں ایک دو کمرے ضرور تعمیر کیے جاتے تھے۔ اس کمرے کو کوٹھا کہا جاتا تھا۔ ان کوٹھوں میں آلاتِ کشاورزی، مویشیوں کا چارہ، کھل بنولہ وغیرہ رکھے جاتے تھے اور بارش ہونے پر ان میں پناہ لی جاتی تھی۔ کوٹھے کے ساتھ خاصا بڑا احاطہ بنایا جاتا تھا۔ اس احاطے میں سایہ دار اور عموماً پھل دار درخت لگائے جاتے تھے۔ جامن، توت، شیشم وغیرہ کسانوں کے مرغوب درخت ہوتے تھے۔ بعض اوقات ان میں مویشی بھی باندھ لیے جاتے تھے اور یہیں قصائی کے منڈھ جیسا منڈھ زمین میں گاڑھ کر گڑاسے (گنڈاسے) سے کھیتوں سے کاٹے گئے چارے کو باریک باریک کترا جاتا تھا (پنجابی: کترنا)۔ بعد میں اس کام کے لیے مشینیں آ گئی تھیں۔ انھیں ٹوکہ کہا جاتا تھا اور اب بھی ٹوکا ہی کہا جاتا ہے۔ کسان اپنی گرمیوں کی دوپہریں وہیں گزارتے تھے۔ وہیں سو بھی جاتے تھے، کوئی چارپائی پر اور کوئی رزی[1] زمین پر۔ اکثر اوقات ادھر ادھر کے کسان اور راہ گیر اس قسم کے ڈیروں میں اکٹھے ہو جاتے تھے، سستاتے تھے، باری باری ایک ہی حقہ پیتے تھے، گپیں ہانکتے تھے، آپس میں چہلیں کرتے تھے اور اپنے دل پشوری کرتے تھے۔ گاؤں کے قریب کنوؤں پر تپتی دوپہریں گزارنے غیر زرعی پیشوں سے متعلق لوگ اور ان کے بچے بھی آ جایا کرتے تھے۔ عورتیں عموماً گلیوں میں اکٹھی بیٹھ کر چرخے کاتتی تھیں، لیکن بعض اوقات وہ بھی اپنے چرخوں سمیت وہاں پہنچ جاتی تھیں۔ وہ چرخے کاتتی، آپس میں چہلیں کرتی، پڑوسیوں کی غیبت کرتی اور ایک دوسری کے متعلق سکینڈل چھوڑتی جاتی تھیں۔ بعض ترنم میں کوئی فی البدیہہ گانا گانے لگتی تھیں اور پھر باقی بھی ان کے ساتھ مل کر تان اٹھا دیتی تھیں۔

ابا کے ایک تایازاد بھائی تھے۔ ان کا نام حافظ جان محمد تھا۔ ہم سب انھیں تایا کہتے تھے۔ تایا ہر وقت مصروف رہتے تھے۔ وہ بیک وقت متعدد کام کرتے تھے۔ وہ قریبی گاؤں دانے وال کے پرائمری سکول میں پڑھاتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں دو مساجد تھیں، وہ بڑی مسجد کے خطیب اور اس کی انتظامی کمیٹی کے صدر تھے۔ اگرچہ عام نمازیں پڑھانے کے لیے علیحدہ امام تھا، وہ جمعہ کی نماز کی امامت خود کرتے تھے،

1- جس پر کوئی کپڑا نہ بچھایا گیا ہو۔

پنجابی میں وعظ کہتے تھے اور عربی میں خطبہ پڑھتے تھے۔ ان کی درسی کتابوں اور سٹیشنری کی دو دکانیں تھیں، ایک گاؤں میں اور دوسری جالندھر شہر میں۔ ان دونوں دکانوں کو چلانے کے لیے انھوں نے دو ملازم رکھے ہوئے تھے۔ گاؤں کی دکان کا انتظام ایک شخص عبدالسلام کے سپرد تھا۔ ہمارے گاؤں میں کتابوں اور سٹیشنری کی یہ اکلوتی دکان تھی۔ ہم سب اپنی ضرورت کی اشیا وہیں سے خریدتے تھے۔ جالندھر میں ان کی جو دکان تھی، اس کا منیجر ہمارے ہی گاؤں کا ایک شخص فتح محمد تھا۔ پتا نہیں تایا جان کو اس دکان سے کوئی یافت ہوتی تھی یا نہیں لیکن فتح محمد بہت ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتا تھا: عام طور پر دو گھوڑا بوسکی کی قمیص پہنتا تھا۔

مسلک کے اعتبار سے تایا جان دیوبندی تھے۔ انھوں نے اہلسنّت والجماعت کے نام سے ایک تنظیم بھی بنا رکھی تھی۔ وہ ہومیوپیتھی بھی جانتے تھے لیکن جم کر پریکٹس نہیں کرتے تھے، جو مریض آ جاتا، اسے دوا کی پڑیاں یا شیشیاں تھما دیتے لیکن پیسا کوئی وصول نہیں کرتے تھے۔

تایا جان کے بڑے بڑے علما سے تعلقات تھے۔ وہ مولانا احمد علیؒ لاہوری کے مرید تھے اور خیرالمدارس[1] جالندھر کے بانی اور مہتمم مولانا خیر محمد سے تو ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ ان کی دعوت پر مولانا آخری جمعہ پڑھانے اور وعظ کرنے ہمارے گاؤں آتے رہتے تھے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ تنگ نظر نہیں تھے اور نہ عورتوں کی تعلیم کے مخالف۔ ہمارے گاؤں میں زنانہ مدرسہ تو بھی کا کھل چکا تھا لیکن اس میں پڑھائی صرف چوتھی جماعت تک ہوتی تھی [اس زمانے میں پرائمری سکول صرف چار جماعتوں تک محدود ہوتا تھا]۔ ان کی بیٹی عالم بی بی اور بھتیجی رحمت بی بی اس سکول میں اپنی پڑھائی مکمل کر چکی تھیں۔ وہ انھیں مزید تعلیم دلانے جالندھر لے گئے اور وہاں آغا عبدالحق عباس کے "مدرسۃ البنات" میں داخل کرا دیا۔ [اس مدرسے کے جھنڈے دور دور تک گڑے ہوئے تھے اور ضلع جالندھر کے لوگوں کو آغا صاحب پر اندھا اعتماد تھا، جہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو ترکِ وطن کر کے بعض افریقی ممالک میں آباد ہو گئے تھے، بلا جھجک اپنی بچیوں کو تعلیم دلانے کے لیے مدرسۃ البنات بھیج دیا کرتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ان کی دختر نیک اختر میر النسا خانم نے جو اس کی پرنسپل تھیں، اسے ایک روڈ لاہور پر منتقل کر دیا۔ 1973 میں اسے قومی تحویل میں لے لیا گیا اور اس عظیم درسگاہ کا بھی وہی حشر ہوا جو دوسرے قومیائے گئے تعلیمی اداروں کا ہوا۔]

تایا جان محمد کے بڑے بیٹے کا نام محمد بشیر ہے۔ وہ مجھ سے ایک سال بڑے ہیں، وہ میرے بھائی ہی نہیں، بہترین دوست بھی تھے اور اب بھی ہیں۔ وہ سکول میں داخل ہو چکے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی میں بھی سکول جانے لگا۔ میرے گھر والوں کو یہ تو معلوم تھا کہ میں سکول جاتا ہوں لیکن کسی کو بھی بھولے سے یہ

---

1- یہ مدرسہ اب ملتان میں کام کرتا ہے اور تحریک ختم نبوت کا بہت بڑا مرکز ہے۔

خیال تک نہ آیا کہ انھوں نے مجھے وہاں داخل بھی کرانا ہے۔ ایک روز تایا جان کسی کام سے سکول آئے۔ انھوں نے وہاں مجھے دیکھ لیا اور پوچھا: ''یہاں کیا کر رہے ہو؟'' ''پڑھتا ہوں۔'' ''داخل ہو گئے ہو؟'' ''وہ کیا ہوتا ہے؟'' [میری بلا جانے کہ داخل ہونا کیا ہوتا ہے۔] منشی علی محمد پاس کھڑے تھے [اس زمانے میں بیت کے سکولوں کے اساتذہ کو منشی کہا جاتا تھا اور یہ بہت معزز اور قابل احترام لفظ ہوتا تھا۔ ماسٹر کہنے اور کہلوانے کا رواج پاکستان بننے کے بعد شروع ہوا۔] انھوں نے کہا: ''ابھی نہیں۔'' تایا جان نے منشی جی سے داخلے کا فارم لیا، اسے پُر کیا، حافظے سے میری تاریخ پیدائش لکھی۔ [پتا نہیں یہ صحیح تھی یا غلط۔ ہم تمام بھائیوں اور چچا کے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی پیدائش کی تاریخیں ان کی ڈائری میں تحریر تھیں۔ افراتفری میں یہ ڈائری ہندوستان میں ہی رہ گئی اور مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ میری صحیح تاریخ پیدائش کیا ہے] اور فارم منشی جی کے حوالے کر دیا۔ لیجیے ہم سکول میں داخل ہو گئے اور اسی پڑھنے پہ لگے [ہم پڑھنے لگے]۔

## 2

پہلی جماعت میں پڑھائی کے لیے جن چیزوں کی ضرورت پیش آتی تھی، ان میں سے عموماً صرف دو دکان سے خریدنا پڑتی تھیں: ایک لکڑی کی تختی، دوسری پہلی جماعت کا قاعدہ۔ سیاہی (روشنائی) کوئی نہیں خریدتا تھا، سب طالب علم خود ہی بنایا کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے توے کے نچلے حصے سے کالک اور کیکر کے درختوں سے گوند[1] اتاری جاتی تھی۔ تھوڑا سا پانی ملا کر کالک کو کونڈی میں بہت اچھی طرح گھوٹا جاتا، پھر اس میں گوند ملا دی جاتی۔ گھوٹائی دوبارہ شروع ہو جاتی تا آنکہ دونوں چیزیں یک جان ہو جاتیں۔ اس آمیزے میں مزید پانی انڈیل دیا جاتا، نہ اتنا کم کہ سیاہی بالکل ہی گاڑھی ہو جاتی نہ اتنا زیادہ کہ وہ بالکل رقیق ہو جاتی اور لکھتے وقت تختی پر پھیلنے لگتی۔ لیجیے، سیاہی تیار ہو گئی۔ گوند ملانے سے اس میں گاڑھا پن آ جاتا، خود یہ چمکیلی ہو جاتی اور تختی پر الفاظ بھی درخشاں درخشاں نظر آنے لگتے۔

قاعدہ حکومت پنجاب کا محکمہ تعلیم شائع کرتا تھا۔ اس کا انداز بالکل دقیانوسی تھا۔ اس میں نہ کوئی تصویر ہوتی تھی اور نہ یہ مجلد ہوتا تھا۔ جلد نہ ہونے کی وجہ سے اس کے جلد پھٹ جانے کا خدشہ رہتا تھا۔ بعض مائیں اس کے گرد کاغذ لپیٹتیں اور اندر کی طرف سے گندوئی [لمبی سوئی۔ روئی بھری جانے کے بعد لحافوں کی سلائی بھی اسی سے ہوتی ہے] سے ٹانکے لگا دیتیں اور یوں قاعدہ قدرے محفوظ ہو جاتا۔ قاعدے کا

---

1. گوند اردو میں بطور مذکر استعمال ہوتا ہے لیکن پنجابی میں بطور مونث۔ میں نے پنجابی کو ترجیح دی ہے۔

آغاز الف سے انار اور ب سے بکری وغیرہ سے نہیں ہوتا تھا بلکہ پہلے ہی صفحے پر پورے کے پورے حروف تہجی ترتیب وار چھاپ دیے جاتے تھے۔ پھر اگلے صفحوں پر حروف کے جوڑوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر الفاظ بنانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ہمیں ان کے سمجھنے میں کوئی خاص وقت اس لیے پیش نہیں آتی تھی کیونکہ ہم میں سے بیشتر طلبا مسجد میں عربی کا کم از کم قاعدہ ضرور پڑھ چکے ہوتے تھے۔ قاعدے کا اختتام دو گھسے پٹے لطیفوں پر ہوتا تھا: ایک بے وقوف نے دوسرے بے وقوف سے پوچھا، "اگر دریا میں آگ لگ جائے، مچھلیاں کہاں جائیں گی؟" "درختوں پر چڑھ جائیں گی۔" جھٹ جواب ملا۔ یا کسی نے بچھو سے پوچھا، "تم سردیوں میں باہر کیوں نہیں نکلتے؟" جواب ملا، "گرمیوں میں میری کون سی خاطر ہوتی ہے کہ سردیوں میں بھی باہر نکل آؤں۔"

پڑھنے کو اور کوئی کتاب یا رسالہ تو ہوتا نہیں تھا، قاعدے کو بار بار پڑھنے کے بعد یہ لطیفے ایسے ازبر ہوئے کہ آج تک ذہن سے نکل نہیں سکے۔

حساب میں پہلے سو تک گنتی سکھائی جاتی تھی۔ یہ گنتی عموماً پنجابی میں سکھائی جاتی تھی۔ پنجابی کے اکثر ہندسے آسانی سے اردو میں منتقل کیے جا سکتے ہیں، مثلاً ترن (تین)، ست (سات)، بائی/تیئی (بائیس/تیئیس)، بتی (بتیس)، چوالی یا چتالی (چوالیس)، بونجا (باون) وغیرہ۔ تاہم بعض ہندسے ایسے بھی ہیں جن کی اردو بنانے میں بے شمار پنجابیوں کو سخت مشکل پیش آتی ہے۔ آج بھی ٹی وی کی سکرینوں پر بعض پڑھے لکھے سیاست دان جلد بازی یا لاعلمی کی وجہ سے سترسٹھ کو ستاسٹھ اور اڑسٹھ کو اٹھاسٹھ کہہ جاتے ہیں [حالانکہ یہ صحیح پنجابی بھی نہیں۔ پنجابی میں ان کا صحیح تلفظ ستاٹ اور اٹھاٹ ہے]۔ جہاں تک نواسی (89) کا تعلق ہے، بعض لوگ اسے بھی (اناسی) (79) بنا دیتے ہیں۔ [پنجابی میں نواسی کا تلفظ اٹانوے اور ننانوے کا نڑوییں ہے۔ یوں ان دو ہندسوں کے تلفظ میں بھی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔]

جب بچے سو تک گنتی سیکھ جاتے، پھر پہاڑے سکھانے کا عمل شروع ہو جاتا۔ استاد پہلے لہک لہک کر رہا [آپ اسے ترنم یا خوش الحانی کہہ لیں] تے "ایک دونی دو، دو دونی چار، تین تیہا نو، چار تیہا بارہ، پنج پانجا پنجی، چھ چھکا چودوی" وغیرہ کہتا اور ساری کلاس استاد کے نقش قدم پر چلتے لہک لہک کر، اپنے جسم کو آگے پیچھے جھلاتے رہا ہی سے اتنی بلند آواز سے استاد کا کہا دہراتی کہ در و دیوار بلکہ چھت بھی لرز کر رہ جاتی۔ پہلی جماعت میں ایک سے دس تک اور دوسری میں گیارہ سے سولہ تک پہاڑے سکھائے جاتے تھے [یعنی تان 16x16 =256 پر ٹوٹتی تھی]۔ تیسری جماعت میں، ڈوڑھ (ڈیڑھ 1-1/2)، ڈھائی (اڑھائی۔ 2-1/2)، ساڑھے تین (ساڑھے تین۔ 3-1/2) اور 4-1/2 کے پہاڑے ازبر کرائے جاتے۔ چوتھی

جماعت میں 1-1/2 ضرب 11-1/2، 2-1/2×1-1/2، 3-1/2 ضرب 1-1/2، 2-1/2 وغیرہ کی باری آتی۔ سارا عمل میکانکی (mechanical) ہوتا تھا۔ اس میں سوچ کا کوئی خاص دخل نہیں ہوتا تھا لیکن بار بار کی دہرائی سے یہ پہاڑے اس طرح ذہن میں بیٹھ گئے تھے کہ میں آج بھی بیشتر حساب زبانی کر لیتا ہوں، کبھی انگلیوں تک کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

قاعدے کی پڑھائی اور گنتی یا پہاڑوں کی سکھائی صبح کے اوقات میں ہوتی تھی۔ بارہ بجے گھنٹی بجتی تھی اور کھانے کی چھٹی ہو جاتی تھی۔ شام کو لکھائی ہوتی تھی یا پھر املا لکھائی جاتی تھی۔ روشنائی کی طرح ہم لکھنے کے قلم بھی خود ہی بناتے تھے۔ اس مقصد کے لیے زیادہ تر کانا (سرکنڈا) استعمال ہوتا تھا۔ کانا ہمارے دریا میں بہتات سے ہوتا تھا۔ [دریا میں یہ تب پیدا ہوتا تھا جب اس کا پانی اتر چکا ہوتا تھا۔] دسمبر جنوری میں یہ پک جاتا تھا اور اس کا رنگ ہلکا زرد ہو جاتا تھا۔ کسان دریا کا رخ کرتے، سرکاری ٹھیکے دار کو مقررہ معمولی فیس ادا کرتے، کانا کاٹتے اور گڈوں کے گڈے (چھکڑے) بھر کر لے آتے۔ یہ کانے بطور بالن (ایندھن) چولہوں میں جلائے جاتے لیکن بہت کم۔ [اس وقت انھیں بحیثیت مجموعی سلواڑ کہا جاتا تھا۔] جلانے کے لیے ایک اور جھاڑی، جسے کائی (کاہی) کہا جاتا تھا، دریا ہی سے کاٹ کر لائی جاتی تھی۔ یہ جھاڑی گچھے دار ہوتی تھی۔ اچھی طرح سوکھ جانے کے بعد اس کا جلانا بہت آسان ہو جاتا تھا۔ اس کی تپش بھی کانوں سے کہیں زیادہ ہوتی تھی اور اس کے کوئلوں سے حقوں کی چلمیں بھی بھری جاتی تھیں۔ کانے میں ایک خرابی یہ ہوتی تھی کہ اس کی کھوری [تنے کو ڈھانکنے والے کھوترے سے پتے] روئیں دار ہوتی ہے۔ اس پر ہاتھ رکھتے ہی یہ روئیں ہتھیلی پر چبھنے لگتے ہیں۔ تکلیف تو کوئی خاص نہیں ہوتی مگر ساڑھ (چبھن) کا احساس بہت ہوتا ہے۔

کانوں کو کوٹ کر عموماً مُنجی بنائی جاتی تھی۔ یہ مُنجی بہت کام کی چیز ہوتی تھی۔ اس سے رسیاں رسے بنائے جاتے اور منجیاں (چارپائیاں) بُنی جاتی تھیں۔ [آج بھی اس قسم کی منجیاں لاہور کے بانسوں والے بازار میں مل جاتی ہیں اور غریب غربا عموماً انھیں پر سوتے ہیں]۔ کانوں سے فرنیچر کی اشیا بھی بنائی جاتی تھیں۔ یہ بھی بعض دکانوں پر مل جاتی ہیں۔

کانے دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک کچے اور قدرے نرم، دوسرے خوب پکے ہوئے اور خاصے سخت۔ ہاتھوں کی انگلیوں، بانس اور گنے کی طرح کانے کی بھی پوریں ہوتی ہیں۔ ہم قلم بنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ سخت کانا ڈھونڈتے تھے، نچلے حصے کی پوریں کاٹتے تھے۔ اصلاً سخت یہی ہوتی تھیں۔ اوپر کی پوروں کا گودا نرم سے نرم تر ہوتا جاتا ہے اور یوں اچھا قلم بنانے کے لیے بیکار ہو جاتی تھیں۔ جیبوں سے چاقو نکالتے تھے۔ [یہ چاقو چھوٹے ہوتے تھے، خاصے تیز ہوتے تھے اور آسانی سے جیبوں میں

رکھے جا سکتے تھے۔ انھیں بہت احتیاط سے استعمال کرنا پڑتا تھا ورنہ کسی نہ کسی انگلی کے چر جانے کا اندیشہ لاحق رہتا تھا۔[ قلم تراشتے ( پنجابی: گھڑنا )، اور جب اس کی تراشیدہ نوک کچھ بڑی اور آگے سے باریک ہو جاتی تھی، اس کا اگلا حصہ میز یا کسی دوسری لکڑی پر ٹکا کر چاقو سے کاٹ کر نیچے پھینک دیا جاتا تھا اور نوک کے بقیہ حصے کے عین درمیان میں چاقو ہی سے چیر اوپر دیا جاتا تھا۔ اس سارے کام میں بے حد احتیاط، انہماک، مشق اور قدرے مہارت کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اگر یہ نوک صحیح اور اس کا چیرا ( چیر ) درست بن جاتا، تختی پر لکھائی بہت اچھی ہو سکتی تھی، ورنہ الفاظ کا صحیح انداز سے لکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔

بعض اوقات ہم دکان سے کلک کی پوریں خرید لاتے۔ کلک میں گودا نہیں ہوتا اور یہ ہوتا بھی بہت سخت ہے، چنانچہ اس کا قلم بھی بہت اچھا ہوتا تھا مگر یہ تختی پر کم اور کاغذ پر زیادہ چلتا تھا۔

میں اور عبدالعزیز، جس نے بعد میں عبدالعزیز خالد کے نام سے بحیثیت شاعر اور ادیب بڑا نام کمانا تھا [ہم اسے صرف عزیز کہا کرتے تھے]، اکٹھے پہلی جماعت میں داخل ہوئے تھے اور ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ ویسے تو اس کا گھر ہمارے گھر کے قریب ہی تھا مگر چونکہ یہ ہماری گلی کے پچھواڑے ایک دوسری گلی میں واقع تھا، اس لیے بڑا لمبا چکر کاٹ کر وہاں پہنچا جا سکتا تھا۔ میں نے اس کا توڑ ڈھونڈ لیا تھا۔ ہماری گلی سے ایک اور گلی نکلتی تھی۔ اس گلی میں صرف ایک ہی مکان بنا ہوا تھا۔ اس مکان کے ویہڑے ( صحن ) کی ایک کندھ ( دیوار ) عزیز کے گھر کے صحن کو الگ کرتی تھی۔ یہ دیوار کوئی خاص اونچی نہیں تھی۔ میں اسے آسانی سے پھلانگ کر عزیز کے گھر میں چلا جاتا تھا۔ ہم دونوں گھنٹوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے اور گپیں ہانکتے رہتے تھے۔ اس کی امی ویسے تو خوش شکل تھیں مگر تھیں قدرے بھاری بھرکم۔ وہ میرے ساتھ بہت پیار اور خندہ پیشانی سے پیش آتی تھیں اور ہماری باتوں میں قطعاً تعرض نہیں کرتی تھیں۔

عزیز کم آمیز تھا اور آسانی سے دوسروں میں گھلتا ملتا نہیں تھا۔ وہ کبھی کسی کے گھر نہیں جاتا تھا، یہاں تک کہ میرے بھی نہیں۔ وہ ہمارے رنگ برنگے کھیلوں میں بھی کبھی شریک نہیں ہوتا تھا، صرف پڑھتا رہتا تھا۔ بعد میں وہ میرے ہم نام عبدالحمید چڑی مار سے اور منظور احمد میراثی کا دوست بھی بن گیا تھا اور ان کے ساتھ چہک چہک کر بعض اوقات اٹک اٹک کر باتیں کرتا تھا۔ اس کی زبان میں ہلکی سی لکنت تھی۔

عزیز قلم بہت نفیس اور عمدہ بناتا تھا۔ اس کا خط اتنا خوبصورت اور دیدہ زیب تھا کہ معلوم ہوتا تھا موتی پرو رہا ہے۔ ہمیں اس کی لکھائی پر بہت رشک آتا تھا۔ اتنی خوبصورت لکھائی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ بعد میں اس نے اپنی نعتوں کا جو مجموعہ شائع کرایا اس کی کتابت اس نے خود کی تھی۔ معلوم نہیں یہ مجموعہ اب دستیاب ہے بھی یا نہیں۔

میرا ایک اور ہم جماعت تھا۔ میری اس کے ساتھ بھی دوستی ہو گئی تھی۔ اس کا نام موہن تھا۔ وہ یوں تو بہت اچھا تھا اور باتیں چبا چبا کر کرتا تھا مگر پڑھنے لکھنے میں بالکل نکھد تھا۔ اس کا باپ کبھی کا مر چکا تھا اور اس کی بیوہ ماں اپنے مسلمان پڑوسیوں کے گھروں میں کام کر کے اپنا اور اس کا پیٹ پالتی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کی نالائقی اور آوارہ گردی سے بہت نالاں رہتی اور اکثر اسے ڈانٹ ڈپٹ کرتی رہتی تھی۔ خود موہن اپنے آپ سے عاجز آ چکا تھا اور ایک روز گھر سے ایسا غائب ہوا کہ کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا ہے۔ بیچاری ماں اسے کہاں ڈھونڈتی، چند دن رو دھو کر خاموش ہو گئی۔

ہماری پہلی جماعت کے استاد کا نام احمد بخش تھا۔ ان کا قد درمیانہ، شکل واجبی اور رنگ گندمی تھا۔ وہ خاصے ماٹھے استاد تھے اور کبھی کسی کلاس کو رام نہ کر سکے۔ اس لیے انھیں کبھی اوپر کی کلاسیں نہ مل سکیں، ساری عمر پہلی جماعت کو پڑھاتے گزار دی۔

منشی احمد بخش کے والد کا نام محمد بخش تھا۔ وہ بھی اپنے بیٹے کی طرح درمیانہ قامت تھے تاہم بیٹے کے برعکس ان کا جسم قدرے بھاری تھا مگر پیٹ کوشش کے باوجود باہر نہیں نکل سکا تھا۔ وہ طبابت کرتے تھے۔ معلوم نہیں طبابت انھوں نے کسی سے سیکھی تھی یا وہ خانہ ساز طبیب تھے۔ ان کے پاس صرف ایک ہی جوشاندے کا نسخہ تھا جس سے وہ نزلے، زکام اور معمولی بخاروں کا علاج کرتے تھے۔ فیس کم ہی کسی سے لیتے تھے۔ وہ اپنے بالوں کو وسمے اور داڑھی کو مہندی سے رنگتے تھے۔ دوسرے بڑے بزرگوں کی طرح ہم انھیں بھی میاں جی کہہ کر پکارتے تھے۔ ایک روز میں ان کے دو بچے (نواسے) منظور احمد سے ملنے ان کے گھر گیا۔ ان کی عینک میز پر پڑی تھی۔ اس کا فریم لوہے کا تھا۔ معلوم نہیں مجھے یہ عینک کیوں بھا گئی اور میرے دل میں ایک معصوم سی خواہش مچلنے لگی: ''کاش میں بھی اس قسم کی عینک پہن سکتا۔'' شاید وہ وقت قبولِ دعا تھا، چند ہی سالوں بعد مجھے عینک لگ گئی اور میں کبھی اس سے پیچھا نہ چھڑا سکا۔ اسی لیے تو دانا کہا کرتے تھے کہ دعا بھی سوچ سمجھ کر اور آگا پیچھا دیکھ کر مانگنا چاہیے، کہیں الٹی نہ پڑ جائے۔

محمد بخش ذات کے میراثی (پنجابی: مراثی) تھے۔ پنجاب کے شہروں کے اکثر مراثی یوپی کے بھانڈوں کی طرح گانے بجانے کا دھندا کرتے تھے۔ بڑے بڑے موسیقاروں اور گویوں کو عموماً طنزاً مراثی ہی کہا جاتا تھا۔ ان کے فن سے محظوظ بھی ہوتے تھے مگر سماجی اعتبار سے انھیں کم تر گردانتے تھے۔ اگر کوئی غیر مراثی گانا سیکھنے یا گانے کی کوشش کرتا، اس کے گھر والے اسے طعنہ دیتے: ''کیا توں مراثی ہو گیا ایں'' اور اس کا جینا حرام کر دیتے۔ بیٹ کے دیہاتوں کے مراثی یہ دھندا قطعاً نہیں کرتے تھے۔ یا تو ان میں ذوقِ لطیف کی کمی تھی یا قدرت نے انھیں مزاج ہی ایسا ودیعت کیا تھا۔ ہمارے مراثی نہ صرف گاتے

بجاتے نہیں تھے بلکہ سرے سے کوئی کام ہی نہیں کرتے تھے۔ پھر ان کا گزارہ کیسے ہوتا تھا؟

پنجاب کے باقی علاقوں کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر ہمارے ہاں کسانوں اور اہلِ حرفت (لوہار، ترکھان، نائی وغیرہ) کے مابین ایک خاموش معاہدہ ہوتا تھا جسے عرفِ عام میں "سیپی" کہا جاتا تھا: "تمھاری کس کے ساتھ سیپی ہے؟" "نور دین لوہار سے۔" اس خاموش معاہدے کی رو سے اہلِ حرفت کو ان کی خدمات کے عوض نقد معاوضہ نہیں دیا جاتا تھا بلکہ فصل کی کٹائی کے بعد انھیں کنک (گندم)، مکئی، دھان وغیرہ کی ایک دو بھریاں (پولے/گٹھے) دے دی جاتی تھیں۔ میاں محمد بخش بھی اس موقع پر پہنچ جایا کرتے تھے اور اپنا حصہ طلب کرنے لگتے تھے۔ سب کو معلوم ہوتا تھا کہ اس کو حصہ تو دینا ہی پڑے گا ورنہ ناک کٹ جانے کا خدشہ رہتا تھا۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی کسان پوچھ ہی بیٹھتا: "حصہ کس بات کا؟" میاں محمد بخش جواب دیتے: "تمھاری پیڑھیوں کا حساب رکھنے کا۔" اور اپنی پوتھی کھول کر، جو انھوں نے اپنی بغل میں دبائی ہوتی تھی، اصلی یا خود ساختہ شجرۂ نسب سنانا شروع کر دیتے۔

بیت کے دوسرے لوگوں کی طرح مراثیوں کی نئی نسل نے بھی پڑھنے لکھنے میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ خود میاں محمد بخش معمولی پڑھے لکھے تھے مگر ان کا اکلوتا بیٹا احمد بخش مڈل تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد استاد، پہلی جماعت کا ہی سہی، بن چکا تھا۔ ان کا اکلوتا پوتا مشتاق احمد، جو باپ اور دادا کے برعکس بہت گورا چٹا اور وجیہہ نوجوان تھا، مڈل پاس کرنے کے بعد کمالیہ کے قریب کسی گاؤں میں پٹواری کی حیثیت سے ملازمت کرنے لگا تھا۔ ان کا دوہتا منظور احمد، جو غالباً اپنی ماں کے فوت ہونے کے بعد انھیں کے ساتھ رہنے لگا تھا، وہ تھا تو دبلا پتلا مگر مشتاق کے برعکس اس کا رنگ گندمی تھا۔ وہ مجھ سے اور عزیز سے دو تین سال سینئر تھا اور اسلامیہ ہائی سکول ٹنگل انبالہ میں پڑھتا تھا۔ وہ شعر بھی کہتا تھا اور سعید تخلص کرتا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے شعر کافی کمزور ہوتے ہیں، اس لیے وہ اکثر عزیز سے اصلاح لیتا رہتا تھا۔ اس کے شعر کبھی کسی رسالے وغیرہ میں چھپ سکے تھے یا نہیں، مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا۔ وہ باتیں بہت کرتا تھا اور کسی کو بھی وار نہیں آنے دیتا تھا۔ میٹرک کرنے کے بعد وہ ریلوے ہیڈ کوارٹرز میں کلرک بھرتی ہو گیا تھا اور لاہور منتقل ہو گیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ کبھی کبھی مجھ سے ملنے چلا آیا کرتا تھا۔

ہم ہنستے کھیلتے پہلی سے دوسری جماعت میں پہنچ گئے۔ ہمارے گاؤں کا سکول دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ پانچویں سے آٹھویں جماعت کی تعلیم گاؤں سے میل سوا میل دور پکی عمارت میں ہوتی تھی۔ پرائمری حصہ گاؤں کے اندر ہی تھا۔ اسے عام لوگ سکول نہیں مدرسہ کہتے تھے۔ اس کی عمارت ایک کمرے کے ماسوا، جس میں ڈاک خانہ قائم تھا، کچی تھی۔ یہ سکول عام مکانوں کے مقابلے میں خاصی اونچائی پر واقع تھا

اور اس تک پہنچنے کے لیے دس بارہ پوڑے (سیڑھیاں) چڑھنا پڑتے تھے۔ اس بلندی کا ایک فائدہ بھی تھا، برسات کے موسم میں جب زوروں کا مینہ برستا تھا اور ایک طرح کی جھڑی لگ جاتی تھی جو دو دو تین تین دن جاری رہتی تھی (ساون بھادوں کے مہینوں میں یہ جھڑی اکثر لگتی تھی)، گاؤں سے شمالی جانب جانے والا راستہ پانی سے اس قدر لبریز ہو جاتا تھا کہ گاؤں سے باہر نکلنا تقریباً ناممکن ہو جاتا تھا۔ یا تو چھپک چھپک پانی میں چلیں، گھر بیٹھے رہیں یا ایک طویل چکر کاٹ کر باہر نکلیں۔ ایسے مواقع پر ہم لڑکا لوگ چوتھی جماعت کے کمرے کی کھڑکی سے گلی سے چھلانگ لگاتے اور باہر نکلنے میں کامیاب ہو جاتے۔

پرائمری سکول کے صحن میں ایک نلکا تھا۔ اس کے پانی کی نکاسی کے لیے ایک چوبچہ بنا ہوا تھا۔ چوبچے کی دیواریں پختہ اینٹوں کی تھیں۔ چوبچہ کوئی خاص لمبا چوڑا تو نہیں تھا مگر قدرے ڈونگا (گہرا) ضرور تھا۔ پانی چوبچے میں جمع ہوتا رہتا اور جب بھر جاتا، اسے صحن میں چھڑک دیا جاتا تھا۔ ایک روز میں پانی پینے نلکے کی جانب بڑھا، پیچھے سے کسی لڑکے نے بے دھیانی میں مجھے دھکا دے دیا۔ سامنے چوبچہ تھا۔ میں اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا، گرا اور میری پیشانی سیدھی چوبچے کی دیوار سے جا ٹکرائی۔ میرے ماتھے سے خون بہہ نکلا۔ چند لڑکوں نے مجھے گھر پہنچایا۔ اماں نے دیکھا تو سر پیٹ لیا تاہم اس نے اپنے حواس قابو میں رکھے۔ اس نے میری پیشانی کو پانی سے دھویا، صاف ستھرے کپڑے سے اس کی صفائی کی، روئی کی پونی سرسوں کے تیل میں بھگوئی، زخم پر رکھی، اپنا ململ کا دوپٹا پھاڑا، اور اس کی ایک دھجی سر کے گرد لپیٹی اور کس کر باندھ دی۔ (ان دنوں دیہاتوں میں ہمارا علاج کچھ اسی طرح کا ہوتا تھا۔) وہ ایک آدھ دن کے بعد پٹی بدل دیتی۔ چند دنوں کے بعد زخم بھر گیا اور اس پر کھرینڈ (کُھرنڈ) بن گیا۔ پٹی اتار دی گئی۔ کھرینڈ سے تکلیف تو خاص نہیں ہوتی تھی مگر جھلاہٹ بہت ہوتی تھی کیونکہ اس میں کھاج (کھجلی) بہت ہوتی تھی۔ بڑی مشکلوں سے کھجلی کرنے سے اپنے آپ کو باز رکھتا تھا کیونکہ خارش کرنے سے زخم کے دوبارہ کھل جانے کا خدشہ تھا اور اماں سخت ناراض ہوتیں۔ چند مزید دن گزر گئے، کھرینڈ پک کر خود بخود اتر گیا مگر اپنے پیچھے گھاؤ کا گہرا نشان چھوڑ گیا۔ تقریباً ستر سال گزرنے کے بعد یہ نشان تقریباً معدوم ہو گیا ہے مگر اس کے آثار اب بھی باقی ہیں اور غور سے دیکھنے کے بعد نظر آ جاتے ہیں۔

خود ساختہ علاج کا ایک اور واقعہ اور بھی عجیب بلکہ ناقابل یقین ہے۔ گاؤں کے اندر ہماری حویلی تنگ پڑ گئی۔ (بعض الفاظ بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ ایک علاقے میں اس کے معنی کچھ ہوتے ہیں مگر دوسرے علاقے میں ان کے بالکل متضاد۔ حویلی اسی قسم کا لفظ ہے۔ شہروں میں وسیع و عریض اور عالی شان مکان، بلکہ محل کو حویلی کہا جاتا ہے، جیسے اندرون شہر لاہور میں دھیان سنگھ کی حویلی، اتنی لمبی چوڑی کہ آج کل اس

میں لڑکیوں کا کالج کام کر رہا ہے مگر ہمارے علاقے میں حویلی مویشیوں کے باڑے کو کہا جاتا تھا۔)

کہیں مشاعرہ ہو رہا تھا، ایک سکھ کو بھی اس کی بھنک پڑ گئی۔ اسے مشاعرہ سننے کا شوق چرایا اور وہ اپنے چند ساتھیوں سمیت مشاعرہ گاہ میں پہنچ گیا۔ وہاں کوئی شاعر اپنی غزل سنا رہا تھا۔ اس کا قافیہ مکان، دکان وغیرہ اور ردیف بیچتا ہوں تھی۔ حاضرین اسے داد بھی دے رہے تھے اور بے داد کی تالیاں بھی بجا رہے تھے، بلکہ ایک طرح کی ہوٹنگ کر رہے تھے۔ سردار صاحب نے جب شاعر کو مکان اور دکان بیچتے سنا، انھیں تاؤ آ گیا۔ وہ غصے سے پھنکارتے اپنی نشست سے اٹھے، خشمگین نگاہوں سے شاعر کو گھورا اور بلند آہنگ لہجے میں صاحب صدر سے مخاطب ہو کر بولے: ''پردھان جی، ساڈوں وی بڑے پکے شعر ہو گئے آں، ساڈوں وی سنان دی اجازت دیو۔'' صاحب صدر سردار صاحب کے تیور بھانپ گئے اور جلدی سے بولے:

''کیوں نہیں، سردار صاحب، سٹیج پر تشریف لائیں اور ہمیں اپنے کلام بلاغت نظام سے محظوظ فرمائیں۔''

سردار صاحب جھومتے جھامتے سٹیج پر پہنچے، مائیک اپنی طرف کھینچا اور اپنی کھڑاک دار آواز میں بولے:

میں مجھ[1] بیچتا ہوں، میں گاں[2] بیچتا ہوں۔
میں اپنی حویلی کی تھاں بیچتا ہوں۔

محفل کشتِ زعفران بن گئی۔ سردار صاحب بھی مسکرانے لگے کہ میدان مار لیا ہے۔

سردار صاحب کا شعر جیسا کیسا بھی ہے مگر اس میں حویلی کا استعمال بالکل انھی معنوں میں ہوا ہے جو راقم الحروف نے اوپر بیان کیے ہیں۔

جب ہماری نئی حویلی تعمیر ہو رہی تھی، ایک روز میں اور میرا چھوٹا بھائی راج کو کام کرتے دیکھنے وہاں پہنچ گئے۔ میں تو وہیں کھڑا رہا مگر میرا بھائی حویلی اور قریب کے کھیت کے درمیان گلی میں کھیلنے لگا۔ اتنے میں ایک کتا، جو معلوم نہیں باؤلا ہوا تھا یا نہیں، زور سے بھاگتا ہوا آیا۔ کتے کو دیکھتے ہی بھائی کی دھوتی کھل گئی اور وہ زمین پر گر پڑی۔ کتا آیا اور اس کے قریب سے گزرتے گزرتے اس کے پٹ (ران) کی بُرکی (بوٹی/لقمہ) کاٹ کر چلتا بنا۔ اس کی دلدوز چیخیں سن کر ہم سب باہر بھاگے۔ ابا نے اسے اٹھایا اور وقتی طور پر گھاؤ کا خون بند کرنے کے لیے ایک صاف ستھرا کپڑا کس کر اس کی ران پر باندھ دیا۔ کتے کے کاٹے کے ایلوپیتھک علاج میں پیٹ میں چودہ ٹیکے لگوانا پڑتے ہیں۔ معلوم نہیں اس زمانے میں یہ ٹیکے دستیاب

---

1۔ بھینس۔

2۔ گائے۔

تھے بھی یا نہیں۔ پھر ران پر سرجن سے ٹانکے لگوانا پڑتے۔ ٹیکے اور سرجن جالندھر شہر کے سرکاری ہسپتال کے ماسوا کہیں نہیں مل سکتے تھے۔ اول تو ہم دیہاتیوں کو ان چیزوں کا کوئی علم ہی نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو کالے کوسوں دور جالندھر شہر پہنچنا امر محال تھا، کوئی سواری دستیاب نہیں تھی۔

ابا نے بھائی کی ران کو کپڑے سے کس کر باندھ تو دیا لیکن ہم سوچ رہے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ ابا مطلق گھبرائے ہوئے نہیں تھے۔ انھوں نے ایک دیسی ٹوٹکا کہیں سے سن رکھا تھا، وہ اسی کو بروئے کار لائے۔ انھوں نے گھر سے سرسوں کا تیل، سرخ مرچیں اور کونڈی منگوائی۔ کونڈی میں مرچیں اچھی طرح گھوٹی گئیں یہاں تک کہ وہ بالکل ملیدہ بن گئیں۔ انھوں نے زخم پر سے کپڑا اتارا، اسے سرسوں کے تیل سے چپڑا اور پھر اس میں مرچوں کا ملیدہ بھر دیا۔ اس زمانے کے دیہاتیوں کو قطعاً معلوم نہیں تھا اور ان کی اکثریت کو تو غالباً آج بھی معلوم نہیں ہوگا کہ septic یا anti-septic کیا ہوتا ہے لیکن مرچ سب سے بڑی anti-septic ہوتی ہے۔ اس سے زخم septic ہونے سے بچ گیا ورنہ شاید ٹانگ ہی کٹوانا پڑتی۔ چند دنوں کے بعد گھاؤ بھر گیا اور بتدریج مندمل ہو گیا۔ [ ہم جو آئے روز مالا وٹ ملی اشیا کھاتے اور ہضم کرتے رہتے ہیں، کیا ہمارے معدوں کو صحت مند رکھنے میں یہی مرچ تو کوئی کردار ادا نہیں کرتی ؟ ] اس کے بعد بھائی کی ٹانگ میں کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی اور نہ اسے کبھی لنگڑا کر چلنا پڑا۔ یہ واقعہ میری آنکھوں کے سامنے پیش آیا تھا اور میں حلفاً کہہ سکتا ہوں کہ بالکل سچا ہے، میں نے اس میں قطعاً کوئی مبالغہ آرائی نہیں کی۔

پھر کچ بچ ہمارے گاؤں میں ڈسپنسری قائم ہو گئی۔ یہ ڈسپنسری ڈسٹرکٹ بورڈ نے قائم کی تھی یا گاؤں کے لوگوں نے اپنی مدد آپ کے تحت خود، میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس وقت میری عمر اتنی نہیں ہوئی تھی کہ ان باتوں کو سمجھ سکتا، تاہم ایک بات میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ اس میں جو ڈاکٹر کام کرنے آیا تھا، وہ ہمارے گاؤں کا جوائی ( داماد ) تھا۔ اسی سے مجھے یہ شک گزرتا ہے کہ یہ شاید گاؤں والوں کا ہی کارنامہ ہو۔

اس زمانے میں امرتسر میں ایک میڈیکل سکول ہوا کرتا تھا۔ اس میں غالباً میٹرک پاس طلبا کو داخلہ ملتا تھا۔ کورس تین چار سال کا ہوتا تھا۔ اس میں طلبا کو ابتدائی طبی تعلیم دی جاتی تھی جس سے وہ عام امراض کا علاج کرنے، زخموں کے ٹانکے لگانے، دانت نکالنے وغیرہ کے قابل ہو جاتے تھے۔ ان طلبا کو آخری امتحان پاس کرنے کے بعد ایک ڈپلوما دیا جاتا تھا جسے (Licentiate of State Medical Faculty) LSMF کہا جاتا تھا۔ امتحان پاس کرنے کے بعد ان ڈاکٹروں کو زیادہ تر دیہاتوں یا چھوٹے قصبوں میں تعینات کیا جاتا تھا کیونکہ سہولتیں نہ ہونے کے باعث ایم بی بی ایس ڈاکٹر وہاں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس قسم کے

ڈاکٹر ایک سال مزید تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایم بی بی ایس کی ڈگری بھی حاصل کر سکتے تھے۔

ہمارے گاؤں کی ڈسپنسری میں جو ڈاکٹر تعینات ہو کر آئے تھے، ان کا اسم گرامی عبدالکریم تھا۔ وہ بڑے محنتی اور خوش طبع انسان تھے۔ جلد ہی ان کی شہرت آس پاس کے دیہاتوں میں پھیل گئی اور دور دور سے مریض آنے لگے۔ دور کے مریضوں کے ساتھ ان کے رشتے دار بھی ہوتے تھے۔ ان میں سے کئی ایک رات بھی ڈسپنسری کے احاطے میں گزارتے تھے۔ ہر وقت ایک رونق میلہ لگا رہتا تھا۔ لیکن ہمیں یہ جو چھوٹی سی سہولت ملی تھی، فلک کج رفتار کو وہ بھی پسند نہ آئی۔ چند ہی سال بعد دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی، ڈاکٹر عبدالکریم کو بلاوا آ گیا یا وہ خود ہی ہندوستانی فوج کے طبی شعبے میں بھرتی ہو گئے۔ نئے ڈاکٹر کا انتظار کرتے کرتے ہماری آنکھیں پتھرا گئیں لیکن قیام پاکستان تک کسی بھی ڈاکٹر نے ادھر کا رخ نہ کیا۔

پنجابی کہاوت ہے: کھچے نوں لت واری آ گئی۔ اس تبادلے سے خود ڈاکٹر عبدالکریم کا تو بج بھلا ہو گیا۔ جنگ کے دوران میں وہ کہاں کہاں تعینات رہے اور انھوں نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیے، مجھے کچھ معلوم نہیں تاہم اتنا ضرور معلوم ہے کہ قیام پاکستان کے بعد انھوں نے فوج کی ملازمت کو سلام کیا اور شیخوپورہ میں اپنا مطب (clinic) چلانے لگے۔ پھر انھوں نے اپنی ادویات کی دکان بھی کھول لی۔ ان کے دونوں دھندے اتنے کامیاب رہے کہ کچھ ہی سالوں میں ان کا شمار شہر کے رؤسا میں ہونے لگا۔ اس کا ایک پھل انھیں یہ ملا کہ وہ سابق چیف جسٹس آف پاکستان افضل ظلہ کے خسر (سمدھی) بن گئے۔

ڈسپنسری کے ساتھ ہمیں ایک اور تحفہ بھی ملا۔ یہ ہمارے گاؤں سے جالندھر شہر تک بس کا اجرا تھا۔ [تب بس کو لاری کہا جاتا تھا۔] انگوور کے قریب ایک گاؤں تھا۔ اس کا نام تو خورشید پورہ تھا مگر عام روایت کے مطابق لوگ اسے کسید پورہ کہتے تھے۔ وہاں کا ایک باشندہ خوشی محمد نام کا تھا۔ پتا نہیں اس نے اپنی زمین بیچی یا ادھر ادھر سے پیسا اکٹھا کیا۔ بہر حال اس نے کسی نہ کسی طرح ایک بس خرید لی اور ایک شخص کو بطور کلینڈر (کلینر) ملازم رکھ لیا۔

بس کے اجرا کا مژدہ جاں فزا خبر بن کر دور و نزدیک کے دیہاتوں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔ ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مسافروں کی وہ بھرمار ہوئی کہ صبح کو جب بس چلتی، اس میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہتی اور کئی ایک کو چھت پر بٹھانا پڑتا۔ چند برس بس مزے مزے سے چلتی رہی۔ اگر اس میں کوئی خرابی پیدا ہوتی، عموماً خوشی محمد خود ہی اسے درست کر لیتا۔ وہ ایک طرح کا مستری (mechanic) بھی تھا۔ پھر جنگ عظیم دوم شروع ہو گئی۔ ہندوستان اپنی ضروریات پورا کرنے کے لیے اس زمانے میں بھی تیل کی بیشتر مقدار ممالک غیر سے درآمد کرتا تھا۔ جنگ کی وجہ سے تیل کی درآمد غیر یقینی ہو گئی اور جو آتا بھی تھا، وہ

زیادہ تر فوجی مقاصد کی بھینٹ چڑھ جاتا تھا۔ بازار میں تیل کبھی ملتا، کبھی نہ ملتا۔ بسوں اور ٹرکوں کا مستقبل تاریک ہونے لگا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ پتا نہیں یہ ذہین خیال کس کے ذہن میں آیا کہ ریلوے کی طرح ان سواریوں کو بھی کوکلے سے چلایا جا سکتا ہے۔ اس زمانے میں سارے ہندوستان کی ریل گاڑیاں دخانی انجنوں سے چلتی تھیں۔ گاڑی کے انجن سے ملحق ایک خانہ ہوتا تھا جسے انگریزی میں tender کہا جاتا ہے۔ اس میں کوئلہ جلایا جاتا تھا۔ ریلوے کے چند ملازمین ملحق ڈبے سے اس میں مسلسل کوئلہ ڈالتے رہتے تھے۔ یہ کوئلہ صوبہ بہار کی کانوں سے لایا جاتا تھا اور بہت اعلیٰ کوالٹی کا ہوتا تھا۔ تیل کی تقریباً عدم دستیابی سے پیدا ہونے والے خلا کو پر کرنے کے لیے بسوں اور ٹرکوں کے پیچھے ایک اسطوانہ نما سلنڈر لگایا گیا جو بس یا ٹرک کی تقریباً چھت تک پہنچتا تھا۔ اس میں کوئلہ بھرا اور جلایا جاتا۔ جب کوئلہ اچھی طرح دہکنے لگتا، اس میں پیدا ہونے والی بھاپ (steam) کو آہنی پائپ کے ذریعے انجن تک پہنچایا جاتا اور بس شاں شاں کرتی اپنے سفر پر روانہ ہو جاتی۔ میں جب 1945 میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں داخل ہوا، تو میں نے برانڈرتھ روڈ اور سرکلر روڈ کے سنگم پر واقع کراؤن (Crown) بس سروس کے اڈے پر بھی اسی قسم کی بسیں دیکھی تھیں۔ گویا جنگ کی باقیات ابھی موجود تھیں۔

لیکن یہ بری بھلی بس بھی ہمیں راس نہ آئی۔ جنگ نے ہر چیز اتھل پتھل کر دی تھی۔ فوجی ضروریات تھیں کہ شیطان کی آنت کی طرح بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ فوجیوں، ان کے ہتھیاروں، وردیوں اور اشیائے خوراک کو مختلف مقامات پر پہنچانے کے لیے باربرداری کی گاڑیوں کی سخت قلت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ حکومت کے حکم پر یا پھر اپنی منشا سے بسوں والوں نے بھی اپنی بسیں ٹرکوں میں تبدیل کرا لیں اور نسبتاً زیادہ منفعت بخش کاروبار میں شریک ہو گئے۔ خوشی محمد نے بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا چاہے۔ اس نے اپنی بس کو ٹرک بنا لیا۔ اس کے بعد قیام پاکستان تک کسی بس نے ادھر کا رخ نہ کیا اور ہم لوگ دوبارہ اپنی ''آنے والی تھاں'' پر پہنچ گئے۔

جس زمانے میں میں سکول کا طالب علم تھا، درسی کتابیں لکھوانے اور چھپوانے کے لیے کوئی سرکاری ٹیکسٹ بورڈ موجود نہیں تھا۔ یہ فوجی ڈکٹیٹر ایوب خاں کی حکومت کی اختراع ہے اور اس نے درسی کتابوں کا جو حشر کیا ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔ ان کتابوں کی طباعت، مواد وغیرہ انتہائی گھٹیا ہوتا ہے اور ان میں تاریخ وغیرہ کی تشریح من مانے انداز سے کی جاتی ہے جس سے طالب علموں کے اذہان میں تنگ نظری اور تعصب کا زہر بھرا جاتا ہے۔ ایوب حکومت کا اصل مقصد حکومت مخالف آواز کو دبانا تھا۔ یونیورسٹی آرڈیننس کے ذریعے یونیورسٹیوں کا گلا گھونٹ دیا گیا اور وائس چانسلروں کو محکمہ تعلیم کے کسی نیم جاہل کلرک کا ماتحت بنا

دیا گیا۔] ہمارے زمانۂ تعلیم کے دوران میں دوسری سے آٹھویں جماعت کے تمام مضامین (بشمول اردو) لاہور کے چار پانچ نجی پبلشرز چھاپتے تھے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ کتابیں اچھے سے اچھے اور تجربہ کار اساتذہ سے لکھوائی جائیں اور انھیں خوبصورت سے خوبصورت انداز میں چھاپا جائے کیونکہ انھیں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا اور انجام کار محکمۂ تعلیم سے منظوری حاصل کرنا ہوتی تھی۔ ہمارے سکول میں دوسری جماعت سے آٹھویں جماعت تک جو اردو کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، وہ مولوی ممتاز علی [امتیاز علی تاج کے والد گرامی اور پنجاب میں تعلیم نسواں کے بانی] کے ادارے دارالاشاعت پنجاب کی شائع کردہ ہوتی تھیں۔ راقم الحروف میں اردو سمجھنے، بولنے یا لکھنے کی جو بری بھلی استطاعت ہے، وہ بنیادی طور پر انھیں کتابوں کی مرہون منت ہے۔

جب ہم دوسری جماعت میں پہنچے، ہمیں اردو کی کتاب کے ساتھ ایک نئی چیز — سلیٹ — اور تیسری جماعت میں ضلع جالندھر کے جغرافیہ کی ایک مبین کتاب خریدنا پڑی۔ ہمارے بستے کی اوقات بس یہی کچھ ہوتی تھی۔ تختی ہمارے پاس پہلے ہی موجود تھی۔ چوتھی جماعت تک لکھائی اور املا کی مشق تختی پر ہوتی رہی، البتہ سلیٹ آٹھویں جماعت تک رفیق رہی اور حساب کے سوال اسی پر حل ہوتے رہے۔



## 3

میں ابھی تیسری جماعت میں تھا کہ 1936-37 کا الیکشن آ پہنچا۔

یوں تو انگریزوں نے 1909 کی مورلی (Morley)، منٹو (Minto) اور 1919 کی مونٹیگو (Montgue)، چیمسفورڈ (Chelmsford) اصلاحات کے تحت ہندوستانیوں کی اشک شوئی کے لیے مرکزی اور صوبائی کونسلیں قائم کر دی تھیں مگر اصل اختیارات پھر بھی گورنر جنرل اور صوبائی گورنروں کے ہاتھ میں تھے۔ مرکزی کونسل کے چند ارکان ووٹروں کی ایک محدود تعداد منتخب کرتی تھی لیکن اکثریت حکومت کی نامزد ہوتی تھی، تاہم صوبائی کونسلوں کے ارکان کی تعداد نامزد ارکان سے زیادہ کر دی گئی تھی۔ مرکز میں گورنر جنرل[1] کی مدد کے

---

1- ہمارے ہاں وائسرائے اور گورنر جنرل کے عہدوں کو آپس میں گڈمڈ کر دیا جاتا ہے۔ وائسرائے خواہ گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنے اختیارات استعمال کر رہا ہو، اسے عموماً وائسرائے ہی کہا جاتا ہے۔ وائسرائے کا مطلب "بادشاہ (یا ملکہ) کا نائب" ہے۔ یہ محض نمائشی عہدہ تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہونے پر ملکہ وکٹوریا کو خوش کرنے (آخر وہ Empress of India بھی تھی) اور ہندوستانیوں پر رعب جمانے کے لیے گھڑا گیا تھا۔ اصل اختیارات گورنر جنرل کی حیثیت سے استعمال ہوتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان اور بھارت دونوں ملکوں کے سربراہان مملکت کو گورنر جنرل کا نام دیا گیا۔ پنجابی میں وائسرائے کو وڈا لاٹ صاحب، گورنر کو لاٹ صاحب اور چیف سیکرٹری کو چھوٹا لاٹ صاحب کہا جاتا تھا۔

لیے چند ارکان پر مشتمل ایک کونسل قائم کر دی گئی تھی جسے عرفِ عام میں Viceroy's Council کہا جاتا تھا۔ ان ارکان کا مرتبہ وزیر کے برابر سمجھا گیا۔ صوبوں میں گورنروں کی مدد کے لیے جو لوگ نامزد ہوتے تھے، انھیں وزیر کا "با وقار" نام دیا گیا تھا۔ وائسرائے کی کونسل کے ارکان اور صوبائی وزرا میں دیسی لوگ بھی ہوتے تھے اور انگریز بھی۔ دفاع اور امورِ خارجہ کے محکمے تو براہِ راست وائسرائے کی تحویل میں ہوتے تھے مگر خزانے، امورِ داخلہ جیسے محکموں کی نگرانی کے لیے مرکز اور صوبوں میں عموماً انگریز ہی متعین ہوتے تھے، ہندوستانیوں کو ان کے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیا جاتا تھا۔

ہندوستانیوں کے لیے یہ صورتِ حال قطعاً قابلِ قبول نہیں تھی اور آزادی کے حصول کے لیے متعدد پُرامن اور پُرتشدد تحریکیں چل رہی تھیں۔ حالات کو بھانپتے ہوئے برطانوی حکومت نے 1928 میں سر جون سائمن (Simon) کی سربراہی میں ایک سہ رکنی کمشن ہندوستان بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ویسے بھی 1919 کی آئینی اصلاحات کے قانون کے تحت 1929 میں مزید آئینی اصلاحات نافذ کرنا آئینی فریضہ بن چکا تھا۔ سائمن کمشن کے ارکان نے ملک کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا، مختلف الخیال سیاسی رہنماؤں اور سرکردہ شہریوں سے ملاقاتیں کیں اور 1930 میں اپنی رپورٹ پیش کر دی۔

سائمن کمشن کی سفارشات کا جائزہ لینے کے لیے 1930، 1931 اور 1932 میں ہندوستانی رہنماؤں اور برطانوی حکومت کے نمائندوں کے مابین تین گول میز کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ ان کانفرنسوں میں متعدد امور پر اتفاق ہو گیا مگر بڑی وجہِ نزاع جداگانہ طرزِ انتخاب بنا۔ مسلمان اس نظام کو جاری رکھنے کے حق میں تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح ان کے حقوق کا بہتر انداز سے تحفظ ہو سکے گا مگر مہاتما گاندھی اور دیگر کانگریسی رہنما اس کے شدید مخالف تھے۔ بالآخر لیبر وزیرِاعظم ریمزے میکڈونلڈ (Ramsay MacDonald) نے جداگانہ طرزِ انتخاب کے حق میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے اور مزید آئینی اصلاحات نافذ کرنے کے لیے وکٹر الیگزانڈر جون ہوپ (Victor Alexander John Hope)، سیکنڈ مارکوئیس آف لن لتھگو (2nd Marquess of Linlithgow) کی، جو لارڈ لن لتھگو کے نام سے زیادہ معروف ہیں، سربراہی میں برطانوی پارلیمنٹ کی سولہ رکنی کمیٹی قائم کر دی گئی۔ کمیٹی نے ڈیڑھ سال بعد 5 فروری 1935 کو مسودہ قانون (bill) پیش کر دیا۔ مسودہ قانون پر دارالعوام میں 43 دن اور دارالامرا میں 13 دن بحث ہوتی رہی۔ جب مسودہ قانون منظور ہوا تو یہ برطانوی پارلیمنٹ کا منظور کردہ طویل ترین قانون کہلایا۔ جب بادشاہ نے اس پر دستخط کر دیے تو اسے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کا نام دیا گیا۔ یہ ایک طرح کا آئین تھا جو ہندوستان پر ہندوستانیوں کی مرضی کے خلاف ٹھونسا گیا تھا مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ جو چیز 1935 میں

ناقابل قبول تھی، وہی آزادی کے بعد قابل قبول بن گئی اور بھارت اور پاکستان دونوں ہی نے اپنے اپنے نئے آئین بنانے تک اسے حرزِ جان بنائے رکھا۔

اس ایکٹ (قانون) کے تحت جداگانہ طرزِ انتخاب برقرار رکھا گیا، سندھ کو بمبئی پریذیڈنسی اور اڑیسہ کو بہار سے علیحدہ کر کے نئے صوبے بنائے گئے۔ برما اور عدن کو ہندوستان سے الگ کر دیا گیا۔ صوبوں کو نام نہاد "خود مختاری" دی گئی۔ دو عملی (diarchical) نظام ختم کر دیا گیا یعنی جو محکمے براہ راست گورنروں کی تحویل میں تھے، وہ بھی دیسی وزراء کو سونپ دیے گئے۔ پہلے قانون ساز ادارے لیجسلیٹو کونسلیں[1] کہلاتے تھے، اب انھیں لیجسلیٹو (legislative) اسمبلیوں کا نام بخش دیا گیا اور ان کے ارکان ایم ایل اے کہلانے لگے۔ صوبوں میں premier کا عہدہ بھی قائم کیا گیا جس کا ترجمہ اس زمانے کے اخباروں میں من مانے انداز یا لاعلمی کے باعث سے وزیر اعظم کر دیا گیا۔ [اصلاً یہ لفظ آسٹریلیا کی ریاستوں اور کینیڈا کے صوبوں کے وزراء اعلیٰ[2] کے لیے وضع کیا گیا تھا تاکہ ان کے عہدوں کو ملک کے وزیر اعظم (prime minister) کے عہدے سے خلط ملط نہ کیا جا سکے۔] مرکز میں البتہ دو عملی نظام برقرار رکھا گیا جس کے تحت دفاع اور خارجہ امور کے محکمے براہ راست وائسرائے کے ماتحت کر دیے گئے۔ مرکز میں وفاقی نظام کے قیام کی گنجائش رکھی گئی جس میں دیسی ریاستوں کو بھی شامل کیا جاتا تھا مگر نوابوں، راجوں، مہاراجوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور یوں وفاقی حکومت قائم نہ ہو سکی۔ مرکز میں فیڈرل کورٹ اور ریزرو بینک آف انڈیا کا قیام عمل میں آیا۔

---

1- بھارت میں صوبائی اسمبلیاں اب بھی لیجسلیٹو اسمبلیاں کہلاتی ہیں مگر پاکستان میں 1973 میں انھیں صوبائی (Provincial) اسمبلیوں کا نام دے دیا گیا۔ راقم الحروف کے خیال میں یہ کچھ اچھا نہیں ہوا، قومی اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کے ارکان کا اصل کام تو قانون سازی ہے مگر وہ اکثر گلیوں کی نالیاں اور سڑکوں کی تعمیر اور ان پر اپنے ناموں کی تختیاں لگوانے، پرمٹ حاصل کرنے، اپنے چہیتوں کو نوکریاں دلانے جیسے کاموں میں مصروف رہتے ہیں اور اپنے اصل فرائض بھول گئے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں جن قوانین کو منظور کرنے میں مہینوں لگ جاتے ہیں، ہماری یہ اسمبلیاں ایسے دس قوانین دس منٹوں میں پاس کر دیتی ہیں اور قوانین بھی وہ جن میں عام لوگوں کی بھلائی نہیں بلکہ حکمران طبقے اور جماعت کے مفادات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ ستم بالائے ستم ان لوگوں نے بجٹ پر بحث کو بھی کھیل تماشے کی چیز بنا دیا ہے۔

2- یہ کہ یہ لفظ کینیڈا میں "وزیر اعلیٰ" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، اس کی تصدیق وہاں کے اخبار "Vancouver Sun" کی اس خبر سے ہو جاتی ہے:

"What remains unanswered is the role played by Gujrat chief minister, the equivatent of premier, Narendar Modi."

(بحوالہ "پاکستان ٹوڈے" یکم ستمبر 2012)

یوں کہئے کو کم از کم صوبائی سطح پر بیشتر اختیارات اسمبلیوں اور وزارتوں کو منتقل ہو گئے مگر حقیقتاً مرکز پر وائسرائے اور صوبوں پر گورنروں کی گرفت اسی طرح مضبوط رہی جیسے پہلے تھی۔ وائسرائے کو دفاع، امور خارجہ، خزانے اور انتظامیہ پر کلی اختیار حاصل تھا۔ وہ ہر قانون کو ویٹو کر سکتا تھا، صوبائی حکومتوں کو برطرف کر سکتا تھا اور اس کی مرضی کے بغیر کوئی فنانس بل مرکزی اسمبلی میں پیش نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی طرح گورنروں کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انھیں شقوں کا سہارا لے کر اس وقت کے گورنر جنرل نے پہلے صوبہ سرحد (موجودہ پختون خواہ) اور پھر سندھ میں صوبائی حکومتیں برطرف کیں اور یوں ملک میں آمرانہ رویے کی بنیاد رکھ دی۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت صوبائی اسمبلیوں کی نشستوں کی تقسیم میں پنجاب کے مسلمانوں کے ساتھ دھراؤ ہو گیا۔ 1931 کی مردم شماری کے مطابق مسلمانوں کی آبادی 55% تھی۔ (پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ کے جغرافیہ کے سابق پروفیسر گوپال کرشن نے اپنے مقالے Demography of the Punjab : 1849 to 1947 میں بتایا ہے کہ 1941 کی مردم شماری کے مطابق پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی 53.2، ہندوؤں کی 29.1، سکھوں کی 14.9 اور عیسائیوں کی 1.9 فیصد تھی جب کہ باقی کا تعلق دیگر مذاہب سے تھا۔) آپ کوئی بھی اعداد و شمار لے لیں، صوبائی اسمبلی میں مسلمانوں کو آدھی سے زیادہ نشستیں ملنا چاہیے تھیں مگر انھیں 48% پر ٹرخا دیا گیا اور سکھوں کو ان کی آبادی سے کہیں زیادہ 18% نشستیں دی گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ سکھوں پر اس کرم فرمائی کی وجہ یہ تھی کہ انگریز انھیں ہر قیمت پر خوش کرنا چاہتے تھے کیونکہ سکھوں نے 1857 کی جنگ آزادی میں ان کا ساتھ دیا تھا اور جنگ عظیم اول کے دوران میں آبادی کے اعتبار سے سب سے زیادہ وہی ہندوستانی فوج میں بھرتی ہوئے تھے۔ پھر مسلمانوں نے اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی ماری تھی۔ لکھنؤ پیکٹ کے تحت انھوں نے پنجاب کے مسلمانوں کی نشستیں کم کرنے اور یوپی کے مسلمانوں کی نشستیں بڑھانے پر اتفاق کر لیا تھا۔ اس سے یوپی کے ہندوؤں کو تو کوئی نقصان نہ ہوا اور نہ وہاں کے عام مسلمانوں کا کوئی بھلا ہوا، البتہ وہاں کے چند نام نہاد مسلمان لیڈروں کے ضرور وارے نیارے ہو گئے اور وہ عام مسلمانوں کو سبز باغ دکھا کر یوپی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے مگر آزمائش کی پہلی ہی گھڑی میں انھیں بیچ منجدھار چھوڑ کر پاکستان بھاگ آئے اور نئے سرے سے یہاں اپنی دکانداری شروع کر دی۔

ادھر پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت کھونے پر مسلم لیگ کو 1946 کے انتخابات میں خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اگرچہ وہ ان انتخابات میں سب سے بڑی پارلیمانی پارٹی بن کر ابھری تھی مگر اسمبلیوں میں مجموعی

اکثریت حاصل کرنے میں ناکام رہی اور یونینسٹ پارٹی کے آٹھ ٹوٹ زدوں نے کانگرس اور اکالی دل کے ساتھ مل کر اپنی حکومت بنالی۔ اگر مسلم لیگ مسلمانوں کی اکثریت کے بل پر اپنی حکومت بنانے میں کامیاب ہوجاتی تو شاید سکھ بھی ان کے ساتھ مل جاتے [گیانی کرتار سنگھ کا دھڑا ویسے بھی مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتا کرنے پر تیار تھا] اور پنجاب تقسیم ہونے سے بچ جاتا۔

پنجاب کے جاگیردار ہمیشہ انگریز کی خاسہ بوسی کرتے اور ان سے مراعات حاصل کرتے رہے۔ اپنے طبقے کی پوزیشن مزید بہتر کرنے کے لیے میاں (سر) فضل حسین اور چودھری (سر) چھوٹو رام نے 1923 میں اپنی سیاسی پارٹی قائم کرنے کا عزم صمیم باندھ لیا۔ انھوں نے اس کا نام یونینسٹ (Unionist) پارٹی رکھا۔ پارٹی الیکشنوں میں اپنے امیدوار تو کھڑے نہیں کرتی تھی مگر منتخب ہونے والوں میں سے خاص طور پر جاگیردار ممبروں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہوجاتی تھی۔ سر فضل حسین اور سر چھوٹو رام وزارتوں کے مزے چکھتے رہے۔

پھر ہوا یہ کہ سر فضل حسین کو وائسرائے کونسل کا رکن بنالیا گیا۔ ان کا شمار اپنے زمانے کے قابل ترین اور ذہین ترین مسلمانوں میں ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستانیوں میں ہوتا تھا۔ اپنے حساب سے وہ مسلمانوں کے سچے خیرخواہ تھے۔ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن کی حیثیت سے انھوں نے حکومت ہند سے ایک ریزولیوشن (resolution) منظور کرایا جس کی رو سے کل ہند سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے الگ کوٹے کا تعین ہوا۔ پہلے 33.3 فیصد ملازمتیں ہندوستان کی تمام اقلیتوں کے لیے مخصوص تھیں [مقابلے کے امتحانوں میں کامیابی حاصل کرنے کی صورت میں اگر انھیں کوئی اعلیٰ ملازمت مل جاتی تو وہ اس کوٹے سے علیحدہ ہوتی لیکن اونچی اسامیاں اینگلو انڈین، ہندوستانی عیسائی اور دوسرے لے جاتے تھے] کہ کم از کم 25 فیصد مسلمانوں کو ملیں گی۔[1] یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان جاگیرداروں اور روٴسا کی اولادیں جو مقابلے کے امتحانوں میں کامیاب نہیں ہوسکتی تھیں، آئی سی ایس (ICS) اور دیگر آل انڈیا سروسز میں سفارش پر بھرتی ہونے لگیں اور تقسیم ہند کے بعد پاکستانیوں کی گردنوں پر سوار ہوگئیں۔

1932 میں سر فضل حسین کی صحت خراب ہوگئی۔ انھیں پھیپھڑوں کی کوئی تکلیف لاحق ہوگئی تھی۔ ایس ایم اکرام کا کہنا ہے کہ ایک مرتبہ وہ خودکشی پر غور کرنے لگے تھے۔ ان کا ارادہ اب ریٹائرڈ زندگی بسر کرنے اور اپنا بیشتر وقت نماز روزے میں صرف کرنے کا تھا۔ دریں اثنا اگلا الیکشن سر پر آ گیا تھا اور ان کے دوستوں اور خیرخواہوں نے انھیں ایک بار پھر عملی سیاست میں حصہ لینے پر مجبور کردیا، پھر اقتدار کا اپنا نشہ ہوتا ہے اور وہ

1۔ بحوالہ ایس ایم۔ اکرام۔

زور شور سے یونینسٹ پارٹی کو منضبط کرنے میں مصروف ہو گئے۔

محمد علی جناح ان کی قابلیت، قومی زندگی میں ان کے قد کاٹھ اور مسلمانوں کے لیے ان کی خدمات سے آگاہ تھے۔ انھوں نے انھیں اپنے ساتھ ملانے کے لیے 5 جنوری 1936 کو خط لکھا جس میں انھیں بمبئی میں مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کی دعوت دی گئی تھی۔ سر فضل حسین اس عزت افزائی پر خوش تو بہت ہوے مگر انھوں نے مسلم لیگ کا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کے ہندو اور سکھ ساتھی پہلے ہی ان پر شک کرنے لگے تھے کہ وہ مسلمانوں کی کچھ زیادہ ہی رعایت کرتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے سوچا کہ اگر انھوں نے اپنے آپ کو مسلم لیگ سے وابستہ کر لیا تو ان کے پنجاب کے وزیر اعظم منتخب ہونے کے امکانات ختم ہو جائیں گے۔ لیکن تدبیر کند بندہ، تقدیر زند خندہ، سر فضل حسین اسی سال الیکشن سے پہلے ہی انتقال کر گئے اور سر سکندر حیات پارٹی کے نئے لیڈر منتخب ہو گئے۔

پنجاب اسمبلی کے انتخابات کے سلسلے میں کاغذات نامزدگی نومبر 1936 میں وصول کیے جاتے تھے اور راے شماری دسمبر 1936 اور جنوری 1937 کے مہینوں میں ہونا تھی۔ اس الیکشن سے پہلے پنجاب میں جتنے بھی انتخابات ہوے تھے، ان میں یونینسٹ پارٹی جیتتی آئی تھی۔ اب کے بھی انھیں کسی دوسری پارٹی سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ انھوں نے انتخابات میں بطور پارٹی حصہ نہیں لیا کیونکہ انھیں یقین تھا کہ جیتنے والا خود ہی پارٹی میں شامل ہو جائے گا۔ مورخ ایان ٹالبوٹ (Ian Talbot) کا کہنا ہے کہ یونینسٹوں نے نہ تو کسی جلسے جلوس کا اہتمام کیا اور نہ ووٹروں کو اپنے کسی منشور سے آگاہ کیا۔ انھیں امید تھی ان کے سارے کام سرکاری افسر کر دیں گے۔ ووٹ دینے کا حق صرف ایک محدود تعداد کو حاصل تھا اور یہ ووٹ آسانی سے حاصل کیے جا سکتے تھے۔ ایسے میں کسی ideal، کسی vision کا ٹنٹا کیوں پالا جائے اور عوام کی بھلائی کی کیوں فکر کی جائے۔

چونکہ میری عمر بہت چھوٹی تھی، اس لیے مجھے ان باتوں کی قطعاً کوئی سمجھ نہیں تھی مگر ہمارے گھر میں اس الیکشن کی باتیں بہت ہوتی تھیں اور بہت زور شور سے ہوتی تھیں کیونکہ اس نے ہمارے خاندان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

1937 کے صوبائی انتخابات میں ہمارا حلقہ انتخاب تحصیل نکودر پر مشتمل تھا۔ شاید اس حلقے میں تحصیل پھلور کا بھی کچھ حصہ شامل تھا۔ اس حلقے میں بھاری اکثریت ارائیوں کی تھی، اور ہمارا بیت تو تھا ہی ارائیوں کا۔ اس وقت تک اس حلقے سے مہت پور کے رئیس خان اسد اللہ خاں منتخب ہوتے چلے آ رہے تھے۔ وہ پرانے کھلاڑی تھے اور انھیں یونینسٹ پارٹی کی حمایت بھی حاصل تھی۔ ارائیں اس صورت حال پر خوش نہیں تھے

مگر ان کے پاس کوئی موزوں امیدوار نہ تھا جسے وہ موجودہ (sitting) ایم ایل اے کے خلاف کھڑا کر سکتے۔ لے دے کے ایک مولوی پیر محمد تھے لیکن وہ اپنے چھوٹے صاحب زادے کے ناگہانی انتقال سے ذہنی طور پر تقریباً ماؤف ہو چکے اور یوں عضو معطل بن چکے تھے۔ خوش قسمتی سے ان دنوں ان کے بڑے صاحب زادے میاں عبدالرب بی اے، ایل ایل بی کر چکے اور جالندھر میں اپنی وکالت شروع کر چکے تھے۔ ارائیں مولوی پیر محمد کی خدمات بھولے نہیں تھے چنانچہ ان کا ایک وفد میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور انھیں انتخابات میں حصہ لینے پر قائل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میاں صاحب پہلے تو اس بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہتے تھے اور انھوں نے کنی کترانا چاہی مگر جب وفد اپنی تجویز پر اڑا رہا تو وہ مان گئے۔ جب ان کی امیدواری کا اعلان ہوا تو اس کی خبر سارے حلقے میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ میاں صاحب نے نہ کوئی اشتہار چھاپا، نہ کہیں بینر لگوایا، نہ کہیں جلسہ کیا اور نہ کوئی جلوس نکالا۔ محض اپنے والد ماجد کی خدمات اور ارائیوں[1] کی حمایت کے بل بوتے پر انتخاب جیت لیا۔ خان اسد اللہ خاں کی تمام کوششیں اکارت گئیں اور وہ بری طرح ہار گئے۔

1937 کے انتخابات کے زمانے میں پنجاب کے بیشتر علاقوں پر جاگیرداروں اور یونینسٹ پارٹی کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ جن امیدواروں کو اس پارٹی کی پشت پناہی حاصل تھی، ان میں سے متعدد بلا مقابلہ ہی منتخب ہو گئے۔ ان میں جمال خان لغاری، احمد یار دولتانہ، مبارک علی شاہ، رضا شاہ گیلانی، محمد حیات قریشی، فیروز خان نون، چودھری سر ظفر اللہ خاں، چودھری سر شہاب الدین، پیر اکبر علی، عبدالغنی اور بعض دیگر شامل تھے۔ غور فرمائیں کہ با اثر خاندانوں کا یہ قبضہ گروپ تب بھی پنجاب پر حاوی تھا اور آج بھی ان کے اخلاف

---

1۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ انتخابات میں پنجاب کی برادریاں بہت بڑا کردار ادا کرتی رہی ہیں بلکہ بعض علاقوں میں اب تک کر رہی ہیں۔ برادریوں کی عصبیت کس طرح کام کرتی ہے، اس کا ایک تجربہ راقم الحروف کو 1970 کے انتخابات میں ہوا تھا۔ اگرچہ ان انتخابات میں پیپلز پارٹی نے اس عصبیت کو توڑ دیا تھا مگر برادری عصبیت کے اسیر افراد تب بھی اپنی ضد پر اڑے رہے۔ ساہی وال میں ایک شخص رائے مسعود علی خان تھے۔ (انھوں نے راجپوتوں کو بھی تین طبقوں میں بانٹ رکھا تھا۔ رائے، رانا اور راؤ۔ وہ رائے کو راجپوتوں کی اشرافیہ گردانتے تھے، اور راؤ کو سب سے نچلا مقام دیتے تھے۔) وہ میرے رفیق کار اور انتہائی قریبی دوست چودھری غلام مرتضیٰ کے، جو خود بھی راجپوت تھے، شاگرد رہ چکے تھے اور اکثر انھیں ملنے آ جایا کرتے تھے اور یوں میرا بھی ان سے کچھ بھائی چارہ ہو جاتا تھا۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ وہ انتخابات میں کس کی حمایت کر رہے ہیں، جھٹ فرمایا "ساہی وال میں بریگیڈیر (ریٹائرڈ) محمد سعید کی اور چیچہ وطنی میں رانا محمد حنیف کی۔" میں نے عرض کیا "ان دونوں میں تو بُعد کا بیر ہے۔ محمد سعید جماعت اسلامی کے جبکہ رانا حنیف پیپلز پارٹی کے امیدوار ہیں۔" فرمایا "ہوں گے مگر دونوں راجپوت تو ہیں اور میں صرف راجپوتوں کی حمایت کرتا ہوں۔"

ہماری قسمتوں کے مالک بنے ہوئے ہیں۔ ہندوؤں اور سکھوں میں جو لوگ بلا مقابلہ منتخب ہوئے ان میں گوکل چند نارنگ، چودھری سر چھوٹو رام، اجل سنگھ، سمپورن سنگھ، راجہ نریندر ناتھ، جوگندر سنگھ، مکند لال پوری وغیرہ شامل تھے۔ پاکستان کے برعکس بھارت میں ان لوگوں کے اخلاف کس مپرسی کی بھیانک بے بسی کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔

میاں عبدالرب ایم ایل اے منتخب ہونے کے بعد پنجاب اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے لاہور پہنچ گئے۔ نامزد وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں انگشت بدنداں تھے کہ میاں صاحب جیسا غیر معروف شخص بلکہ nonentity پنجاب اسمبلی جیسے جلیل القدر اور عالی مقام (august) ایوان کا رکن کیسے منتخب ہو گیا۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ موصوف خیر سے ارائیں ہیں، انھوں نے جھٹ بیگم جہاں آرا شاہنواز کی ڈیوٹی لگائی کہ پکڑو، خبردار، بھاگنے نہ پائے۔ بات کنگن کو آرسی کیا، بیگم صاحب نے میاں صاحب کو اپنے عالی شان دولت خانے پر چائے پر بلایا، کچھ برادری کے واسطے دیے، کچھ سبز باغ دکھائے اور کچھ ادائیں دلبرانہ دکھائیں۔ سیدھے سادھے میاں صاحب تاب مقاومت نہ لا سکے، بیگم صاحب کے بچھائے ہوئے دام تزویر میں پھنس گئے۔ انھوں نے بیگم صاحب کے دست مبارک پر بیعت کی اور یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ سر سکندر حیات کے من کی مراد پوری ہوئی۔ مسلم لیگ کے صرف دو امیدوار کامیاب ہوئے تھے۔ ان میں ملک برکت علی تو ڈٹے رہے مگر راجہ غضنفر علی، جو اصلاً سر سکندر حیات کے ٹوڈی تھے مگر جو بعد میں بڑی ڈھٹائی سے دعوی کرتے رہے کہ انھیں قائد اعظم نے یونینسٹوں کی جاسوسی کے لیے یونینسٹ پارٹی میں شامل ہونے کی ترغیب دی تھی، یونینسٹ پارٹی میں چلے گئے۔

میاں عبدالرب جب ایک مرتبہ یونینسٹ پارٹی میں شامل ہوئے، پھر آخر تک اس کا ساتھ نبھاتے رہے۔ وہ اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ اسمبلی کے جو انتخابات 1942 میں ہونا تھے[1]، وہ جنگ عظیم دوم کی

---

۱۔ راقم الحروف کے ادھورے علم کے مطابق امریکا غالباً دنیا کا واحد ملک ہے جہاں کبھی انتخابات ملتوی نہیں ہوئے۔ آندھی، طوفان، برف باری وغیرہ تو معمولی باتیں ہیں وہاں تو عین جنگ کے دوران میں بھی انتخابات معمول کے مطابق ہوتے رہے ہیں۔ وہاں صدر سے لے کر مقامی کونسلوں کے انتخابات ہر لیپ سال کے نومبر کی دو سے آٹھ تاریخوں میں آنے والے منگل کو ہوتے ہیں، کوئی ضمنی الیکشن نہیں ہوتا۔ کانگرس کا کوئی رکن فوت ہو جائے تو گورنر باقی مدت کے لیے نیا رکن نامزد کر دیتا ہے۔ امریکا کا پہلا الیکشن نومبر 1788 کو ہوا تھا جب برصغیر میں کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ انتخابات کیا چیز ہوتے ہیں اور انقلاب فرانس میں ابھی دو سال باقی تھے۔ جون 1812 سے 1815 تک امریکیوں کی انگریزوں سے دوسری جنگ ہوئی، ابراہام لنکن کے زمانہ صدارت میں 1861 سے 1865 تک خانہ جنگی ہوئی۔ بیسویں صدی میں انھوں نے دو عالمی جنگیں بھگتیں مگر الیکشن ہمیشہ اپنے وقت پر ہوئے، ایک دن کے لیے بھی ملتوی نہیں ہوئے۔ اور ایک ہم ہیں کہ معمولی باتوں کو بہانہ بنا کر الیکشن ٹالتے رہتے ہیں۔

وجہ سے 1946 تک نہ ہو سکے۔ میاں صاحب سمجھ دار آدمی تھے، وہ ہوا کا رخ پہچان گئے اور انھوں نے وزیر اعظم سر خضر حیات ٹوانہ کے مشورے پر سرکاری نوکری قبول کر لی۔ وہ سیونگز ڈیپارٹمنٹ پنجاب کے ڈائریکٹر مقرر ہو گئے اور ریٹائرمنٹ تک اسی عہدے پر کام کرتے رہے۔

قیام پاکستان کے بعد انھیں اپنے جلیل القدر باپ کے مکان کے عوض وارث روڈ لاہور پر ایک کوٹھی الاٹ ہو گئی۔ اپنی بی اے اور ایم اے کی تعلیم کے دوران میں راقم الحروف بھی وہاں مقیم رہا۔ میاں صاحب سے ملنے بڑے بڑے لوگ آیا کرتے تھے۔ ان میں دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک تو میانوالی کے ایک ایم ایل اے تھے، غالباً کوئی روکڑی تھے۔ وہ اپنے پندرہ بیس نوکروں کے لاؤ لشکر سمیت آتے تھے اور کئی کئی دن قیام کرتے تھے، خرچ غالباً اپنا کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھار میرے کمرے میں بھی آ جاتے تھے۔ میری میز پر مولوی عبدالحق کی انگلش اردو ڈکشنری پڑی رہتی تھی۔ ایک روز ان کی نگاہ اس پر پڑ گئی، اس کے صفحات الٹنے پلٹنے لگے اور مانگ کر لے گئے۔ انھوں نے کبھی یہ لغت واپس نہ کی۔

اکثر ملنے والوں میں چودھری علی محمد خادم بھی شامل تھے۔ وہ بے حد شریف النفس اور نفیس آدمی تھے۔ جب پروفیسر محمد سرور (جامعی) امروز سے مستعفی ہوئے، انھوں نے میاں محمد شفیع (م ش) کے تعاون سے ہفت روزہ آفاق نکالا۔ خادم صاحب بھی اس کے عملۂ ادارت کے رکن تھے۔ شاید مالی تعاون بھی کرتے ہوں گے۔ خادم صاحب بعد میں 1970 کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کی ٹکٹ پر لائل پور کی ایک نشست پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ میں بی اے کی تعلیم کے دوران میں ہی لاہور کے بعض اردو اخبارات میں بطور سب ایڈیٹر کام کر چکا تھا، سرور صاحب کو اس کا علم تھا۔ انھوں نے ازرہِ شفقت مجھے اپنے اس رسالے میں بطور نائب مدیر ملازم رکھ لیا۔

میاں عبدالرب کا ایک بیٹا اور چار بیٹیاں تھیں۔ بیٹا عبدالمالک ایم اے کرنے کے بعد انگلستان چلا گیا۔ یارک شائر کے شہر ہیلی فیکس[1] (Halifax) میں پڑھاتا رہا۔ اسے اپنے انتقال تک مقامی مسلم کمیونٹی میں اہم مقام حاصل رہا۔ اس کے بیٹے نے مقابلے کا امتحان دیا اور وہ اب برطانوی سول سروس میں کسی خاصے بڑے عہدے پر کام کر رہا ہے۔ میاں صاحب کی ایک بیٹی کی میرے سب سے چھوٹے بھائی سے شادی ہوئی۔ وہ اور اس کی سب سے چھوٹی بہن بھی انگلستان میں ہی رہتی ہیں۔

---

1۔ ہیلی فیکس کے قریب ہی ایک چھوٹا سا گاؤں Southowram ہے۔ انیسویں صدی کی نامور شاعرہ اور ناول نگار ایملی برونٹی وہاں Law Hill House میں کچھ عرصہ پڑھاتی رہی تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اپنے عظیم ناول Wuthering Heights کی تخلیقی تحریک (inspiration) اسے یہیں سے ملی تھی۔

# 4

الیکشن گزر گیا۔ اپریل آ گیا۔ میں اور عبدالعزیز چوتھی جماعت میں پہنچ گئے۔ یہ تو ہمیں پہلے ہی معلوم تھا کہ اب ہمیں منشی علی محمد ہی پڑھائیں گے۔

منشی علی محمد قریبی گاؤں دانے وال کے رہنے والے تھے۔ وہ تھے تو بہت محنتی اور قابل استاد لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی شہرت نہایت سخت گیر استاد کی بھی تھی۔ انھیں جس طالب علم کو سزا دینا ہوتی، اسے اپنی میز پر الٹا لٹا لیتے اور اس کی پیٹھ پر تابڑ توڑ ڈنڈے برسانا شروع کر دیتے۔ [شکر ہے کہ مجھے اور عزیز کو کبھی اس سزا کو بھگتنا نہ پڑا۔] وہ ٹیچر ہی نہیں تھے بلکہ برانچ پوسٹ ماسٹر بھی تھے۔ دیہاتوں میں بڑے ڈاک خانے نہیں ہوتے، چھوٹے ڈاک خانے جنھیں برانچ پوسٹ آفس کہا جاتا ہے، ہوتے ہیں۔ ان کا کام مقامی ڈاک کو سب پوسٹ آفس بھیجنا اور وہاں سے موصولہ ڈاک مکتوب الیہان تک پہنچانا ہوتا ہے۔ اس کام کے لیے ہمہ وقتی ملازم نہیں رکھا جا سکتا۔ چنانچہ محکمۂ ڈاک خانہ عموماً کسی سکول ٹیچر کو جز وقتی ملازم رکھ لیتا ہے۔ اسے برانچ پوسٹ ماسٹر کہا جاتا ہے اور اسے ایک معمولی رقم بطور معاوضہ پیش کر دی جاتی ہے۔ جس وقت کی میں بات کر رہا ہوں، اس وقت یہ رقم دس روپے فی ماہ ہوتی تھی۔ جس سکول ٹیچر کی اپنی تنخواہ بیس روپے ماہوار ہوتی تھی، اس کے لیے یہ رقم خاصی بڑی ہوتی تھی۔ چنانچہ جس استاد کو یہ اضافی ذمے داری ملتی تھی، وہ اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتا تھا۔

چونکہ منشی علی محمد کو صبح سویرے ڈاک بھیجنا ہوتی تھی، وہ طلوعِ آفتاب کے قریب سکول پہنچ جاتے تھے۔ اس طرح ہمارا سکول بھی طلوعِ آفتاب کے ساتھ شروع ہو جاتا تھا اور غروبِ آفتاب کے وقت ختم ہوتا تھا۔ بیچ میں صرف دوپہر کے کھانے کی چھٹی ملتی تھی۔ ہمیں وہ کوئی حساب کا سوال حل کرنے پر لگا دیتے تھے اور خود ڈاک کی تھیلی تیار کرنے میں مصروف ہو جاتے۔ وہ ڈاک کے لال ڈبے سے خطوط نکالتے، ان پر مہریں لگاتے اور ڈاک زرد تھیلے میں ڈال دیتے۔ اس تھیلے کے اندر ایک چھوٹی تھیلی بھی ہوتی تھی۔ اس میں موصول ہونے والے منی آرڈروں کی رقوم، مقامی ضروریات پورا کرنے کے لیے ٹکٹیں، لفافے، پوسٹ کارڈ اور ایروگرام آتے تھے۔ اس پر سرخ لاکھ کی مہر لگی ہوتی تھی۔ برانچ پوسٹ ماسٹر کو ایک فارم پر بتانا ہوتا تھا کہ وہ کتنے لفافے، پوسٹ کارڈ وغیرہ بھیج رہے اور کتنی ٹکٹوں، لفافوں وغیرہ کا آرڈر دے رہے ہیں۔ وہ تمام ڈاک، فارم اور چھوٹی تھیلی بڑے تھیلے میں بند کرتے اور اس پر سیاہ لاکھ کی مہر لگا دیتے۔

اسی قسم کا ایک تھیلا وہاں کا ہرکارہ دانے وال سے لاتا اور ہمارے گاؤں کے ہرکارے کے حوالے کر

دیتا۔ قصبوں اور شہروں میں ڈاکیا گھر گھر ڈاک تقسیم کرتا ہے، مگر گاؤں کا ہرکارہ یہ کام نہیں کرتا۔ یہ فریضہ ہم طلبا کا تھا کہ رضاکارانہ لوگوں کے خطوط وغیرہ ان کے گھروں میں پہنچائیں اور اگر کسی کا منی آرڈر آیا ہے تو اسے اطلاع دیں کہ اس کا منی آرڈر آیا ہے، وہ ڈاک خانے آئے اور اسے وصول کر لے۔ ہم یہ کام شوق سے کرتے تھے، آخر اس میں ہمارا کون سا زور صرف ہوتا تھا۔

ہمارے گاؤں کے ہرکارے کا نام محکم دین تھا لیکن لوگ اسے موبکی کہتے تھے۔ جب میں سکول میں داخل ہوا تب بھی موبکی ہرکارہ تھا اور جب پاکستان بنا تب بھی موبکی ہی ہرکارہ تھا۔

درمیانی قامت کے موبکی کا رنگ گندمی تھا۔ وہ بہت مظبوط جسم کا مالک تھا۔ آندھی چل رہی ہو، زور کی بارش ہو رہی ہو یا قیامت کی گرمی پڑ رہی ہو، منشی علی محمد اور موبکی ہرکارے کو بہر طور اپنی ڈیوٹی بھگتانا ہوتی تھی۔ موبکی مقررہ وقت پر آتا، دونوں تھیلے اٹھاتا اور پیدل اپنے سفر پر چل پڑتا۔ سب پوسٹ آفس چار کوس دور شاہکوٹ میں تھا۔ موبکی سیدھے راستے پر نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اسے ایک اور گاؤں چک کا تھیلا بھی لینا ہوتا تھا اور یوں اسے آدھ کوس کا اضافی چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ دن خواہ گرمیوں کے لمبے ہوں یا سردیوں کے چھوٹے، وہ واپس غروب آفتاب سے ذرا ہی پہلے آتا تھا۔ ہم چوتھی جماعت کے طلبا بڑے اشتیاق سے اس کا انتظار کر رہے ہوتے تھے۔ منشی صاحب تھیلا کھولتے، ڈاک نکالتے، خطوں وغیرہ پر مہریں ثبت کرتے اور تقسیم کے لیے ہمارے سپرد کر دیتے۔

انگریز کے زمانے میں ڈاک کا نظام اتنا پکا اور عمدہ تھا کہ خط کے کبھی لیٹ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ شہروں میں تو ڈاک تقسیم بھی دن میں دو مرتبہ ہوتی تھی۔ میں جب 1946 میں اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوا، جب بھی کوئی خط لکھتا، وہ دوسرے ہی دن میرے گھر والوں کو مل جاتا۔ یہی حال لاہور کے اخبارات کا تھا۔ لاہور سے ڈاک بذریعہ ریل گاڑی جالندھر پہنچتی، وہاں سے دوسری گاڑی پر پہلے نکودر اور پھر شاہکوٹ آ جاتی۔ دیہاتوں کے ہرکارے آتے، اپنے اپنے تھیلے اٹھاتے اور اپنی اپنی منزل مقصود کی طرف چل پڑتے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی یہ نظام بخوبی چلتا رہا۔ پھر "مقتل کل" ایوب خان کا زمانہ آیا، بیوروکریسی کی بن آئی، شہروں میں ڈاک دن میں ایک مرتبہ تقسیم ہونے لگی اور دیہاتوں میں خطوط وغیرہ آٹھ آٹھ دن بعد ملنے لگے۔

انگریز کے زمانے میں محکمہ ڈاک بہت کائیاں، سیانا اور حساب کا پکا ہوتا تھا۔ جب کسی گاؤں میں ڈاک خانہ کھلتا تو ہر روز جائزہ لیا جاتا کہ یہ economical ہے بھی یا نہیں یعنی محکمے کو وارا کھاتا بھی ہے یا نہیں، محکمہ کہیں نقصان میں تو نہیں جا رہا۔ اس مقصد کے لیے ہر برانچ پوسٹ ماسٹر کو باقاعدگی سے روزانہ

حساب رکھنا پڑتا کہ اسے کتنے لفافے، پوسٹ کارڈ، منی آرڈر وغیرہ وصول ہوئے ہیں۔ جانے والی ڈاک اس میں شامل نہیں ہوتی تھی کیونکہ ڈاک کے ڈبے میں کوئی راہ چلتا مسافر بھی خط ڈال سکتا تھا اور یہ کوئی مستقل آمدنی تو نہ ہوئی۔ ہر مہینے محکمہ ڈاک کا انسپکٹر آتا، حساب چیک کرتا، سب پوسٹ میں جو ریکارڈ جاتا تھا، اس سے موازنہ کرتا۔ ہیرا پھیری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

منشی علی محمد جب ڈاک ارسال کر چکے ہوتے، وہ پچھلے کمرے سے، جس میں ڈاک خانہ تھا، ہمارے کمرے میں آ جاتے، چاک پکڑتے اور تختہ سیاہ پر لکھ کر یا تو کوئی نیا کلیہ سمجھاتے یا اس کلیے کی ذیل میں آنے والے سوال حل کر کے سمجھاتے۔ جب انھیں اندازہ ہو جاتا کہ ہم خود سوال حل کرنے کے قابل ہو گئے ہیں، وہ تختہ سیاہ پر نیا سوال لکھتے اور ہمیں اپنی اپنی سلیٹوں پر حل کرنے کا حکم دے دیتے۔

ہمارے سکول میں پہلی سے آٹھویں جماعت تک منشی صاحب کی کرسی اور میز کے ماسوا اور کوئی فرنیچر نہیں ہوتا تھا۔ ہم سب تپڑوں (ٹاٹوں) پر بیٹھتے، اپنی اپنی سلیٹیں اپنے گوڈوں (گھٹنوں) پر رکھتے اور سوال حل کرنے لگتے۔ جو لڑکا سوال کر لیتا، وہ منشی صاحب کے پاس جاتا، اپنی سلیٹ دکھاتا، اگر جواب صحیح ہوتا تو شاباش ملتی ورنہ اس کا حشر وہی ہوتا جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یہ سلسلہ ساری صبح چلتا رہتا۔

دوپہر کو کھانے کی چھٹی ملتی اور اس کے بعد اردو کی تدریس شروع ہو جاتی۔ منشی صاحب پہلے جملہ پڑھتے، مشکل لفظ کا مطلب بتاتے، پھر پورے جملے کی تشریح کرتے۔ یہ تشریح پنجابی میں ہوتی تھی۔ اردو کی کتاب تو وہی تھی جو اس زمانے میں دارالاشاعت پنجاب نے شائع کی تھی مگر منشی علی محمد نے موجودہ روش کے برعکس ہمیں مسلمانوں کی آمد سے قبل کے زمانے کی تاریخ بھی پڑھائی۔ اس کتاب کا نام قصص ہند حصہ اول تھا۔ دراصل دو حصوں پر مشتمل یہ کتاب انیسویں صدی کے اواخر میں اس وقت کے پنجاب کے ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن (DPI) کرنل ڈبلیو آر ایم ہال رائیڈ (Holroyd) کے ایما پر، جو لکھنؤ اور دہلی کی بجائے لاہور کو اردو کا مرکز بنانا چاہتے تھے اور جن کی دعوت پر مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا محمد حسین آزاد لاہور منتقل ہو گئے تھے، تحریر کی گئی تھی۔ کتاب کا پہلا حصہ پیارے لال آشوب نے اور دوسرا حصہ مولانا محمد حسین آزاد کے زورِ قلم کا نتیجہ تھا۔ مجلس اردو ادب کے مختلف مندوں نے دوسرا حصہ قصص ہند کے نام سے تو چھاپ دیا جیسے اس نام کی صرف ایک ہی کتاب موجود ہو مگر پہلا حصہ، جو قصص ہند حصہ اول کے نام سے چھپتا رہا تھا، بالکل نظر انداز کر دیا۔

مسلمانوں کی آمد سے پہلے کی تاریخ سے ہمارا تعارف اسی کتاب سے ہوا تھا۔ یہ کتاب بڑے سادہ اور دل نشین انداز سے تحریر کی گئی تھی اور دل پہ بڑا اثر کرتی تھی۔ راجہ رام چندر، کوروؤں اور پانڈوؤں،

مہاراج کرشن، مہاتما بدھ، کنشک، چندر گپت موریا، اشوک اور سکندر اعظم وغیرہ کے متعلق چند گنے چنے اسباق اس میں شامل تھے۔ کوئی اور کتاب دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ہم نے اسی کتاب کو بار بار پڑھا تھا۔ اس کی بعض باتیں اور جملے دلوں پر نقش ہو گئے تھے! یہ کہ آریا سوم رس پیتے تھے [یہ سوم رس کیا ہوتا تھا، کبھی سمجھ میں نہ آیا؛ کیا یہ محض پودے کا رس ہوتا تھا یا اس سے بنائی ہوئی کوئی شراب؟ اور یہ پودا ہوتا کہاں تھا؟ البتہ خالد احمد نے مجھے بتایا ہے کہ سوم رس اصلاً بھنگ ہوتی تھی۔] مہاتما بدھ نے فرمایا کہ دنیا دکھوں کا گھر ہے، یا جب سکندر اعظم نے راجہ پورس کو اپنا اسیر بنالیا تو پوچھا "بتا تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟" "جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ سے کرتا ہے۔" جواب ملا۔ اشوک کو ہندوستان کی تاریخ میں امن کا پیامبر بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اب تک ہندوستان کی جو تواریخ لکھی گئی ہیں، وہ سب غیر شودروں کی تصانیف ہیں۔ یہ تو اکثر مصنفین تسلیم کرتے ہیں کہ شودر انتہائی پسماندہ ہی نہیں انتہائی پسا ہوا طبقہ بھی ہے۔ اس کی تاریخ میں کبھی شنوائی نہیں ہوئی۔ تعلیم حاصل کرنا تو بہت دور کی بات ہے انھیں تو سنسکرت کے اشلوک سننے کی بھی ممانعت تھی اور یہ پیارے لال آشوب نے بھی مانا ہے کہ جو شودر نادانستہ بھی یہ اشلوک سن لیتا تھا، اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا تھا۔ اب بھارت کے ایک مصنف پروفیسر اتھایا نائیڈو (Uthaya Naidu) نے اپنی کتاب The Bible of Aryan Invasions: 1500 BC-1000AD میں شودروں کا نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔ تقریباً 80 صفحے کی یہ کتاب 1999 میں "شودرستان بکس" جبل پور نے شائع کی تھی مگر بھارتی حکومت نے شائع ہوتے ہی اس پر پابندی لگادی تھی کیونکہ اس کے خیال میں اس سے قومی یک جہتی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ 2005 میں اسے ویب سائٹ پر منتقل کیا گیا مگر حکومت نے اس ویب سائٹ کو بھی بند کر دیا۔ البتہ پاکستان میں یہ گوگل کی ویب سائٹ پر پڑھی جا سکتی ہے۔

شودروں کے ساتھ ہندوستان میں جو سلوک ہوتا رہا ہے، اس کتاب میں اس کا شودروں کے نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اشوک کے متعلق یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ جب کالنگا کے قتل عام کے بعد، جس میں ہزاروں شودروں کو بے دردی سے تہ تیغ کیا گیا اور بچے کھچے مردوں، عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر ہندوؤں میں بانٹ دیا گیا، تو اشوک نے توبہ کرلی، بدھ مذہب اختیار کیا اور امن کا پرچارک بن گیا، تو کیا اس نے ان غلاموں کو آزاد کرایا تھا؟ کتاب میں اس کا جواب نفی میں دیا گیا ہے، پھر کہاں کی توبہ، کہاں کا امن کا پرچار؟

پیارے لال آشوب نے اپنی کتاب میں ایک زیادتی یہ کی تھی کہ اس نے آریاؤں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی تہذیب کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا لیکن شاید اس میں اس کا بھی کوئی قصور نہ تھا کیونکہ موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی کھدائی بیسویں صدی میں ہوئی تھی۔ پھر بھی پیارے لال آشوب کی کتاب اس قابل ہے کہ

پاکستان کا کوئی پبلشر اسے دوبارہ چھاپے تاکہ ہماری نئی نسل کو تاریخ کا دوسرا رخ پڑھنے اور سمجھنے کا موقع ملے۔

# 5

1937 کے اواخر یا 1938 کے شروع میں، مجھے صحیح یاد نہیں، سر چھوٹو رام کی ہمارے گاؤں میں آمد کا اعلان ہوا۔ ان کی آمد کا مقصد کیا تھا، مجھے اس وقت اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں تھا۔ یہ سب کچھ کہیں بہت بعد میں معلوم ہوا۔

دراصل ہوا یہ تھا کہ 1999 میں ملکہ وکٹوریا کے ایما پر لارڈ کرزن، جب وہ ابھی چالیس سال کا تھا، ہندوستان کا وائسرائے اور گورنر جنرل مقرر ہوا۔ اس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ:

He was probably the grandest and most self-confident Imperial servant that the British Empire ever possessed.

اس نے گورنر جنرل کی حیثیت سے بعض زبردست کام کیے۔ پٹھانوں کو مطمئن کرنے کے لیے اس نے پنجاب سے الگ کر کے شمال مغربی سرحدی صوبہ (NWFP) بنایا، بنگالی مسلمانوں کی شکایت دور کرنے کے لیے بنگال کو تقسیم کیا اور مشرقی بنگال اور آسام پر مشتمل نیا صوبہ تشکیل دیا] یہ الگ بات ہے کہ مغربی بنگال کے ہندوؤں کو یہ تقسیم راس نہیں آتی تھی۔ انھوں نے اسے کالعدم کرانے کے لیے زبردست تحریک چلا دی اور تشدد کی وارداتیں شروع کر دیں۔ برصغیر کے اولین دہشت گرد بھی یہی لوگ تھے۔ چنانچہ 1911 میں جارج پنجم نے اسے کالعدم قرار دے دیا۔[ ممکن ہے میں غلطی پر ہوں مگر میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ کرزن مسلمانوں کا بڑا خیر خواہ تھا۔ 1919 میں جب وزیر اعظم لائیڈ جارج کی اندرونی کابینہ میں اعلان بالفور کے تحت فلسطین میں یہودیوں کے وطن کے قیام کی تجویز پیش ہوئی، وزیر خارجہ کی حیثیت سے وہ واحد وزیر تھا جس نے اس اعلان کی ڈٹ کر مخالفت کی تھی۔ اس کے عہد میں ہندوستان میں چھ ہزار میل لمبی نئی ریلوے پٹڑیاں تعمیر ہوئیں۔ اگرچہ ہندوستان کا محکمہ آثار قدیمہ 1861 میں قائم ہو چکا تھا مگر اس میں جان کرزن نے ڈالی۔ اس نے تاریخی عمارتوں پر قابض سرکاری دفتروں اور افسروں کو دھکے دے دے کر باہر نکالا، یوں تاج محل اور دیگر سرکاری عمارتوں کا نہ صرف تحفظ ہوا بلکہ صحیح معنوں میں ان کی بحالی کا کام بھی شروع ہوا۔ اس کے اس کارنامے پر خود پنڈت جواہرلال نہرو نے اسے یوں خراج تحسین پیش کیا:

After every other viceroy is forgotten Curzon will be remembered because he restored all that was beautiful in India.

اگر پنجاب کے کسانوں اور زمینداروں کے نقطۂ نظر سے اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے ایک قانون نافذ کیا جسے اردو میں "قانون انتقال اراضی" اور انگریزی میں Punjab Land Alienation Act کہا جاتا ہے۔ اس کی رو سے غیر زراعت پیشہ لوگوں پر زرعی اراضی خریدنے یا اپنے قبضے میں لینے کی ممانعت کردی گئی۔

دراصل اس زمانے کے بڑے زمیندار اور جاگیردار اپنے اللوں تللوں کے لیے اور چھوٹے زمیندار اور کسان اپنی ناک کٹنے سے بچانے کے لیے شادی بیاہ اور تجہیز وتکفین کی رسوم کی پابندی کرنے کی غرض سے سود خور ساہوکاروں اور مہاجنوں سے قرض لیتے رہتے تھے۔ یہ سود خور بڑے ظالم اور سنگ دل لوگ ہوتے تھے۔ یہ قرض خواہ کو جتنی رقم دیتے تھے، اپنے بہی کھاتوں میں اس سے درج کہیں زیادہ کرتے تھے۔ پھر یہ سود مفرد نہیں بلکہ مرکب (compound) ہوتا تھا۔ وہ اس سود کا حساب بھی سالوں کے اعتبار سے نہیں بلکہ دنوں کے اعتبار سے کرتے تھے۔ یوں یہ سود بڑھتے بڑھتے اصل رقم سے کئی گنا زیادہ ہو جاتا تھا۔ جب مقروض پوری طرح ان کے قبضے میں آجاتا، وہ اس سے بیع نامہ لکھوا لیتے اور اس کی زمین قرق کرا دیتے تھے۔

چودھری سر چھوٹو رام ضلع رہتک کے رہنے والے جاٹ تھے۔ ان کا قد چھوٹا، رنگ سیاہی مائل، جسم دبلا پتلا، منہ مہین، ناک نقشہ غیر نمایاں اور بال کھچڑی تھے۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق وہ عام ہندوؤں کی طرح پگڑی باندھتے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی پگڑیاں ململ کی ہوتی تھیں۔ مسلمان زیادہ اور ہندو نسبتاً کم کم پگڑی کو کلف لگا کر اس میں اکڑاہٹ پیدا کرتے، کُلّے کے گرد باندھتے اور اس میں طرّہ نکالتے تھے۔ ہندوؤں کی پگڑیاں زیادہ تر کلف کے بغیر اور ڈھیلی ڈھالی ہوتی تھیں۔ سر چھوٹو رام بھی اسی قسم کی پگڑی باندھتے تھے۔

سر چھوٹو رام نے میاں سر فضل حسین کے ساتھ مل کر 1924 میں یونینسٹ پارٹی قائم کی تھی۔ وہ ہندو ساہوکاروں کے بالخصوص اور کراڑوں کے بالعموم سخت مخالف تھے۔ اس زمانے میں پنجاب کے اکثر جاگیرداروں، بالخصوص مسلمان جاگیرداروں کا بال بال قرضے میں بندھا ہوا تھا۔ اگر یہ قرضے ادا نہ ہوتے تو ان کی بیشتر املاک ہندو ساہوکاروں کے حق میں قرق ہو جاتیں۔ سر چھوٹو رام کرزن کے منظور کردہ قانون انتقال اراضی کے، جس کے تحت غیر زراعت پیشہ افراد پر زرعی زمین خریدنے، دوسروں کی زمینیں قرق کرانے یا زرعی زمین کو اپنے قبضے میں رکھنے کی ممانعت کردی گئی تھی، بڑے زبردست مداح تھے اور اس پر عمل کرانے کے لیے جگہ جگہ کے دورے کرتے رہتے تھے۔ وہ اس زمانے کی ہمارے گاؤں کی

سرکردہ شخصیت چودھری ولی محمد گوہیر کی دعوت پر تشریف لائے تھے۔[ولی محمد گوہیر کو 1946 میں مسلم لیگ کی ٹکٹ مل گئی۔انھوں نے الیکشن لڑا، کامیاب رہے اور پنجاب اسمبلی کے رکن بن گئے۔]

سر چھوٹو رام کی آمد کے اعلان کے بعد کسی نابغۂ روزگار کے زرخیز دماغ میں سودا سمایا کہ ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دوسری باتوں کے علاوہ ایک ڈراما بھی سٹیج کیا جانا چاہیے اور ڈراما تیار کرنے کا قرعۂ فال چوتھی جماعت کے طلبا پر پڑا۔ اب چوتھی جماعت کے ''معصوموں'' کو کیا پتا کہ ڈراما کس بلا کا نام ہوتا ہے۔ بہرحال منشی علی محمد نے ایک روز ہمیں یہ ''خوش خبری'' سنائی اور فرمایا: ''ڈراما میں نے منتخب کرلیا ہے۔تم لوگوں کو صرف اتنا کرنا ہے کہ جس کردار کے لیے جو لڑکا منتخب کیا جائے، وہ اس کے مکالمے اچھی طرح زبانی یاد کرلے۔'' ڈراما کسی بادشاہ کے متعلق تھا جو غالباً کسی بچوں کے رسالے سے لیا گیا تھا۔عبدالعزیز خالد چونکہ سب سے ذہین لڑکا تھا اور اس کا ڈیل ڈول بھی ٹھیک ٹھاک تھا، اس کو بادشاہ کے کردار کے لیے اور گاؤں کی چھوٹی مسجد کے امام کے بھانجے عبدالواحد کو، جو اپنے ماموں کے ساتھ رہتا تھا، ملکہ کے کردار کے لیے منتخب کرلیا گیا۔عبدالواحد اوسط قامت کا قدرے گورا لڑکا تھا اور اس کی ادائیں بھی کچھ کچھ لڑکیوں جیسی تھیں، اس لیے وہ اس کردار کے لیے موزوں نظر آیا۔ایک چھوٹا سا کردار میرے حصے میں بھی آگیا۔ہم سب نے اپنے اپنے مکالمے اچھی طرح ازبر کرلیے اور انھیں فرفر بولنے لگے۔ایک لڑکے کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ ڈراما نگار نے ڈرامے کے آغاز پر اور پھر موقع محل کے مطابق بیچ بیچ میں جو ہدایات لکھی ہوتی ہیں، وہ انھیں خوب گھوٹ لے۔اسے ''ڈھنڈورچی'' کا انوکھا نام دیا گیا جو کبھی کسی اچھے سے اچھے ڈراما نگار کے ذہن میں بھی نہیں آیا ہوگا۔ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

جس قسم کا ڈراما ہم نے پیش کیا، ایسا شاید دنیا کے کسی بھی کونے میں نہیں ہوا ہوگا۔ڈرامے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے لیے ایک سٹیج تیار کیا جائے، اسے موقع محل کے مطابق فرنیچر اور دیگر درکار اشیا سے آراستہ کیا جائے اور کرداروں کو ان کے کردار کی مناسبت سے ملبوسات پہنائے جائیں اور یہاں ان تمام معاملات میں ہم سب نابلد تھے۔

چودھری سر چھوٹو رام مقررہ روز اپنے حامیوں حوالیوں کے ساتھ پہنچ گئے۔ان کا استقبال کیسے ہوا اور کس نے کیا، ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہمیں کسی نے اس کے متعلق کچھ بتایا۔ بہرحال وہ آئے موٹرکار میں تھے اور موٹرکار ہی میں سکول کی گراؤنڈ میں پہنچے تھے جہاں جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا۔جیسا کہ ہمارے ہاں اکثر ہوتا ہے، کچھ لوگ اپنا شوق تجسس مٹانے کے لیے رضاکارانہ گئے تھے یا کچھ کو اردگرد کے دیہاتوں کے نمبردار اور پٹواری منتیں ترلے کرکے اور کچھ کو پولیس ہانک کر لے آئی تھی اور یوں اچھا خاصا

مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ سٹیج کس نے بنایا تھا کیونکہ کسی کو بھی اس کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ سر چھوٹو رام اور ان کے حواریوں کے لیے سکول میں دستیاب کرسیاں لائی گئیں۔ سب مہمان گرامی ان پر تشریف فرما ہو گئے۔ ان کے سامنے ایک میز رکھ دی گئی۔ کسی نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا اور اس کے بعد ہمارا ڈراما شروع ہو گیا۔

ہم سب نے قمیصیں اور دھوتیاں پہن رکھی تھیں۔ [ہمارے ہاں دھوتی کو چادر کہا جاتا تھا۔] دھوتی بنی بنائی ملتی ہے، چادر خود بنوانا پڑتی تھی۔ یہ عموماً جاپانی کے لٹھے کی ہوتی تھی۔ [یہ لٹھا مانچسٹر کی کسی مل سے بن کر آتا تھا۔ چونکہ اس پر جاپانی کا نشان بنا ہوتا تھا، اس لیے جاپانی کا لٹھا کہلاتا تھا۔] دکاندار سے تھان کٹوا کر خریدی جاتی تھی اور درزی اس کے دونوں پلوں کو دوہرا کر کے سی دیتا تھا تاکہ یہ پھٹنے نہ پائے۔ پتلون تو شاید کسی نے دیکھی بھی نہیں تھی اور شلوار کا بھی کوئی رواج نہیں تھا۔ دسویں جماعت تک ہم عموماً اسی قسم کی چادریں پہن کر ہی سکول جاتے رہے۔ کبھی کسی نے پچھے پر تنبیہ نہیں کی، ان سکول انسپکٹروں نے بھی نہیں جو اکثر سکولوں کا دورہ کرتے رہتے تھے۔

ہم "اداکار" دوسرے حاضرین کی طرح [غالباً جلسہ گاہ کی دوسری یا تیسری قطار میں] زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہماری پیشانیوں پر لئی سے کاغذ کی چٹیں چسپاں کر دی گئی تھیں۔ ان پر موٹے حروف سے ان کرداروں کے نام تحریر تھے جو ہم نے ڈرامے میں نبھانا تھے تاکہ کم از کم سر چھوٹو رام اور خواندہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ کون کیا کردار ادا کر رہا ہے۔ پہلے "ڈھنڈورچی" اٹھتا اور ڈراما نگار کی ہدایات کی ڈگی کرنے لگتا، پھر دوسرے "اداکار" اپنی اپنی باری پر طوطوں کی طرح رٹے ہوئے مکالمے آواز میں کسی قسم کا اتار چڑھاؤ پیدا کیے بغیر دہرانے لگتے۔ تقریباً آدھ پون گھنٹا یہ تماشا ہوتا رہا اور بالآخر ڈراما اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ سر چھوٹو رام اور چند دوسرے لوگوں نے از رہ مروت یا اخلاقاً تالیاں بجائیں اور ہماری "ناچیز" کوششوں کو سراہا۔ اس کے بعد سر چھوٹو رام کی تقریر شروع ہوئی۔ انھوں نے کیا فرمایا، مجھے کچھ یاد نہیں اور پروا بھی کسے تھی۔ تقریر ختم ہوئی، ہم لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔ سر چھوٹو رام کہاں گئے، کب گئے، وہ جائیں یا ان کے حواری جائیں، ہمیں اس سے کیا غرض تھی۔

## 6

پھر ایک دو سال بعد گاؤں والوں نے سچ مچ سٹیج پر ڈراما نما چیز پیش کر دی۔

ولی محمد اور غلام رسول دو سگے بھائی تھے۔ ان کا تعلق ہمارے قریبی رشتے دار جوڑوں کے خاندان

سے تھا۔ ولی محمد دبلا پتلا اور لمبا سا تھا۔ اس کا رنگ سانولا، ناک مہین، پیشانی فراخ، ہونٹ باریک اور چہرے کی ہڈیاں قدرے اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ غلام رسول کی قامت درمیانی، جسم قدرے بھاری، چہرہ فراخ اور آنکھیں کچھ کچھ اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ دونوں کے بال چھدرانے لگے تھے۔ دونوں کرتے دھرتے کچھ نہیں تھے۔ اپنے ماں باپ کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ دونوں شادی شدہ تھے اور بال بچے دار تھے۔ کھاتے بھی اچھا تھے، پہنتے بھی اچھا تھے۔ اگر کبھی کوئی افتاد آ پڑتی، مربعے سے زمین کا ایک ٹکڑا فروخت کر دیتے اور زندگی پھر اپنے پرانے دھرے پر رواں دواں ہو جاتی۔ تاہم دونوں کو اس بات کی داد دینا چاہیے کہ پاکستان کے قیام کے بعد انھوں نے اپنی زندگی کے رنگ ڈھنگ بالکل تبدیل کر دیے۔ اولاد بڑی ہوتی جا رہی تھی اور ان کی ذمے داریاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ انھوں نے اپنے بال بچوں کو دادفتیانہ کے قریب اپنی والدہ [ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا] کے پاس اس چک میں چھوڑا جہاں وہ تقسیم ہند کے بعد آباد ہو گئے تھے اور خود خانیوال چلے گئے۔ وہاں انھوں نے ایک آڑھتی کی دکان پر منیم کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ جب کاروبار کا تجربہ ہو گیا اور وہ اس کے اسرار و رموز سمجھنے لگے، وہ چیچہ وطنی آ گئے، غلہ منڈی کی مسجد کی انتظامیہ سے ایک دکان کرائے پر لی اور اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ نیت نیک تھی، ماں کی دعائیں ساتھ تھیں اور اس کی خدمت بھی سچے دل سے کرتے تھے۔ کاروبار دن دگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ دو تین سال ہی میں غلہ منڈی میں بڑی دکان خریدی اور چند برسوں کے بعد دو جننگ فیکٹریاں بھی بنا لیں۔

ترقی تو ہمارے علاقے کے بے شمار لوگوں نے کی تھی لیکن زیادہ تر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد سرکاری یا نجی فرموں کی ملازمتیں کرنے کے بعد اعلیٰ مقامات پر پہنچے تھے۔ لیکن ایک اور شخص جس نے کاروبار کو اپنا دھندا بنایا اور بے تحاشا روپیہ کمایا، اس کا نام محمد علی بوتی والا تھا۔ اس کے نام کے ساتھ بوتی والا کا لاحقہ اس لیے چپک گیا تھا کیونکہ وہ اپنی بوتی (اونٹنی) پر کاروباری لوگوں کا مال کموور پہنچاتا تھا یا وہاں سے لاتا تھا۔ پھر اس کے دن پھرے اور اس نے قیام پاکستان سے ایک ڈیڑھ سال قبل ایک کراڑ سے اس کی دکان خریدی اور اپنا پرچون کا کاروبار شروع کر دیا۔ مگر قسمت کی دیوی پھر روٹھ گئی۔ ہندوستان منقسم ہو گیا، ہمیں مجبوراً اپنے گھروں کو چھوڑنا پڑا اور ڈیڑھ دو ماہ کموور کیمپ میں گزارنا پڑے۔ محمد علی بوتی والا اکثر اپنی بدقسمتی کا رونا روتا رہتا اور کہا کرتا تھا: "یار، اپنی تو لٹیا ہی ڈوب گئی۔ پائی پائی جوڑ کر بڑی مشکلوں سے ایک دکان بنائی تھی، وہ بھی چھن گئی۔ اب دیکھیں گے کہ پاکستان میں ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔ خیر، ہار ہم بھی ماننے والے نہیں۔ اگر اور کچھ نہ ہو سکا، ریڑھی لگا لیا کریں گے، دال دلیا تو چل ہی جائے گا۔"

لیکن ہوا اس کے برعکس۔ وہ اپنے قمر تیر کے ساتھ پھرتا پھراتا اور دھکے کھاتا ریاست بہاولپور کے دور افتادہ قصبے صادق آباد پہنچ گیا اور وہیں آباد ہو گیا۔ صادق آباد کے قریب ہی رحیم یار خاں میں لیور برادرز (Lever Brothers) کی ڈالڈا گھی اور مختلف اقسام کے صابن، ٹوتھ پیسٹ وغیرہ بنانے کی فیکٹریاں تھیں بلکہ اب بھی ہیں۔ محمد علی بوٹی والے کی روٹھی ہوئی قسمت ناگہاں ایک بار پھر اس پر مہربان ہوئی، پتا نہیں کیسے مگر اسے لیور برادرز کی صادق آباد میں ایجنسی مل گئی۔ نامور ملٹی نیشنل کمپنیوں کی ایجنسیاں جن لوگوں کو مل جاتی ہیں، ان کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ محمد علی بوٹی والے کا کاروبار چل نکلا، وہ صرف صادق آباد ہی کے نہیں بلکہ آس پاس کے دیہاتوں کے دکانداروں کو بھی مال سپلائی کرتا تھا۔ اب وہ بوٹی والا نہیں تھا بلکہ چودھری محمد علی کہلانے لگا تھا۔ اس کا بیٹا افضل باپ سے بھی کئی قدم آگے نکل گیا۔ اس نے باپ کی کمائی سے پہلے ایک آئل ٹینکر بنایا، پھر دوسرا، تیسرا۔ پھر ایک دن آیا کہ اس کے ٹینکروں کی تعداد درجنوں ہو گئی اور اس نے کئی ایک پٹرول پمپ بھی بنا لیے۔ ایک لحاظ سے وہ باپ کے آبائی پیشے پر لوٹ آیا تھا، مگر مختلف اور شاندار انداز سے۔ اس نے جرمنی کی ایک فرم کی ہومیو پیتھک ادویات کی ایجنسی بھی لے لی تھی۔ وہ کروڑپتی تھا مگر زندگی نے وفا نہ کی۔ اپنے باپ کے انتقال کے چند ہی برس بعد وہ خود بھی خالق حقیقی سے جا ملا۔ ویسے اس کا کاروبار جوں کا توں چل رہا ہے، اس کے بیٹے اسے کامیابی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔

ہمارے گاؤں کا واحد گراموفون غلام رسول کے پاس تھا۔ آج کل تو ٹیپ ریکارڈر آ گئے ہیں جن پر کئی کئی گھنٹوں پر محیط گانے، تقریریں، ڈرامے اور دیگر پروگرام ریکارڈ کیے اور سنے جا سکتے ہیں۔ جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں، اس زمانے میں صرف گراموفون ہوتا تھا اور وہ بھی پرانی وضع کا۔ اس گراموفون پر آواز بھرنے اور سننے کے لیے سیاہ پلاسٹک کا ریکارڈ استعمال ہوتا تھا جسے ہم توا کہا کرتے تھے کیونکہ اس کی شکل توے جیسی ہوتی ہے۔ توا مدوّر مگر سپاٹ (flat) ہوتا تھا۔ اس پر چکردار لکیر (spiral groove) کھدی ہوتی تھی۔ سٹوڈیو میں آواز اسی لکیر پر بھری جاتی تھی۔ گھڑیوں کی طرح گراموفون کو چلانے کے لیے بھی اسے چابی دی جاتی تھی۔ گراموفون کے اوپر توا رکھا جاتا تھا، چابی دینے کے بعد توا گھومنے لگتا تھا۔ گراموفون کا ایک "بازو" (arm) ہوتا تھا جس میں ایک باریک سوئی (needle) لگی ہوتی تھی۔ ریکارڈ کے گھومنے پر یہ سوئی چکردار لکیر کے اوپر گھسٹتی تھی۔ وہ ارتعاش (vibration) پیدا ہونے پر توے کی چکردار لکیر پڑھتی تھی اور اپنا حاصل مطالعہ گراموفون کے سپیکر کو منتقل کر دیتی تھی۔ سپیکر بھونپو نما (horn) ہوتا تھا۔ توے کی دونوں جانب صرف ایک ایک گانا ریکارڈ ہوتا تھا۔ اس ریکارڈ کے اصل موجد ایمیل برلنر (Emile Berliner) نے ایک انگریز مصور Francis Barraud کی ایک تصویر بعنوان His Master's Voice کو مصوری کی

اجازت سے اپنا ٹریڈ مارک بنالیا۔ تصویر میں ایک terrier کتا بھونپو کی طرف سر بیوڑائے بڑے انہماک سے توا سن رہا ہے۔ یہ تصویر کمپنی کے بھرے ہوئے تمام ریکارڈوں پر بنی ہوتی تھی۔ بعد میں خود کمپنی کا نام ہز ماسٹرز وائس (HMV) ہو گیا اور برصغیر میں مدتوں یہی کمپنی تمام ریکارڈ بھرتی اور فروخت کرتی رہی۔ اب نہ یہ گراموفون رہے اور نہ ان پر چلنے والے ریکارڈ۔ البتہ مختلف شکلوں کے بھونپوؤں کی تصاویر انٹرنیٹ پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ ہمارے ہاں ہز ماسٹرز وائس ایک قسم کا محاورہ بن گیا ہے اور اسے اس شخص، اخبار نویس، ٹی وی کمپیئر، سیاستدان، اخبار وغیرہ پر چسپاں کر دیا جاتا ہے جو اپنے آقاؤں کا پڑھایا ہوا سبق موقع بے موقع دہراتا رہتا ہے۔[1]

غلام رسول خوش باش مگر طبعاً مذہبی آدمی تھا لیکن جنونی نہیں تھا۔ اس کے پاس زیادہ تر حمدوں، نعتوں اور قوالیوں کے ریکارڈ تھے۔ وہ جب کبھی مجھ پر مہربان ہوتا مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دے دیتا اور گھنٹوں اپنے چوبارے میں ریکارڈ سناتا رہتا۔

ولی محمد بھی خوش باش آدمی تھا۔ وہ ہر وقت ہنستا مسکراتا رہتا تھا۔ اس کے چہرے پر تفکر یا ملال کے آثار شاید ہی کبھی نمایاں ہوتے ہوں گے۔ وہ غلام رسول کے برعکس extrovert (بیرون بین) تھا اور گاؤں والوں کی غیر نصابی (extra-curricular) سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ کبھی سرخ قمیصوں [یہ قمیصیں مقامی للاری/ رنگ ساز کی رنگی ہوتی تھیں] میں ملبوس نوجوان احراریوں کے ٹولے کی رہنمائی کر رہا اور چپ راست چپ راست کراتا ان کے جلوس نکلوا رہا ہوتا [مجلس احرار قیام پاکستان تک تحصیل نکودر میں خاصی مقبول سیاسی جماعت رہی تھی] اور کبھی ہماری حویلی کے قریب کے کھیت میں، اگر وہ خالی ہوتا، چھڑ کاؤ کرا کر اور والی بال کا جال لگا کر میچ کھیل رہا ہوتا۔

پھر ایک روز اسے ہمارے گاؤں میں ڈراما کرانے کی سوجھی۔

ہمارے گاؤں میں ہندوؤں کے کُل آٹھ دس گھر تھے [سکھ ایک بھی نہیں تھا]۔ رام چند سنار تھا۔ اس کی اپنی کوئی دکان نہیں تھی۔ وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ اپنے گھر پر ہی دیہاتیوں کے زیورات بناتا اور فروخت کرتا تھا۔ خیراتی رام اور لائق رام دو سینک سلائی دبلے پتلے نوجوان بھائی تھے۔ ان کی پرچون کی دکان تھی۔ ان کے ہاں ہرڑ کا مربا بہت بڑھیا ملتا تھا۔ پتا نہیں ان کی ماں بناتی تھی یا کہیں سے خرید کر لاتے تھے۔ ہمارے ایک ہم جماعت محمد اسلم کو اس کا لپکا / چسکا پڑ گیا تھا اور وہ اس کی ہر روز بڑے بیر جتنی سالم پھل کی ڈلی کھانا اپنا مذہبی فریضہ گردانتا تھا۔

---

1۔ اسی قبیل سے پنجابی زبان کا محاورہ "کسی کا توا لگانا" بنا ہے۔

مکندلال اجناس کا کاروبار کرتا تھا۔ اس کے عزائم بہت بلند تھے مگر وہ گاؤں کی تنگنائے میں پروان نہیں چڑھ سکتے تھے۔ چنانچہ اس نے پربجیاں کو خیرباد کہا اور نکودر چلا گیا۔ وہاں اس نے غلہ منڈی میں دکان خریدی اور اپنے من کی مراد پورا کرنے لگا۔

ایک موہن اور اس کی بیوہ ماں تھے۔ موہن تو ایک روز گھر سے بھاگ گیا اور اس کی ماں بھاگ بھری (نام کی اُلٹ اور قسمت کی کھوٹی) مسلمان پڑوسیوں کے گھروں میں کام کرکے اپنا پیٹ پالتی رہی۔

گاؤں کے مرکزی کنویں کے قریب، جہاں سے گھروں میں پینے کا پانی نکالا جاتا تھا، ہندوؤں کی دو اور دکانیں تھیں۔ ان میں سے ایک پرچون کی اور دوسری مٹھائی کی تھی۔ مٹھائی کی دکان کا مالک دھنی بخش ریڑیاں (ریوڑیاں) بہت عمدہ بناتا تھا۔ وہ پہلے گڑ کا شیرہ تیار کرتا۔ جب شیرہ گاڑھا اور گندھنے کے قابل ہو جاتا، وہ کڑاہی چولہے سے اتارتا، شیرے کو ٹھنڈا ہونے دیتا، پھر اسے گوندھنے میں جت جاتا۔ جب اس میں لیس پیدا ہو جاتی، وہ اس کا لمبوترا مدوّر ڈلا بناتا، اسے کنڈی سے لٹکاتا، زور زور سے اوپر نیچے کھینچتا اور مسلتا۔ جب اس کے حساب سے یہ ریوڑیاں بنانے کے قابل ہو جاتا، وہ اسے نیچے اتارتا، چاقو سے ریوڑیاں کاٹتا۔ جب ڈھیر ساری ریوڑیاں تیار ہو جاتیں، وہ انھیں تھال میں بچھاتا اور ان پر تلوں کے بیج چھڑک دیتا۔ ریوڑیاں سارے مراحل طے کرنے کے بعد کھانے کے قابل ہو جاتیں۔

جلیبیاں بھی تو سبھی نے دیکھی ہوں گی۔ ہمارے لیے یہ منظر انتہائی دلچسپ اور پرکشش ہوتا تھا۔ جلیبیاں بنانے کے لیے میدے، چینی، گھی اور زرد رنگ کو پانی میں آپس میں پھینٹ کر اس کا ملغوبہ تیار کیا جاتا تھا۔ دھنی بخش اس پتلے ملغوبے کو ایک چتل کی گزوی میں ڈالتا جس کے نیچے ایک سوراخ ہوتا تھا۔ جب وہ سوراخ میں سے بڑی مہارت سے ملغوبہ نیچے کھولتے تیل یا گھی کی کڑاہی میں انڈیلتا اور جلیبیوں کی ٹیڑھی میڑھی اور چکردار شکلیں بننے لگتیں، ہمارے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ جاتے۔ پھر ایک روز جانے کیا ہوا۔ اس نے اپنی دکان محمد علی بوٹی والے کے پاس بیچی، سامان سمیٹا اور وہ بھی نکودر چلا گیا۔

مکندلال کی طرح چیت رام کی بھی کوئی دکان نہیں تھی لیکن اسے اپنے کاروبار کو وسعت دینے کا کبھی ہوکا نہیں پڑا تھا۔ وہ کسی قیمت پر پربجیاں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اور نہ اس نے چھوڑی۔ وہ بس کسانوں سے ان کی اجناس خریدتا تھا، محمد علی بوٹی والے کی خدمات حاصل کرتا تھا یا کہیں سے کھوتوں (گدھوں) والوں کو لے آتا تھا اور اپنی خریدی ہوئی اشیا نکودر منڈی بیچ آتا تھا۔

چیت رام نہ موٹا تھا اور نہ دبلا پتلا۔ وہ بس درمیانی قامت کا تھا۔ اس کے ہونٹ موٹے، چہرہ قدرے کھردرا اور رنگ سانولا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی جو اس کی ذہانت اور چالاکی کی چغلی

کھاتی تھی۔ وہ قصبوز تھانہ بالکل ہی روکھا۔ وہ کسانوں کو لبھانے اور ان کے دل جیتنے کے ہنر سے بخوبی آگاہ تھا اور اپنے انھیں اوصاف کے بل بوتے پر ان کی اجناس نسبتاً سستے داموں خریدنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

چیت رام کا ایک بھائی بھی تھا۔ اس کا نام لبھو رام تھا۔ چیت رام کے برعکس وہ دراز قامت اور مضبوط تن و توش کا مالک تھا۔ اس کا رنگ بھی قدرے کھلتا تھا۔ وہ پڑھ لکھ کر پولیس میں بھرتی ہو گیا تھا اور تھانیدار کی حیثیت سے کسی دیہاتی تھانے میں کام کرتا تھا۔ پھر ایک دن انہونی وقوع پذیر ہوئی۔ اس خوبرو اور گھبرو جوان کی لاش گاؤں پہنچ گئی۔ پتا نہیں اسے ہیمرج [دماغ کی شریانوں کا پھٹ جانا] یا اس پر اختلاج قلب کا حملہ ہوا تھا۔ سارا گاؤں سناٹے میں آ گیا۔ اس کی ضعیف ماں اور جوان بہنوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی، انھوں نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا۔ نہلائے دھلائے اور کفن پہنائے جانے کے بعد اس کی لاش ایک لکڑی کے تختے (پھٹے) پر رکھی گئی۔ یہ تختہ بس اتنا ہی چوڑا تھا کہ اس پر لاش رکھی جا سکے۔ اس تختے کو عام طور پر ارتھی کہا جاتا ہے لیکن ہمارے ہاں اس کے لیے بس "پھٹا" کا لفظ ہی استعمال ہوتا تھا۔ چند آدمیوں نے پھٹا اٹھایا اور اسے مرگھٹ[1] پہنچا دیا۔

مرگھٹ میں ایک پایاب گڑھا کھودا گیا اور اس میں شیشم (ٹالی) کی لکڑیوں کا ڈھیر لگا دیا گیا۔ لبھو رام کی لاش ڈھیر پر رکھی گئی۔ چونکہ لبھو رام ابھی ناکتخدا تھا اور اس کی کوئی اولاد نہیں تھی، اس لیے تمام دھارمک رسوم چیت رام نے ہی سرانجام دیں۔ اسی نے لکڑیوں کے ڈھیر کو آگ لگائی اور اسی نے بعد میں اپنی چھڑی سے اس کا بھیجا پھوڑا۔ لاش اور لکڑیاں جلتی رہیں، جلتی رہیں تا آنکہ سب کچھ کوئلے کا ڈھیر بن گیا۔ یہ سارا منظر میں نے اور میرے دوستوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ہمیں یہ سب کچھ بہت مہیب اور ڈراؤنا نظر آیا، اور ہمیں ڈر واقعی آیا بھی بہت۔ شاید اسی لیے بعض توہم پرست دیہاتی کہا کرتے تھے کہ ہندوؤں کے سیووں کے قریب بھی جانا نہیں چاہیے، کیا پتا کوئی چڑیل یا بھوت پریت چمٹ جائے۔ لیکن جب ہم مڈل سکول میں داخل ہوئے، ہم ہر روز اس مرگھٹ کے قریب سے گزرتے تھے کیونکہ یہ ہمارے راستے میں پڑتا تھا، نہ ہمیں کبھی کوئی چڑیل یا بھوت پریت چمٹا اور نہ ہمیں کبھی کوئی خوف محسوس ہوا۔

اسی چند ہمارے گاؤں کا امیر ترین شخص تھا۔ اس کی دکان کسی بہت بڑے ہال جتنی لمبی چوڑی تھی اور اس میں دنیا بھر کا مال بھرا رہتا تھا۔ پھر ایک روز اسے بدقسمتی نے آ گھیرا۔ اس کی دکان پر ڈاکا پڑا [گاؤں میں میرے قیام کے دوران میں یہ چوری یا ڈاکے کا پہلا اور آخری واقعہ تھا]۔ ڈاکو نہ صرف نقدی بلکہ دکان

---

1۔ مرگھٹ کو اردو میں شمشان بھی کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں اسے سیوے کہا جاتا تھا۔

کا سارا قیمتی اور کارآمد سامان بھی اونٹوں پر لاد کر لے گئے۔ امی چند کا دل ٹوٹ گیا۔ اس نے دکان بیچی اور وہ بھی نکودر سدھار گیا۔

یہ دکان ہمارے گاؤں کے ایک جمیر[1] نے خریدی تھی اور کافی دنوں سے خالی پڑی تھی۔ جب ولی محمد کے دماغ میں ڈراما سٹیج کرنے کی رو چلی، تو اسے یہ دکان اپنے مقصد کے لیے موزوں ترین نظر آئی اور بالآخر اس نے اسے ہی منتخب کر لیا۔

معلوم نہیں ڈراما کس کے زورِ تخیل کا نتیجہ تھا مگر اس کے مرکزی کردار مسلمانوں کو ہسپانیہ سے دیس نکالا دینے والے عیسائی بادشاہ فرڈی نینڈ اور ملکہ ازابیلا تھے۔ محمد علی فرڈی نینڈ خود بنا اور ملکہ کا کردار نبھانے کے لیے اس نے دکان کے نئے مالک کے بیٹے نذیر احمد کو منتخب کیا۔ نذیر احمد گورا چٹا نوخیز لڑکا تھا اور اس میں قدرے زنخا پن بھی تھا۔ باقی کردار جن لوگوں نے نبھائے وہ ادھر ادھر سے اکٹھے کیے گئے تھے۔ ولی محمد اپنے گھر سے ستھیر [بیٹھنے اور نماز پڑھنے کا تخت] لے آیا۔ اسے کام چلاؤ سٹیج کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اس پر دو کرسیاں رکھی گئیں جن پر بادشاہ سلامت اور ملکہ عالیہ کو تشریف فرما ہونا تھا۔ ولی محمد کہیں سے گیس کا لیمپ (پیٹرومیکس) لے آیا اور یوں سٹیج پر روشنی کا انتظام ہو گیا۔ بادشاہ سلامت اور ملکہ عالیہ کے لیے گتوں کے تاج تیار[2] کیے گئے جنھیں سرخ سیاہی سے چمکایا گیا۔ ولی محمد کو کہیں سے پتلون مل گئی تھی۔ اس کا اپنا ایک عدد کوٹ بھی تھا۔ اس نے پتلون اور کوٹ پہنے، سر پر تاج سجایا اور دھج سے بادشاہ بن گیا۔ نذیر احمد نے اپنی بہن کی پھولدار قمیص اور سبز شلوار پہن لی۔ اپنے دانتوں پر رگڑ رگڑ کر سک[3] ملا۔ اس سے نہ صرف اس کے دانت چمکنے لگے بلکہ اس کے ہونٹ بھی سرخ ہو گئے، یوں وہ لپ سٹک سے بے نیاز ہو گیا۔ [لپ سٹک کیا ہوتی ہے یہ بھلا کس کو معلوم تھا۔]

ڈراما کیا ہوتا ہے، سٹیج کی کس طرح تزئین کی جاتی ہے، ہدایت کار کس طرح اداکاروں سے کام لیتا اور ان سے مکالمات ادا کراتا ہے، ان معاملات میں ولی محمد بھی اتنا ہی کورا تھا جتنا کہ منشی علی محمد تھے۔ ایک بات کی البتہ داد دی جانا چاہیے، سب لوگوں نے اپنے اپنے مکالمات خوب رٹے ہوئے تھے اور "سٹیج" پر طوطے کی طرح فر فر ان کی گردان کر رہے تھے۔

---

1- جمیر۔ بعض لوگ اسے جھیور بھی کہتے ہیں۔ آپ اردو میں اسے ماشکی کہہ سکتے ہیں۔

2- ہسپانوی نرم زبان ہے، اس میں عربی کی طرح ٹ اور ڑ نہیں ہوتی۔

3- دنداسہ۔ اصلاً یہ اخروٹ کی چھال ہوتی ہے۔ ایک زمانے میں پنجاب میں عورتیں عموماً اسی سے دانت صاف کیا کرتی تھیں۔ دیہاتوں میں شاید اب بھی کرتی ہوں۔ پنجابی لوک شاعری کا یہ ایک اہم لفظ ہے۔ مثلاً موہ لیا تویتاں والا، دندی داسک مل کے۔

Scanned with CamScanner

ڈراما عشا کی نماز کے بعد شروع ہوا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے چلتا رہا۔ دکان دھوتیوں میں ملبوس دیہاتیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ تمام لوگ تصویر حیرت بنے یہ سب منظر دیکھ رہے تھے۔

## 7

منشی علی محمد سخت گیر استاد ضرور تھے مگر قابل، محنتی اور فرض شناس بھی بے حد تھے۔ وہ اگرچہ ہمیں طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک سکول میں بٹھائے رکھتے تھے لیکن ہمیں ہمہ وقت مصروف رکھتے تھے اور ایک لحظ بھی بیکار نہیں رہنے دیتے تھے۔ صبح کو ریاضی کی مشقیں کراتے تھے اور بعد دوپہر اردو، تاریخ اور جغرافیہ پڑھاتے تھے۔ ضلع جالندھر کا جغرافیہ ہم تیسری جماعت میں پڑھ چکے تھے۔ منشی علی محمد پورے پنجاب کے جغرافیہ کی تعلیم دیتے تھے۔ انھوں نے ہمیں نقشہ دیکھنا بھی سکھایا۔ چوتھی جماعت کے کمرے میں پنجاب کا جہازی جسامت کا نقشہ ہمہ وقت دیوار کے ساتھ لٹکا رہتا تھا۔ نقشہ بہت دبیز کاغذ پر چھپا تھا۔ اس میں پنجاب کی پانچوں قسمتیں [کمشنریاں: راول پنڈی، ملتان، لاہور، جالندھر اور انبالہ] مختلف رنگوں میں دکھائی گئی تھیں۔ اس کے اوپر اور نیچے دو چوبی ڈنڈے لگے ہوئے تھے تاکہ یہ پھٹ نہ سکے۔ وہ شام کو نقشے پر مختلف شہروں اور قصبوں کو تلاش کرنے کی مشق کراتے۔ ہمیں اس کام میں اتنی مہارت ہو گئی تھی کہ جب وہ ہمارے ہاتھ میں چھڑی پکڑاتے اور کہتے: ''بتاؤ، فلاں شہر یا مقام کہاں ہے؟'' جب ہم مطلوبہ جگہ پر چھڑی سے اشارہ کر دیتے، بہت خوش ہوتے۔

حساب میں جمع تفریق ہم نے دوسری اور ضرب تقسیم تیسری جماعت میں سیکھی تھی۔ لیکن یہ بہت سادہ قسم کی ہوتی تھیں۔ رقوم دو یا زیادہ سے زیادہ تین اعداد پر مشتمل ہوتی تھیں۔ چوتھی جماعت میں جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم کی بہت لمبی اور پیچیدہ رقوم سے واسطہ پڑا۔ زمینوں کے رقبے دریافت کرنے کے طریقے سمجھائے گئے۔ گھماؤں (ایکڑ)، کنال، مرلہ اور سرسائی کا ایک دوسرے سے رشتہ بتایا گیا۔ کسی عیسوی سال کی کسی خاص تاریخ [مثلاً 25 ستمبر 1529] کو کون سا دن تھا، اس کو معلوم کرنے کا گر بتلایا پڑا۔ اس میں لیپ سال کیا کردار ادا کرتا ہے، وہ بھی ذہن نشین کرایا گیا۔ سود مفرد اور سود مرکب میں فرق کیا ہوتا ہے اور دونوں کو کس طرح معلوم کیا جا سکتا ہے، اس کے گر سمجھائے گئے۔

منشی علی محمد کے تقسیم کے اپنے قاعدے تھے۔ پتا نہیں انھوں نے انھیں کسی کتاب یا رسالے میں پڑھا تھا یا یہ ان کے اپنے زرخیز دماغ کی پیداوار تھے، بہرحال اس زمانے میں جب calculator نام کی

کوئی چیز نہیں تھی۔ یہ تھے بہت کام کے۔ اگر آپ نے کسی رقم کو 2 پر تقسیم کرنا ہے، تو سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ اس رقم کا پہلا عدد جفت ہے یا طاق۔ اگر یہ عدد جفت ہے، پھر پوری رقم 2 پر تقسیم ہو جائے گی۔ 4، 8، 18، 66، 176 وغیرہ ایسی ہی رقوم ہیں۔ سبھی کا پہلا عدد جفت ہے اور سبھی 2 پر تقسیم ہو جائیں گے۔ اگر پہلا عدد طاق ہے، پھر نہ وہ اور نہ پوری رقم 2 پر تقسیم ہو سکے گی۔ 3، 7، 9، 11، 13، 129، 7843 ایسی ہی رقوم ہیں۔ ان سب کا پہلا عدد طاق ہے اور یوں ان میں کوئی بھی 2 پر تقسیم نہیں ہو سکے گی۔

4، 8 اور 16 پر بھی یہی اصول لاگو ہوتا ہے۔ تاہم 4 پر تقسیم کرنے کے لیے رقم کے پہلے دو اعداد لینا پڑتے ہیں، اگر وہ جفت ہیں اور چار پر تقسیم ہو سکتے ہوں، پھر پوری رقم خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، 4 پر تقسیم ہو جائے گی۔ 4 اور 8 دونوں جفت اعداد ہیں اور دونوں ہی 4 پر تقسیم ہو جاتے ہیں، تاہم آگے دیکھیں، 12، 16، 20، 24، 136، 784، 89456 وغیرہ سبھی 4 پر تقسیم ہو جاتے ہیں کیونکہ سب کے پہلے دو عدد 4 پر تقسیم ہو جاتے ہیں۔

یہ دیکھنے کے لیے کہ کوئی رقم 8 پر تقسیم ہو سکے گی یا نہیں، رقم کے پہلے تین عدد لینا پڑتے ہیں، مثلاً 100 آٹھ پر تقسیم نہیں ہو سکتا مگر 200 ہو سکتا ہے، اسی طرح 784 بھی۔ [98=8%784] اگر آپ کو 8 کا پہاڑا نہیں آتا، پھر پہلے پوری رقم کو 2 سے تقسیم کر لیں اور جواب کو 4 سے۔ مثلاً 392=2%784، 98=4%۔ اگر آپ کو 2 کا پہاڑا بھی نہیں آتا، پھر آپ کا اللہ حافظ ہے۔

3 اور 9 کو صرف طاق اعداد پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ نے یہ دیکھنا ہو کہ کوئی رقم 3 یا 9 پر تقسیم ہو سکتی ہے یا نہیں، پھر پوری رقم کے تمام اعداد کو آپس میں جمع کر لیں، اگر جواب 3 یا 9 پر منقسم ہو جائے، پھر پوری رقم ان پر تقسیم ہو سکے گی۔ 3 اور 9 تو مفرد اعداد ہیں۔ یہ دونوں 3 پر تقسیم ہو جاتے ہیں مگر 9 صرف 9 پر تقسیم ہوگا۔ آگے چلیں 12 کا حاصل جمع 3، 15 کا 6، 27 کا 9، 174 کا 12، 2853 کا 18 ہے۔ سبھی حاصل جمع 3 پر تقسیم ہو جاتے ہیں لیکن 9 پر تقسیم صرف 27 اور 2853 ہوں گے۔

6 پر کوئی رقم تقسیم کرنے سے پہلے یہ دیکھنا پڑے گا کہ وہ 2 اور 3 دونوں پر تقسیم ہو سکتی ہے یا نہیں۔ 5 اور 10 پر تقسیم ہونے والی رقوم کا تعین سب سے آسان ہے۔ اگر کسی رقم کا پہلا ہندسہ صفر ہے، پھر بڑی سے بڑی رقم 10 پر تقسیم ہو جائے گی۔ مثلاً 10، 20، 50، 970، 28380 وغیرہ۔ اس میں صرف صفر حذف کر دیں، جو باقی بچے گا، وہ آپ کا جواب ہوگا۔ جو رقوم صفر یا 5 سے شروع ہوتی ہوں، وہ بھی کی بھی 5 پر منقسم ہو سکتی ہیں۔ مثلاً 45، 60، 635، 760 وغیرہ۔

اب 11 لیں۔ اگر آپ کسی رقم کے متعلق معلوم کرنا چاہتے ہوں کہ یہ 11 پر تقسیم ہو سکے گی یا نہیں تو

اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ پہلے رقم کے پہلے، تیسرے، پانچویں، ساتویں وغیرہ اور پھر دوسرے، چوتھے، چھٹے، آٹھویں وغیرہ اعداد کی جمع بنالیں، اگر دونوں کا جواب برابر ہوا، پھر وہ رقم 11 پر تقسیم ہو جائے گی۔ دو اعداد پر مشتمل رقم کا تعین بہت آسان ہے۔ 11، 22، 33، 44، 55، 66، 77، 88، 99 سبھی 11 پر تقسیم ہو جاتے ہیں۔ آگے چلیں، 121 میں پہلے اور تیسرے عدد کی جمع 2 اور وہ دوسرے عدد یعنی 2 کے برابر ہے، 5984 میں پہلے اور تیسرے عدد کا مجموعہ 13 بنتا ہے اور یہی حال دوسرے اور چوتھے عدد کا ہے، یوں یہ رقم بھی 11 پر تقسیم ہو جائے گی۔

منشی علی محمد نے 7 اور 13 کے متعلق بھی طریقے بتائے تھے مگر مجھے وہ بھول گئے ہیں۔

منشی علی محمد ہمیں سارا دن صرف سکول میں ہی مصروف نہیں رکھتے تھے، وہ ہماری راتیں بھی بے مصرف نہیں جانے دیتے تھے۔ وہ چار چار طالب علموں کی ٹولیاں بنا دیتے تھے۔ بجلی تو تھی نہیں، وہ تو جالندھر شہر کے ماسوا پورے ضلع میں نہیں تھی۔ ان ٹولیوں کو لالٹین یا دیے کی روشنی میں پڑھنا ہوتا تھا۔ ان میں سے عموماً ایک لڑکا جو پڑھائی میں دوسروں سے ذرا آگے ہوتا تھا، باقیوں کی رہنمائی کرتا تھا۔ منشی صاحب حساب کی کتاب سے پوری مشق کے سوال کرنے کا حکم دے دیتے تھے اور اگلی صبح سلیٹ پر امتحان لیتے تھے۔

میرے ساتھ تین لڑکے محمد منیر [وہ میرا تایا زاد بھائی تھا] محمد مختار [اس کا تعلق جوڑوں کے خاندان سے تھا] اور شاہ محمد [وہ میرا پڑوسی تھا] ہوتے تھے۔ ان سب کا لیڈر میں تھا مگر عملی زندگی میں وہ سب مجھ سے آگے نکل گئے۔ ان میں سے کوئی بھی مڈل سکول سے آگے نہ بڑھا لیکن محمد منیر اور محمد مختار نہایت کامیاب بزنس مین بنے اور لکھ پتی نہیں کروڑ پتی بنے۔ شاہ محمد کڑاکے کا پٹواری تھا۔ پاکستان بننے کے بعد میری اس سے صرف ایک ملاقات ہوئی۔ بڑا ٹھاٹھ دار لباس اور طرّے والی پگڑی پہنے ہوئے تھا۔ کتابوں کا مارا ہوا میں سب سے پھسڈی رہ گیا۔ کسی نے سچ کہا ہے: دولت مند بننے کے لیے علم کی نہیں عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر دولت مل جائے باقی سارے کام سدھ ہو جاتے ہیں اور یوں جتاں دے گھر دانے اُنہاں دے کملے بھی سیانے ہو جاتے ہیں۔

چوتھی جماعت میں منشی علی محمد بیت بازی کے مقابلے بھی کراتے تھے۔ جماعت کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ عزیز اور میں عموماً مخالف گروہ میں ہوتے۔ عزیز کو سب سے زیادہ زبانی شعر یاد تھے اور عموماً اسی کا گروہ کامیاب رہتا تھا۔ میری اور میرے ساتھیوں کی کوشش ہوتی تھی کہ کوئی ایسا شعر لڑھکا یا جائے جس کا آخری حرف ڑ ہو جیسے مروڑ، تروڑ، دوڑ وغیرہ میں تاکہ فریق مخالف کو مات دی جاسکے کیونکہ کوئی بھی لفظ ڑ سے شروع نہیں ہوتا اور بیت بازی کا بنیادی نکتہ ہی یہ ہے کہ ایک فریق جو شعر پڑھتا،

مخالف فریق کو ایسا شعر پڑھنا ہوتا جو اس حرف سے شروع ہوتا ہو جو اس کے اپنے شعر کے اختتام پر آیا ہو۔ مثلاً غالب کا شعر لیں:

خوشی جینے کی کیا؟ مرنے کا غم کیا؟ ہماری زندگی کیا؟ اور ہم کیا؟

اب مخالف فریق کو لیں، اسے ایسا شعر پڑھنا ہوتا جس کا آغاز الف سے ہوتا۔

یہ محض مثال ہے۔ ورنہ ہم میں اتنی لیاقت کہاں تھی کہ چوتھی جماعت میں غالب سمجھنے کا دعویٰ کرتے۔ اور فی البدیہہ ایسا شعر پڑھنا بھی تقریباً ناممکن تھا جس کے آخر میں ڑ آتا ہو اور ایسے شعر اردو شاعری میں ہوں گے بھی کتنے، چنانچہ ہم اکثر مار کھا جاتے۔

چوتھی جماعت میں ہمیں وظیفے کا امتحان دینے نکودر جانا پڑا۔ عام خیال یہی ہے کہ نکودر کا اصل تلفظ نکو۔ در (نیک / اچھا دروازہ) ہے۔ ایک دفعہ مولانا محمد حسین آزاد گھومتے گھماتے یہاں آ نکلے۔ انھوں نے یہاں کے احوال دیکھے اور ایک رسالے کے مدیر کے نام ایک خط میں لکھا: یہ قصبہ قدیمی آباد ہے۔ ''اکبر نامہ'' میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ یہاں یہ مشہور ہے کہ نکودر کوئی راجپوت تھا۔ اس کے نام سے یہ آبادی قائم ہوئی، چنانچہ ان کی اولاد اب تک یہیں رہتی ہے اور ان میں سے غلام غوث معزز اور صاحب جائداد نمبردار ہے۔ یہاں کے مقبرے دیکھنے کے لائق ہیں۔ ان میں ایک مقبرہ محمد مومن کا ہے اور دوسرا حاجی محمد جمال کا۔ یہ دونوں احباب امرائے جہانگیری سے تھے۔ محمد جمال وہی شخص ہے جس کے اہتمام سے قلعۂ لاہور کی بعض عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ یہاں یہ مشہور ہے کہ وہ جہانگیر کے رضاعی بھائی تھے۔ ان کی ماں کا دودھ جہانگیر نے پیا تھا۔ [اس خط کی نقل محمود الحسن نے مجھے دی تھی۔] ہمارے گاؤں سے نکودر کو دو راستے جاتے تھے۔ سیدھا راستہ سات کوس [تقریباً دس گیارہ میل] لمبا تھا۔ دوسرا راستہ اس سے بھی طویل تھا اور یہ براستہ مبت پور جاتا تھا۔ مبت پور ہمارے گاؤں سے چار کوس اور نکودر وہاں سے پانچ کوس دور تھا، تا ہم اس کا فائدہ یہ تھا کہ مبت پور سے نکودر تک پکی سڑک بنی ہوئی تھی اور اس پر یکہ [لاہور والوں کا تانگا / ٹانگا] چلتا تھا [انتظار حسین کا اکا بھی یقیناً اسی قسم کی چیز ہوگی]۔ کچی سڑکوں پر پیدل چلنا پڑتا تھا، وہاں کوئی سواری نہیں ملتی تھی۔ چنانچہ ہم اپنی اپنی سلیٹ اور تختی سمیت خراماں خراماں پیدل چلتے ہوئے پہلے مبت پور اور وہاں سے یکے پر نکودر پہنچے۔ رات سب لڑکوں نے قریبی دیہاتوں میں دور نزدیک کے رشتے داروں کے ہاں گزاری۔ جن لڑکوں کے کوئی رشتے دار نہیں تھے، وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ٹک گئے۔

اگلی صبح ایک مقامی سکول میں امتحان ہوا۔ اے ڈی آئی [اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز]

میاں عبدالخالق نگران ممتحن تھے۔ [میاں صاحب انتہائی شریف النفس اور نیک انسان تھے۔ اکثر ہمارے گاؤں میں معائنے کے لیے آتے رہتے تھے۔ تقسیم کے بعد ملتان میں آباد ہو گئے۔ میں جب ایمرسن کالج ملتان میں پڑھاتا تھا، ایک دن اتفاقیہ ان سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ انھوں نے مجھے پہچان لیا۔ بہت دیر تک پرانی یادیں تازہ کرتے رہے اور متعدد مرتبہ ملنے کے لیے آتے رہے۔ ] ہماری سلیٹیں، تختیاں، قلم اور دواتیں ہمارے بستوں میں تھیں۔ انھوں نے پہلے حساب کے دو تین سوال لکھوائے، ہم نے اپنی سلیٹوں پر ان کے جواب حل کیے۔ جب وقت ختم ہو گیا، وہ اور ان کا ایک مددگار ایک ایک لڑکے کے پاس آتے، اس کے جواب کی پڑتال کرتے اور نتیجہ اپنے فارم پر لکھ لیتے۔ پھر تختیوں پر املا لکھوائی گئی۔ عبارت میں ایک لفظ عزت مآب تھا۔ سوائے عزیز کے سب نے اسے غلط لکھا۔ قصہ زمین، برسر زمین، املا کو بھی موقع پر ہی جانچا گیا۔ سب امیدواروں سے تاریخ جغرافیہ کے سوالات زبانی پوچھے گئے۔ آخر میں اردو کی کتاب سے باری باری سب سے کوئی عبارت پڑھوائی گئی۔ لیجیے، دو گھنٹوں میں ہمارا امتحان مکمل ہو گیا اور نتائج بھی وہیں مرتب ہو گئے۔ کوئی مہینے ڈیڑھ مہینے بعد اطلاع آئی کہ ہمارے سکول کے پانچ چھ لڑکوں کو ڈسٹرکٹ بورڈ نے وظیفے کا مستحق گردانا ہے جن میں عزیز اور راقم الحروف بھی شامل تھے۔ وظیفے کی رقم چار روپے ماہوار تھی۔ آج یہ رقم کتنی حقیر معلوم ہوتی ہے مگر اس انتہائی سستے زمانے میں، جب چھٹی چار آنے سیر بکتی تھی، یہ رقم خاصی بڑی تھی۔

## 8

ملتان کے متعلق یار لوگوں نے ایک کہاوت گھڑ رکھی ہے:

چہار چیز تحفۂ است ملتان　　　　گرد، گرما، گدا و گورستان

اسی طرح منشی علی محمد نے بیٹ کے متعلق ایک بیت وضع کر لی تھی اور ہمیں اکثر سناتے رہتے تھے:

چہار چیز تحفۂ است بیٹ　　　　مرچ، تماکو، گمراہ، لیٹ

ملتان بڑے بڑے اولیا، علما اور دوسرے بزرگوں کا شہر رہا ہے، اسے محض گداگروں کا شہر بنا دینا بڑی سخت زیادتی ہے۔ اسی طرح بیٹ کے متعلق جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، وہاں ان کے علاوہ بھی بہت

کچھ تھا۔ بہر حال بیت کے آخر میں جن دو الفاظ کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، یعنی کسر اور لیت، ان سے غالباً پنجاب کے دیگر علاقوں کے لوگ بھی واقف نہیں۔

اٹھارویں صدی کے انگریز شاعر تامس گرے (Gray) نے اپنی مشہور ترین نظم The Elegy Written in a Country Churchyard کا آغاز خاصے رومانی انداز سے کیا ہے:

> The curfew tolls the knell of parting day.
> The lowing herd winds slowly o'er the lea.
> The plowman homeward plods his weary way.
> And leaves the world to darkness and to me

انگلستان کے بھیگے ہوئے موسم میں تھکے ماندے انگریز کسانوں کے مویشیوں کے گرد اڑانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، مگر ہمارے بیت کے تھکے ماندے کسان اپنے مویشیوں اور چھکڑوں سمیت جب سر شام گھر لوٹتے تھے تو کچے راستوں پر اتنی دھول اڑتی تھی کہ شفق کی نیم روشنی میں ٹھیک طور پر کچھ دیکھنا خاصا دشوار ہو جاتا تھا اور یہ بدبخت باریک بھی اتنی ہوتی تھی کہ میدہ بھی کیا ہوتا ہوگا۔ اس گرد کو ہمارے ہاں کسر اکھا جاتا تھا۔

لیت البتہ ذرا زیادہ تفصیل طلب ہے۔

ہمارے ایک بزرگ رشتے دار ہوتے تھے۔ ان کا اسم گرامی نور محمد گوگی تھا۔[1] گوگی ان کے خاندان کی ال تھی۔ ہم سب انھیں بھی میاں جی کہہ کر پکارتے تھے۔ جب میں نے قدرے ہوش سنبھالا، وہ اپنے سر کے بالوں کو وسمے اور داڑھی کو مہندی سے رنگنے لگے تھے۔ وہ امریکا، آسٹریلیا اور معلوم نہیں کون کون سے گھاٹ کا پانی پی کر آئے تھے۔ وہ بڑے حیرت انگیز قصے سناتے رہتے تھے۔ ہم مبہوت ہو کر ان کی غور سے باتیں سنتے رہتے اور سوچتے رہ جاتے تھے کہ اچھا تو دنیا میں یہ کچھ بھی ہوتا ہے۔ میرے بچپن میں بیت میں دیسی گنا کاشت کیا جاتا تھا۔ یہ معشوق کی کمر کی طرح پتلا اور چکیلا ہوتا تھا مگر اتنا بھی چکیلا نہیں کہ سہارن پور (یو پی) کے گنے کا مقابلہ کر سکے جس کے متعلق مشہور تھا کہ اگر اس کے دونوں سرے آپس میں ملا دیے

---

1. قیام پاکستان کے بعد میاں نور محمد گوگی عارف والہ کے قریب ایک گاؤں EB/55 میں اپنے خاندان سمیت آباد ہو گئے تھے۔ میرے بڑے بھائی کے سسرالی رشتے دار بھی وہیں رہتے تھے۔ غالباً 1961 میں بھائی جان نے اپنے ایک کام کے سلسلے میں مجھے وہاں بھیجا۔ وہاں میاں نور محمد گوگی سے بھی ملاقات ہوگی۔ بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ عمر سو سال سے اوپر ہو چکی تھی اور سر کے بال دوبارہ سیاہ ہونے لگے تھے۔ مل کر بہت خوش ہوئے۔ دیر باتیں کرتے رہے اور ڈھیروں دعائیں دیں۔

جائیں، وہ پھر بھی ٹوٹنے کا نہیں۔ اس دیسی گنے کو بیلنے (پیلنا) کے لیے بیلنا بھی بہت پرانی وضع کا ہوتا تھا۔ لکڑی کے دو بھاری بھر کم بیلنوں کو زمین کے متوازی ایک دوسرے کے اوپر معلق کر دیا جاتا تھا۔ دھرا کیسے کام کرتا تھا، کچھ یاد نہیں آ رہا۔ بہرحال ان بیلنوں کی جانب چھوٹے چھوٹے ٹوئے (گڑھے) کھود دیے جاتے تھے۔ دونوں گڑھوں میں ایک ایک آدمی بیٹھتا تھا۔ کماد کے چھوٹے چھوٹے گٹھے بنائے جاتے تھے۔ ایک آدمی اپنی طرف سے گٹھا بیلنوں کے بیچ میں دھکیلتا تھا، باہر آنے پر دوسری جانب کا آدمی اسے پکڑتا اور جب وہ پورا باہر نکل آتا، اسے واپس بیلنوں میں دھکیل دیتا۔ یہ سلسلہ تادیر جاری رہتا تا آنکہ انھیں یقین ہو جاتا کہ گٹھے کے گنوں کا پورا رس نچڑ گیا ہے۔

نور محمد گوگی کوئی زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے مگر دیس دیس گھومنے پھرنے کے بعد ان کی سوچ بہت اونچی ہو گئی تھی۔ وہ لکیر کے فقیر نہیں تھے، چنانچہ نئی نئی چیزوں کو آزمانے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے۔ سیر و سیاحت سے واپس آنے کے بعد ایک روز ان کے کان میں بھنک پڑی کہ لائل پور کے زرعی کالج میں گنے کی ایک نئی قسم دریافت ہوئی ہے۔ اس گنے کو عموماً قاری گنا کہا جاتا تھا۔ اسی گنے کی مختلف اقسام آج بھی پاکستان میں کاشت ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں چینی اسی گنے سے بنتی ہے۔ جس گنے کا شربت اور گنڈیریاں شہروں میں بکتی ہیں اسے پنجابی میں پونا اور اردو میں پونڈا کہا جاتا ہے۔ یہ قاری گنے سے زیادہ موٹا، شیریں اور پولا (خستہ) ہوتا ہے اور اس سے مہنگا بھی ہوتا ہے، چنانچہ اس کی چینی نہیں بنائی جاتی۔

میاں نور محمد گوگی لائل پور گئے اور قاری گنے کے چند گٹھے لے آئے۔

اگر گنا فروری مارچ تک کھیت میں کھڑا رہے، اس کے اوپر لمبے لمبے سٹے بن جاتے ہیں اور ان میں بیج بھی آ جاتا ہے مگر یہ بیج بیکار محض ہوتا ہے، اس سے گنا نہیں اگایا جا سکتا۔ نیا گنا اگانے کے لیے گنے کی پوریں ہی زمین میں دبانا پڑتی ہیں۔ گنے کی پور بڑی احتیاط سے کاٹنا پڑتی ہے تاکہ اس کی گانٹھ پر جو آنکھ (انکھوا) ہوتی ہے، اسے کوئی ضرر نہ پہنچ سکے کیونکہ گنے کی نئی شاخ اسی آنکھ سے پھوٹتی ہے۔ ایک آدمی ہل چلاتا ہے اور دوسرا سیاڑ (شیاڑ) میں پوریں ڈالتا جاتا ہے اور اس کے بعد سہاگہ پھیر کر زمین ہموار کر دی جاتی ہے۔ اگلے سال گنا اگانے کے لیے نیا بیج بونے کی ضرورت نہیں رہتی۔ وڈھ (وہ کھیت جس کی فصل کاٹی جا چکی ہو) کے مُنڈھ (ٹھنٹھ) دوبارہ اُگ آتے ہیں۔

میاں نور محمد گوگی نے اپنی زمین میں قاری گنا بویا اور یہ اتنا بلند ہو گیا کہ "پگڑی سنبھال جٹا" کہنے کو جی چاہتا تھا کہ نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھنے پر اس کے گرنے کا احتمال رہتا تھا۔ آج کل کھیتوں میں جو گنا نظر آتا ہے یہ اس کے مقابلے میں بالکل بونا معلوم ہوتا ہے۔ اس گنے کو دیکھ کر دوسرے کسانوں کا بھی جی للچایا اور

میاں جی کا آدھا کماد کھڑے کھڑے بک گیا۔ انھوں نے باقی بیچنے سے صاف انکار کر دیا کیونکہ وہ اسے خود پیڑنا (بیلنا) چاہتے تھے، تاہم اس گنے کو پرانے دقیانوسی چوبی بیلنے میں نہیں پیلا جا سکتا تھا کیونکہ ایک تو یہ موٹا تھا اور اوپر سے خاصا سخت۔ خوش قسمتی سے ان دنوں فارمی گنے کی دریافت کے ساتھ ہی آہنی بیلنا بھی فروخت کے لیے بازار میں آ گیا۔ میاں نور محمد گوگی یہ بیلنا بھی خرید لائے۔ بیلنا چوبی ہو یا آہنی، اس کا خاص وصف یہ ہے کہ اسے کنویں کی طرح کہیں مستقل طور پر گاڑنے کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ یہ جہاں درکار ہو، وہاں آسانی سے منتقل کیا اور گاڑا جا سکتا ہے اور یوں ایک ہی بیلنا متعدد کسانوں کے کام آ سکتا ہے۔ آہنی بیلنا تین بیلنوں پر مشتمل ہوتا ہے اور ان بیلنوں کو زمین کے متوازی نہیں بلکہ عموداً نصب کیا جاتا ہے۔ انھیں بھی دھرے کی مدد سے بیل ہی کھینچتے ہیں۔ اس بیلنے میں گنا ڈالنے کے لیے پولا نہیں بنایا جاتا، صرف ایک شخص ایک ایک کر کے گنے بیلنوں کے اندر دھکیلتا رہتا ہے۔ گنا صرف ایک ہی بار پستا ہے مگر رس تقریباً پورے کا پورا نچڑ جاتا ہے۔ پھوک[1] ایک طرف گرتا رہتا ہے اور رس ایک نالی کے ذریعے پیپے [عموماً بناسپتی گھی کے خالی پیپے استعمال ہوتے تھے] میں انڈلتا رہتا ہے۔

جب رس سے تین چار پیپے بھر جاتے ہیں، انھیں بہت بڑے آہنی کڑاہے میں انڈیل دیا جاتا ہے۔ جس بھٹی پر یہ کڑاہا چڑھایا جاتا ہے، وہ عارضی طور پر بیلنے کے قریب ہی زمین میں کھودی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں اس میں کماد کی کھوری، گنے کا سکھایا ہوا پھوک، کاہی اور بعض اوقات ٹاہلی (شیشم) یا کِکر (کیکر) کی چھٹریاں جلائی جاتی تھیں۔ جب رس کھولنے کے قریب آتا، اس پر میل کی گہری جھاگ (پنجابی: جھگ) بنے لگتی۔ اس جھاگ کو ایک بڑے کڑچھے سے اتار لیا جاتا۔ رس کی مزید صفائی کرنے کے لیے اس میں گاؤزبان[2] ڈالا جاتا۔ بعد میں ایک قسم کا میٹھا سوڈا آ گیا جسے ہمارے ہاں کے کسان رنگ کاٹ

---

1. یہ پھوک بہت کام کی چیز ہے۔ برازیل میں جو اصلاً گنے کا گھر ہے، اس سے اخباری کاغذ بنایا جاتا ہے۔ جب حنیف رامے پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے، انھوں نے برازیل کی ٹیکنالوجی کی مدد سے کمالیہ کی شوگر مل کے پھوک سے اخباری کاغذ بنانے کا منصوبہ بہت محنت سے تیار کیا اور منظوری کے لیے مرکزی حکومت کو بھیج دیا۔ دریں اثنا وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو حنیف رامے سے ناراض ہو گئے اور منصوبہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ ضیا الحق کے دور میں اس کا دوبارہ احیا ہوا۔ اب کے وہ ایک بیوروکریٹ کی چشم عتاب کا شکار ہو گیا۔ آفتاب احمد خان نام کے دو بڑے بیوروکریٹ تھے۔ ان میں ایک آفتاب احمد خان اردو کے جانے پہچانے نقاد اور غالب شناس تھے۔ دوسرے آفتاب احمد خان کو بھی غالب شناسی کا دعویٰ تھا اور ریٹائرمنٹ کے بعد وہ انجمن ترقی اردو کے صدر بھی بن گئے تھے۔ اخباری کاغذ کے منصوبے کو سبوتاژ کرنے والے یہی دوسرے آفتاب احمد خان تھے۔ ان کے سامنے ضیا الحق کی کوئی پیش نہ گئی۔
2. اصل چیز غالباً گاؤزبان نہیں تھی۔ مجھے صحیح یاد نہیں آ رہی اور بتانے والا کوئی رہا نہیں۔ میں نے محض خانہ پری کے لیے یہ نام لکھ دیا ہے۔ قارئین سے معذرت خواہ ہوں۔

کہتے تھے۔ یہ اصلاً ایک قسم کا کیمیکل تھا اور ہوتا بھی مضرِ صحت ہے مگر اس سے گڑ یا شکر کا رنگ خاصا نکھر جاتا ہے، اس لیے کسان اسے ترجیح دیتے تھے اور غالباً اب بھی دیتے ہیں۔

کھولنے پر گنے کے رس کا فالتو پانی بھاپ بن کر اڑنے لگتا اور رس زرد شیرہ بننے لگتا۔ دراصل رنگ کاٹ اسی موقع پر ڈالا جاتا تھا۔ جب یہ شیرہ خاصا گاڑھا ہو جاتا، اسے ایک چوبی چوکور کڑاہے میں انڈیل دیا جاتا۔ اس کڑاہے کو گنڈ کہا جاتا تھا اور بعض علاقوں میں اب بھی یہی لفظ مروج ہے۔ ٹھنڈا ہونے پر ہاتھوں سے گڑ کی بھیلیاں یا چھوٹے سائز کی پیسیاں بنائی جاتیں۔ اگر گڑ محض کھانے کے لیے بنانا مقصود ہو، پھر اس میں کشمش، گری یا دوسرا خشک میوہ گنڈ پر شیرے میں ملا دیا جاتا ہے۔

میاں نور محمد گوگی نے ایک کام اور بھی کیا۔ وہ کھانڈ (پنجابی: کھنڈ) بنانے کی مشین بھی لے آئے۔ یہ مشین چارہ کاٹنے کی مشین کی طرح ہاتھ سے چلتی تھی۔ اس مشین کی ایک جانب شکر یا گڑ بھرا جاتا۔ جب یہ مشین چلتی، ایک طرف سے چینی نکلنے لگتی۔ [یہ دیسی چینی کہلاتی تھی۔ جب جنگِ عظیم کے دوران میں ہر چیز عنقا ہونے لگی اور جاوا کی چینی کی درآمد بند ہو گئی، اس دیسی چینی کی مانگ بہت بڑھ گئی تھی] اور دوسری جانب سے ایک گہرا لیس دار مادہ۔ اسی مادے کو ہمارے ہاں لیٹ کہا جاتا تھا۔ حقہ پینے کے شوقین دیسی تمباکو کو اچھی طرح کوٹنے کے بعد اس لیٹ کو اس میں ملایا کرتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ حقے کا بہترین تمباکو اسی طرح بنتا ہے۔

تمباکو دو طرح کا ہوتا ہے: ایک دیسی اور دوسرا ولایتی۔ ولایتی تمباکو کا پودا آدمی کے کندھوں تک پہنچ جاتا ہے، شاید اس سے بھی اونچا۔ اس کے پتے سگریٹ، سگار وغیرہ بنانے میں استعمال ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں دیسی تمباکو بہتات سے ہوتا تھا۔ اس کو کاشت کرنے کے لیے پہلے دھان یا بعض پھولوں کی طرح پہلے پنیری اگانا پڑتی ہے۔ جب یہ پنیری ذرا بڑی ہو جاتی ہے، اس کے پودے مٹی سمیت اکھاڑ کر، تاکہ جڑیں ننگی نہ ہونے پائیں، کھیت میں خاص مینڈھیں (پنجابی: وٹ یا بنی) بنا کر ان پر ایک ایک کر کے کھرپی (پنجابی: رنبی) سے زمین قدرے کھود کر لگائے جاتے ہیں۔ دیسی تمباکو کے کھیت میں کسی غیر عادی شخص کے لیے گزرنا خاصا دشوار ہوتا ہے کیونکہ اس کی کڑواہٹ (کڑواہٹ) ناک میں گھسی جاتی ہے لیکن کسانوں کو اس میں بار بار چلنا پڑتا ہے کیونکہ پتوں اور ڈنٹھل کے سنگم پر ایک قسم کی ضرر رساں کونپل اگ آتی ہے جسے صرف ہاتھوں سے توڑ کر ختم کیا جا سکتا ہے۔

اس تمباکو کو ڈنٹھلوں سمیت کاٹا جاتا ہے۔ ابھی یہ نیم خشک اور مرطوب ہوتا ہے کہ اسے بٹ کر چھوٹے چھوٹے رسے بنائے جاتے ہیں۔ یہی رسے بازار میں فروخت ہوتے ہیں۔ انھیں رسوں کو ادھلی

میں کوٹ کر اور لیٹ ملا کر حقے کا تمبا کو بنایا جاتا ہے۔ شہروں میں لوگ گڑ سے بھی کام چلا لیتے ہیں۔

# 9

اپریل 1938 کا مہینہ آ گیا۔ ہم چوتھی سے پانچویں جماعت میں پہنچ گئے۔ اب ہمارے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ پڑھائی پرجیاں میں ہی جاری رکھی جائے یا اسلامیہ ہائی سکول انبیا میں داخلہ لیا جائے۔ ہمارے تمام ہم جماعتوں میں صرف عبدالعزیز مستقل مزاج نکلا۔ اس نے پرجیاں میں تعلیم جاری رکھنے سے انکار کر دیا اور ننکل انبیا چلا گیا۔ باقی ہم سب لوگ مقامی مڈل سکول میں داخل ہو گئے۔ چونکہ وہ ورنیکلر سکول تھا، اس لیے یہاں انگریزی نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ پھر جب ہم نے آٹھویں جماعت پاس کر لی اور ننکل انبیا سکول میں داخل ہوئے، ہمیں انگریزی پڑھنے کے لیے جونیئر اور سینئر کلاسیں پڑھنا پڑیں اور یوں مفت میں دو سال ضائع کرا بیٹھے جس کا مجھے اب تک افسوس ہوتا ہے۔

مڈل سکول گاؤں سے کوئی ایک میل دور تھا۔ اس کی U شکل کی عمارت پختہ اینٹوں سے بنی ہوئی تھی اور دیکھنے میں خاصی خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ U کے درمیان جو خالی جگہ تھی، اس میں گھاس لگی ہوئی تھی جسے سکول کا چوکیدار کھیپا تراشتا رہتا تھا۔ دراز قد اور ٹھوس جسم کا مالک کھیپا ذات کا چوہڑا تھا لیکن سکول کا وہ ایک قسم کا مختار کل تھا۔ اسے دراصل factotum (مستخدم ہمہ کار نوکر) کہا جانا چاہیے۔ سکول کے تمام کمروں کی چابیاں اسی کے پاس ہوتی تھیں۔ لان کی گھاس وہ تراشتا تھا، پاس کی کیاریوں میں پھول وہی اگاتا اور سنبھالتا تھا۔ سکول میں ایک کنواں بھی تھا۔ اس کے بیل کو چارہ کھلانا، رات کو باڑے میں بند کرنا اور بوقت ضرورت کنویں سے پانی نکالنے کے لیے جوتنا سب کھیپا ہی کے ذمے تھا۔ سکول کے ساتھ کچھ فالتو زمین بھی تھی۔ اس میں وہ اساتذہ کے لیے سبزیاں بھی اگاتا تھا۔ تاہم جب مٹر کاشت کیے جاتے تو ان کی بیلوں کو پاس کی چھڑیوں پر چڑھانے اور ان کی پھلیوں کو توڑنے کے کام اساتذہ وہم طلبا سے لیتے۔

پانچویں جماعت میں تختی ہمارا ساتھ چھوڑ گئی اور اس کی بجائے ہمیں کاپیاں خریدنا پڑیں۔ یہ کاپیاں دو قسم کی ہوتی تھیں۔ ایک کھردرے اور معمولی کاغذ کی، ان پر ہم پنسل سے رف (rough) کام کیا کرتے تھے، مثلاً کلاس میں اساتذہ ریاضی کے جو سوال کرتے تھے، انھی کاپیوں پر کیے جاتے تھے۔ ویسے اس مقصد کے لیے سلیٹ بھی کام آ جاتی تھی۔ مستقل نوعیت کا کام مثلاً جواب مضمون لکھنا، گھر سے استاد کے ملاحظے کے لیے ریاضی وغیرہ کے سوال حل کر کے لانا وغیرہ، بڑھیا کاغذ کی کاپیوں پر کیا جاتا تھا۔ پانچویں جماعت

کے لیے جو کاپیاں اور اردو، حساب، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ کی جو کتابیں خریدی گئیں، مجھے اب بھی یاد ہے، ان کی کل قیمت پندرہ روپے آنے بنی تھی اور ان میں ایک دو HB2 کی پنسلیں بھی شامل تھیں۔

پاکستان میں جو پنسلیں بنتی ہیں، ان میں کوئی درجہ بندی نہیں ہوتی اور بال پوائنٹ کے رواج نے پنسل کا استعمال ویسے بھی بہت کم کر دیا ہے۔ ایک زمانے میں جب پنسل بہت چلتی تھی، سرمے کی درجہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کو بہت مشکل پیش آتی تھی کیونکہ کسی پنسل کا سرمہ بہت سخت ہوتا تھا اور کسی کا بہت نرم۔ Nicolas- Jaques Conte نے، جو مصور، کیمیادان، ماہر فزکس، غباروں میں پرواز کرنے والا اور موجد تھا، پہلی بار 1795 میں پنسل کا سرمہ تیار کرنے کا طریقہ وضع کیا۔ اس نے گریفائٹ اور مہین چکنی مٹی کا ملغوبہ تیار کیا۔ اسے ایک لمبے سلنڈر میں بھرا اور تنور میں پکایا۔ اس سے پنسل کے سرمے میں سختی پیدا ہو گئی۔ نرم سرمے کے لیے B کی علامت استعمال کی گئی جو اصلاً black کا مخفف ہے۔ سخت سرمے کے لیے علامت H برتی گئی جو hard کا مخفف ہے۔ پھر درجہ بندی کے لیے BB اور HH وغیرہ کی اصطلاحیں وضع کی گئیں۔ لیکن یہ درجے بڑھتے گئے اور حروف کا استعمال بارگراں ہو گیا۔ چنانچہ حروف کی بجائے اعداد کا رواج چل پڑا۔

انگریزی کمپنیاں جو پیمانے استعمال کرتی ہے، وہ پورے کا پورا حسب ذیل ہے۔

9B 8B 7B 6B 5B 4B 3B 2B B HB FH 2H 3H 4H 5H 6H 7H 8H 9H

F اور H کیا ہیں، یہ کوئی نہیں بتاتا۔ HB2 درمیانے درجے (grade) کی پنسل ہے اور یہی عام استعمال میں آتی ہے۔ تاہم زیادہ سخت پنسلیں انجینئر اور نقشہ نویس اور نرم پنسلیں آرٹسٹ استعمال کرتے ہیں۔

شیکسپیئر کی مشہور زمانہ لائن جس کا غالباً انگریزی ادب میں سب سے زیادہ حوالہ دیا جاتا ہے، ہم سب کو معلوم ہے:

To be or not to be

انگریز شاعر Spike Milligan نے اپنی بچوں کے لیے ایک نظم میں اس پر یہ گرہ لگائی ہے:

Said Hamlet to Ophelia,

I'll draw a sketch of thee,

What kind of pencil shall I use?

2 B or not 2B?

# 10

پنجاب میں اپریل کا مہینا کسانوں کے لیے بہت اہم ہوتا ہے۔ اس کے دوران میں گندم کی کٹائی اور کماد کی بوائی ہوتی ہے۔ مارچ کے اواخر اور اپریل کے شروع میں خربوزے، تربوز، تریں (ککڑیاں) اور گرما کی کدو، بھنڈی، توری، ٹینڈے، کریلے جیسی سبزیاں کاشت کی جاتی ہیں۔

ہیٹ میں توت بہت بہتات سے ہوتے تھے۔ توت کو آپ شہتوت کا چھوٹا بھائی کہہ سکتے ہیں۔ شہتوت کا پھل جسامت میں زیادہ لمبا اور ذائقے میں زیادہ میٹھا ہوتا ہے اور شہتوت ہی کہلاتا ہے۔ توت کے پھل کو گوہل کہا جاتا تھا۔ [صحیح ہجے لکھنا بہت مشکل ہے، ہ کی آواز تقریباً نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔] گوہلیں جسامت میں شہتوت سے تقریباً نصف ہوتی ہیں، مٹھاس بھی ان میں نسبتاً کم ہوتی ہے اور بعض میں تو بالکل نہیں ہوتی۔ توت کے پتوں، نرم و نازک شاخوں اور گوہلوں پر زیادہ تر ریشم کے کیڑوں کو پالا جاتا ہے۔ ہمارے گاؤں میں حافظ عطا محمد ریشم کے کیڑوں کی پرورش کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے گھر کا چوبارا اس مقصد کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ معلوم نہیں وہ ریشم کے کیڑوں کے انڈے کہاں سے لاتے تھے مگر جب ان انڈوں سے ننھے منھے کرم (لاروا/Larva) نکلتے تو وہ انھیں توتوں کی چھوٹی بڑی شاخوں پر چھوڑ دیتے جنھیں وہ تازہ تازہ درختوں سے کاٹ کر لائے ہوتے تھے۔ کیڑے ان شاخوں اور ان کے پتوں پر پلتے رہتے۔ وقتاً فوقتاً نئی شاخوں کا اضافہ ہوتا رہتا۔ تقریباً ایک ماہ بعد ان کیڑوں کا رنگ زرد پڑنے لگتا اور ان کے مونہوں سے ایک قسم کا لعاب نکلنے لگتا۔ یہی لعاب اصلی ریشمی دھاگے کے واحد تار (strand) میں تبدیل ہوتا اور آہستہ آہستہ کیڑے کے پورے جسم کو لپیٹ میں لے لیتا۔ اس پوری طرح لپٹے ہوئے تار کو انگریزی میں cocoon اور اردو میں ابریشم کا کویا کہا جاتا ہے۔ کیڑا کوے کے اندر تقریباً تین ہفتے رہتا ہے۔ منہ سے ایک خاص قسم کا لعاب نکالتا ہے جس سے ریشم کے تار کا کچھ حصہ پگھل جاتا ہے اور وہ باہر نکل آتا ہے۔ اس موقع پر حافظ صاحب سب کیڑوں کے تار اکٹھے کر لیتے تھے۔ کیڑا اپنے کوے سے باہر نکلنے کے بعد کچھ اس طرح کا ہو جاتا تھا جیسے اس نے اپنی کینچلی اتار دی ہو۔ باہر نکلنے کے بعد پہلے وہ منجھلی شکل (pupa) اختیار کرتا تھا اور پھر پتنگا بن جاتا تھا۔ کوے سے باہر نکلنے کے بعد سب سے پہلا کام وہ یہ کرتا ہے کہ سرخی مائل بھورا "پیشاب" کرتا ہے، وہ کچھ کھا سکتا ہے نہ پی، مگر ایک دن وہ جفتی ضرور کرتا ہے اور پانچ روز بعد مر جاتا ہے۔ مادہ ایک دن میں 200 سے 500 تک انڈے دیتی ہے۔ حافظ صاحب ان انڈوں کو عموماً ضائع ہونے دیتے تھے۔

توتوں پر جب گولیں پکنے کے قریب ہوتی تھیں، ان پر تلئیر یلغار کر دیتے تھے۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ تلئیر پہاڑوں سے آتے ہیں لیکن وہ آتے صرف موسم بہار میں تھے اور جب آتے تھے تو بلا مبالغہ لاکھوں کی تعداد میں آتے تھے کیونکہ ایک ایک درخت پر بیک وقت درجنوں گولوں پر ٹھونگے مارتے نظر آتے تھے۔ ان تلئیروں کا شکار کرنے کا عام رواج تھا مگر اس مقصد کے لیے کوئی بندوق یا دوسرا آتشیں ہتھیار استعمال نہیں ہوتا تھا۔ ہر گھر میں کم از کم ایک جال ضرور ہوتا تھا۔ اس جال کو لپیٹ کر U کی شکل میں زمین میں دبا دیا جاتا تھا اور ایک موٹی لمبی رسی U کی درمیانی ڈنڈی کے ساتھ باندھ دی جاتی تھی۔ زمین میں دبے ہوئے جال کے عین بیچ میں بے شمار گولیں بکھیر دی جاتی تھیں۔ جال کا مالک ذرا پیچھے ہٹ کر ایک چارپائی کی اوٹ میں، جسے اس کے ایک لمبے بازو پر کھڑا کر دیا جاتا تھا، بیٹھ جاتا تھا۔ جب تلئیروں کو نیچے تنی سجائی دعوت نظر آتی، وہ لالچ میں آ جاتے اور درجنوں کی تعداد میں نیچے اتر کر گولوں پر ٹھونگے مارنے لگتے۔ شکاری انھیں غافل پا کر رسی اپنی طرف کھینچ لیتا اور جال کھل جاتا۔ متعدد تلئیر تو اڑنے میں کامیاب ہو جاتے مگر پھر بھی دس پندرہ تو ضرور پھنس جاتے۔ کسان شکاری کے مزے ہو جاتے۔ خود بھی کھاتا اور دوستوں عزیزوں میں بھی بانٹتا۔

جال بٹیر (پنجابی: بٹیرا) پکڑنے کے بھی کام آتے تھے۔ موسم بہار میں بٹیر زیادہ تر گندم کی فصل پر حملہ آور ہوتے تھے۔ انھیں پکڑنے کے لیے عموماً فصل کی کٹائی کے دوران میں کھیت کے آخری سرے پر ایک طرف جال لگا دیا جاتا۔ جوں جوں کٹائی کرنے والے آگے آگے بڑھتے، توں توں بٹیر بھی آگے آگے کھسکتا جاتا (یا کھسکتے جاتے) تا آنکہ وہ اس کونے میں پہنچ جاتا (یا پہنچ جاتے) اور بالآخر جال میں پھنس جاتا (یا پھنس جاتے)۔ بچ نکلنے میں شاید ہی کوئی کامیاب ہوتا۔

بٹیر دوسرے موسموں میں بھی پکڑے جاتے تھے لیکن طریق کار مختلف ہوتا تھا اور عموماً چھوٹی قامت کی فصلوں پر زیادہ کارآمد ثابت ہوتا تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ دو آدمی ایک لمبی رسی کو ایک ایک طرف سے پکڑتے تھے اور اسے فصل کے اوپر پھیرتے جاتے تھے اور ساتھ ساتھ ہوکرا بھی لگاتے جاتے تھے۔ اگر فصل میں کوئی بٹیر ہوتا تو وہ گھبرا کر آگے کھسکنے لگتا تھا اور کھیت کے آخر میں جال میں پھنس جاتا تھا جو پہلے ہی وہاں لگا ہوتا تھا۔ بعض لوگ ایک خاص قسم کا بٹیر پالتے اور سدھاتے تھے۔ اسے بلاوا کہا جاتا تھا۔ کھیت کے اختتام پر جہاں جال زمین کے اوپر معلق ہوتا تھا، بلاوے کا پنجرہ اس کے قریب رکھ جاتا۔ بلاوا اپنے پنجرے میں خاص انداز سے غٹرغوں غٹرغوں کرتا جیسے اپنے جوڑی دار کو بلا رہا ہو۔ اگر فصل میں کوئی بٹیر ہوتا تو وہ اس آواز کی طرف لپکتا اور یوں جال میں پھنس جاتا۔

# 11

اپریل کے آغاز میں جامنوں اور آموں کے درختوں پر بُور (مور) آتا۔ یہ بور گچھوں کی صورت میں آتا تھا اور یہی بڑھ کر پھلوں کی شکل اختیار کرتا تھا۔ آموں کا بور جب بڑا ہوتا اور پھل بنتا تو یہ پھل اپنی چھوٹی شکل میں انبی کہلاتا تھا۔ [پنجابی میں آم کو انب کہا جاتا ہے۔] اگر انبیوں کو یونہی چھوڑ دیا جاتا، تو وہ آم بن جاتیں لیکن بعض اوقات انھیں توڑ بھی لیا جاتا تھا یا بعض آندھی میں خود ہی گر جاتی تھیں۔ ابھی ان کے اندر گٹک (گٹھلی) نہیں بنی ہوتی تھی۔ ان پر نمک اور سیاہ مرچ چھڑک کر کھایا بھی جاتا تھا۔ ان کا ذائقہ قدرے ترش ہوتا تھا مگر کھانے میں مزہ بہت آتا تھا۔ ان کا اچار بھی بنایا جاتا تھا مگر آم کے اچار کے برعکس انبیوں کا اچار زیادہ دیر محفوظ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ یہ یا تو سوکھ جاتا تھا یا پھر خراب ہو جاتا تھا۔

دیہات میں زیادہ تر دیسی آم اگایا جاتا تھا۔ آم خواہ دیسی ہو یا پیوندی، اس کی گٹھلی سے جو پودا پھوٹتا ہے، وہ اصلاً دیسی آم ہی ہوتا ہے۔ [آم کی گٹھلی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ برسات کے موسم میں آپ اسے زمین میں دبائیں یا نہ دبائیں، ویسی ہی پڑے رہنے دیں، یہ ہر دو صورت میں پھوٹ آتی ہے۔] اسی دیسی آم کو پیوند لگا کر پیوندی آم کی مختلف اقسام۔ لنگڑا، دسہری، انور رٹول وغیرہ۔ وجود میں لائی جاتی ہیں۔ پیوندی آم دیسی آم کے مقابلے میں جسامت میں بہت بڑا ہوتا ہے۔ یہ عموماً میٹھا ضرور ہوتا ہے مگر اس کا سب سے بڑا نقص یہ ہوتا ہے کہ روئی کی طرح یہ بھی پیٹ بھرتا ہے۔ پاکستان میں دیسی آم سے عموماً اچار اور مربے بنائے جاتے ہیں لیکن دوآبہ بست جالندھر میں یہ کھایا بھی بہت شوق سے جاتا تھا۔ ضلع ہوشیار پور میں شوالک کی پہاڑیوں کی تلہٹیوں میں اس کی وسیع پیمانے پر کاشت ہوتی تھی [اور شاید اب بھی ہوتی ہو] لیکن ان آموں کی سب سے بڑی منڈی جالندھر میں تھی۔ وہاں اس کی پانچ سات سیر کی ٹوکری چار پانچ آنے میں ملتی تھی اور اس کی فروخت بے تحاشا ہوتی تھی۔

دیسی آم کا، اگر میٹھا ہو، سب سے بڑا وصف یہ ہوتا ہے کہ آپ خواہ کتنا ہی کھا لیں، آپ کو قطعاً محسوس نہیں ہوتا کہ یہ آپ کے معدے پر بوجھ بن گیا ہے کیونکہ یہ کھایا نہیں، چوسا جاتا ہے۔ غالب نے جب یہ خواہش کی تھی کہ آم میٹھا ہو اور بہت ہو، تو وہ شاید اسی آم کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

ہمارے علاقے میں دیسی آم بہت شوق سے کھایا جاتا تھا۔ کھاتے پیتے لوگ جالندھر منڈی سے ٹوکریوں کی ٹوکریاں خرید کر لاتے تھے، گھر والوں کو بھی کھلاتے تھے اور پارٹیاں بنا کر بھی کھاتے تھے مگر ڈھیروں آم چوسنے کے بعد نمکین کچی لسی ضرور پیتے تھے [اگر دودھ میں پانی ملا دیا جائے تو یہ کچی لسی بن جاتا ہے] کیونکہ عام خیال یہ تھا کہ آم گرمی کرتا ہے اور اس کا بہترین توڑ کچی لسی ہے۔

# 12

اپریل کا مہینا یوں بھی اہم ہوتا تھا کیونکہ اس مہینے میں گندم کی فصل پک کر تیار ہو جاتی تھی اور اس کا سنہری رنگ کھیتوں میں دل آویز سماں باندھ دیتا تھا۔ کسان ہر دم دعائیں مانگتے رہتے تھے کہ ایک ڈیڑھ ماہ بارش نہ ہو اور اولے (پنجابی: گڑے) نہ پڑیں۔ خالی بارش کھڑی فصل کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچاتی تھی، البتہ اولے اس کا ستیاناس مار دیتے تھے۔ اکثر سٹے گر پڑتے اور کسان کی چھ ماہ کی محنت پر پانی پھر جاتا تھا۔ [گندم کی بوائی کاتک [پنجابی: کتا: اکتوبر/نومبر] میں ہوتی تھی۔] بارش دو صورتوں میں گندم کی فصل کو نقصان پہنچاتی تھی۔ مارچ کے مہینے میں گندم کے پودے اپنا قد کاٹھ تو نکال چکے اور ان کے سٹوں میں دانے بھر چکے ہوتے تھے مگر پودے اور سٹے دونوں ابھی ہرے ہوتے تھے اور اگر تیز بارش کے ساتھ آندھی بھی چل پڑتی، پھر ان کا خدا حافظ ہوتا تھا۔ نازک پودے زمین پر سجدہ ریز ہو جاتے اور کبھی دوبارہ سیدھے کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کا دانہ سٹوں کے اندر بننا تو شروع ہو چکا ہوتا تھا مگر ان کے زمین بوس ہونے اور سورج کی روشنی کے پوری طرح پہنچ نہ سکنے کے باعث دو یا تو پولا پولا یا سوکھا سوکھا رہ جاتا، اس طرح اس کے اندر نشاستہ پوری طرح نہ بن پاتا اور وہ کھانے کے تقریباً قابل نہ رہتا۔

بارش اگر کٹائی کے بعد ہوتی اور گندم کے پولے ابھی ڈھیر کی صورت میں کھیتوں میں پڑے ہوتے، پھر اس کے گلنے سڑنے کا احتمال پیدا ہو جاتا۔ ہاں، اگر فوراً دھوپ نکل آتی، پھر اس کے پولوں کو کھیت میں بچھا کر نقصان کسی قدر کم کیا جا سکتا تھا۔

کھڑی گندم کو گندم جیسی ایک بوٹی بھی خاصا نقصان پہنچاتی تھی بشرطیکہ اسے اکھاڑ کر تلف نہ کر دیا جاتا۔ اس بوٹی کو بیٹ میں گنڈیل کہا جاتا تھا۔ یہاں شاید اسے ڈنبی تنی یا جوی کا نام دیا جاتا ہے۔ آج کل تو اس بوٹی کو جڑی بوٹیاں تلف کرنے والی ادویات چھڑک کر تلف کر دیا جاتا ہے مگر جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں، تب اسے ہاتھ سے اکھاڑنا پڑتا تھا مگر اسے اکھاڑا تب جا سکتا تھا جب یہ گندم کے سٹے بنانے کے مرحلے پر قد کاٹھ میں گندم ہی کے برابر ہو جاتی تھی، اس سے پہلے اس کی پہچان تقریباً ناممکن ہوتی تھی۔ بڑی ہونے پر اس کی جڑ کے عین اوپر اس کے تنکے کا کچھ حصہ گلابی ہو جاتا تھا اور یوں اس کی پہچان ممکن ہو جاتی تھی۔ سارے کھیت میں گھوم پھر کر ایک ایک پودے کا جائزہ لے کر اس کا تلف کرنا کسان کے لیے کتنا مشکل ہوتا ہوگا، آپ اس کا اندازہ خود بھی کر سکتے ہیں۔

یکم بیساکھ بیساکھی (پنجابی: وساکھی) کا دن ہوتا ہے۔ یہ دن ہمیشہ 13 اپریل کو آتا تھا اور اب بھی 13 اپریل ہی کو آتا ہے۔ اگرچہ پنجاب کے اکثر دیہاتی علاقوں میں اسے موسمی تہوار کے طور پر بڑے جوش و خروش

سے منایا جاتا تھا اور بھنگڑے ڈالے جاتے تھے کیونکہ اس وقت تک گندم کی فصل پک کر تیار ہو چکی ہوتی اور کٹائی کی منتظر ہوتی تھی، تاہم سکھوں کے نزدیک اس کی مذہبی اہمیت بھی تھی کیونکہ یہی وہ دن تھا جب سکھوں نے بحیثیت قوم خالصہ جنم لیا تھا۔ یہ تب بھی مشرقی پنجاب کے شہروں تلونڈی صابو [جہاں سکھوں کے آخری گورو گورو گوبند سنگھ نے نو ماہ قیام کیا تھا اور سکھوں کی مذہبی کتاب گورو گرنتھ کی تدوین کی تھی]، انند پور صاحب [جس کے گردوارے میں خالصہ نے جنم لیا تھا]، امرتسر کے گولڈن ٹمپل (دربار صاحب) میں، مغربی پنجاب میں حسن ابدال کے گردوارے پنجہ صاحب [جہاں سکھ مت کے بانی گورو نانک کے ہاتھ کے پنجے کا نشان موجود ہے] اور ننکانہ صاحب [جہاں گورو نانک کی ولادت ہوئی تھی] میں منایا جاتا تھا اور اب بھی منایا جاتا ہے۔

بیٹ میں چونکہ ہمارا سکھوں سے کوئی خاص واسطہ نہیں پڑتا تھا، اس لیے میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ وہاں جو تھوڑے بہت سکھ موجود تھے، وہ یہ تہوار مناتے تھے یا نہیں۔ البتہ مسلمان کسانوں کے لیے یہ واڈی[1] کے آغاز کا دن ہوتا تھا۔ [سکھ اپنی واڈی 14 اپریل، 2 بیساکھ کو شروع کرتے تھے۔] کسان عام طور پر اپنی فصل کی کٹائی خود ہی کرتے تھے تاہم بعض، جن کی زمین قدرے زیادہ ہوتی تھی، یہ جزوں یا چماروں کی دیہاڑی دار مزدوروں کی حیثیت سے خدمات حاصل کر لیتے تھے۔ اگر کسی کسان کے گھر میں فوتیدگی ہو جاتی، پھر وہ اپنی واڈی خود نہیں کرتا تھا بلکہ گاؤں کے دوسرے لوگوں کی مدد حاصل کر لیتا۔ اسے منگ لینا کہا جاتا تھا۔ لوگ برضا و رغبت اس کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ وہ انھیں دیتا دلاتا کچھ نہیں تھا، صرف اچھا کھانا ضرور کھلاتا تھا اور بعض موقع کا فائدہ اٹھا کر کچی بھی پی جاتے تھے۔

گندم کی کٹائی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ فصل صرف پک ہی نہ چکی ہو بلکہ اس کے تنکے اچھے خاصے سوکھ بھی چکے ہوں کیونکہ جن پودوں میں ابھی رطوبت موجود ہو، ان کی کٹائی ذرا مشکل ہوتی ہے۔ دھوپ کا خوب چمکنا بھی لازمی ہوتا ہے کیونکہ دھوپ جتنی زیادہ چمکتی ہو، کٹائی اتنی ہی آسان ہو جاتی ہے۔ دھوپ کی شدت سے بچنے کے لیے واڈے اپنے سر خوب اچھی طرح ڈھانک لیتے اور چہروں پر ڈھاٹے باندھ لیتے تھے۔

واڈی دن بھر جاری رہتی۔ شام کو کٹی ہوئی گندم کی بھریاں (پولے) بنائی جاتیں اور انھیں ڈھیر کی صورت میں اکٹھا کر دیا جاتا۔ کٹی ہوئی گندم کئی دن دھوپ میں سوکھتی رہتی تا آنکہ یہ بالکل خشک ہو جاتی۔

---

1۔ واڈی = کٹائی۔ واڈا = کٹائی کرنے والا۔ وڈنا = کٹائی کرنا۔ واڈھ = وہ کھیت جس کی فصل کاٹی جا چکی ہو اور اب وہاں اس کے صرف مڈھ موجود ہوں۔

تب اس کی گہائی شروع ہوتی۔

جس کھیت میں گہائی کی جانا ہوتی، پہلے اس میں ہل چلا کر کیاروں کی مینڈھیں (پنجابی: وٹیں) توڑی جاتیں، پھر اسے چاہی پانی سے لبالب بھرا جاتا اور پانی سے اس بھرے ہوئے کھیت پر سہاگہ پھیرا جاتا تاکہ نیچے کی زمین بالکل ہموار ہو جائے۔ پانی کے خشک ہونے پر اسے پڑ (پ ڑ) کہا جاتا تھا۔ انگریزی میں آپ اسے threshing field کہہ سکتے ہیں۔

گہائی کے لیے جو اوزار استعمال ہوتا تھا، اسے پھلا کہا جاتا تھا۔ اسے کسان خود ہی بناتے تھے۔ پھلا بنانے کے لیے کسی ٹاہلی (شیشم) کے درخت سے دوشاخہ کاٹا جاتا تھا۔ اس دوشاخے کے مابین جو خاصا بڑا خلا ہوتا تھا، اس میں ٹاہلی کی ہی مزید شاخوں کو آپس میں اچھی طرح گوندھ دیا جاتا، اس کا وزن مزید بڑھانے کے لیے ان شاخوں پر گھوکی ہوئی گندم پھیلا دی جاتی اور موٹی رسی سے شاخوں کے ساتھ باندھ دی جاتی۔ لیجیے، پھلا تیار ہو گیا۔ دوشاخے کے جوڑ پر ایک موٹا رسا باندھ دیا جاتا اور پھلا چلانے سے پہلے اسے بیلوں کے جوے (پنجابی: جولا) سے منسلک کر دیا جاتا۔

گہائی سے پہلے، پڑ میں ایک گول دائرہ بنایا جاتا جس کے ارد گرد پولے کھول کر گندم بچھا دی جاتی۔ بیلوں اور پھلے نے اس دائرے کے گرد بچھی ہوئی گندم کے اوپر چلنا اور اسے کچلنا اور توڑنا مروڑنا ہوتا تھا۔

گہائی سورج کے خاصا بلند ہونے پر شروع ہوتی کیونکہ دھوپ جتنی زیادہ تیز ہوتی، گہائی اتنی ہی آسان ہوتی۔ بیلوں کو قابو میں رکھنے اور انھیں صحیح سمت میں چلانے کا فریضہ جس شخص کے ذمے ہوتا، وہ دھوپ کی شدت سے اپنا بچاؤ کرنے کے لیے سر پر صافہ اور اکثر منہ پر ٹھاٹھا باندھ لیتا۔ جب درجہ حرارت چالیس درجے سے اوپر جا رہا ہو، بیلوں کو ہنکانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا تھا۔ ہنکاوے اور بیلوں کی دشمن صرف دھوپ ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ جب پھلے سے گندم کے تنکے ٹوٹتے تھے، وہ ایک قسم کے کانٹے بن جاتے تھے اور جب پاؤں اور ٹانگوں میں چبھتے تھے، سخت چبھن محسوس ہوتی تھی لیکن ہنکاوا دنیا و مافیہا سے بے خبر یا بے نیاز اپنے کام میں مگن رہتا تھا۔ اسے نہ شکایت زمانہ ہوتی تھی اور نہ مقدر سے کوئی گلہ۔ اسے معلوم ہوتا تھا کہ جو کام وہ کر رہا ہے، وہ اس کا فرض ہے اور اپنا فرض اسے بہر حال نبھانا ہے۔

وقفے وقفے سے ہنکاوے کے پیچھے پیچھے ایک اور شخص چلتا تھا۔ اس کا کام ایک اوزار سے گندم کے تنکوں کو الٹنا پلٹنا اور دور جا گرنے والوں کو واپس اکٹھا کرنا ہوتا تھا۔ جب تک گندم کے تنکے پوری طرح ٹوٹ کر توڑی نہ بننے لگتے، وہ جس اوزار کو استعمال کرتا، اسے سا۔ نگ (تلفظ: ساں گ) کہا جاتا تھا۔ یہ چار پانچ فٹ لمبا چوبی ڈنڈا ہوتا تھا جس کے آخری سرے پر دو خاصے بڑے اور تیز دندانے بنے ہوتے

تھے مگر جب گندم کے تنکے توڑی (بھوسا) کی شکل اختیار کر لیتے، پھر سانگھ بیکار ہو جاتا اور اس کے بجائے چار، پانچ یا چھ دندانوں والا اوزار استعمال کیا جاتا۔ اس اوزار کا نام تنگلی تھا۔

جب گہائی مکمل ہو جاتی، تب توڑی، جس میں دانے ملے ہوتے، تنگلی کی مدد سے پڑ کی ایک جانب ایک لمبے ڈھیر کی صورت میں اکٹھی کر دی جاتی۔ اس ڈھیر کو دھڑ [پنجابی تلفظ ڈ اور دھ کے درمیان ہوتا ہے] کہا جاتا تھا۔

یہ گہائی ایک دن میں مکمل نہیں ہوتی تھی، بلکہ اس میں دو دو تین تین دن صرف ہو جاتے تھے۔ ہر شام کو اس گہائی کو ایک گول ڈھیر کی صورت میں اکٹھا کرنا پڑتا تھا تا کہ رات کو آندھی چلنے کی صورت میں کہیں توڑی دانوں سمیت اڑ نہ جائے۔ ایک گہائی کے مکمل ہونے پر دوسری گہائی شروع ہو جاتی تھی تا آنکہ کسان کی ساری کٹی ہوئی گندم ختم ہو جاتی۔

کسان کا کام ابھی ختم نہیں ہوا، اسے دانے کو توڑی سے الگ کرنا ہوتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اسے سازگار ہوا کا انتظار رہتا تھا۔ بیٹ میں پوربی [مشرق سے چلنے والی ہوا] کو پرا، پچھمی [مغرب سے چلنے والی ہوا] کو پچھوں، شمالی یا اتری کو پہاڑ [کیونکہ یہ پہاڑوں کی طرف سے آتی تھی] اور دکھنی کو دکھن (جنوب کی طرف سے چلنے والی ہوا) کہا جاتا تھا۔ ہواؤں میں سب سے بڑی دشمن سمجھی جاتی تھی کیونکہ یہ گرم بھی ہوتی تھی اور مسموم بھی۔ یہ کھڑی فصلوں کی ہریالی چھین لیتی تھی اور یوں ان کی دشمن گردانی جاتی تھی۔ سب سے اچھی ہوائیں پرا اور پہاڑ تصور کی جاتی تھیں۔ پرا عموماً صبح کے وقت چلتی تھی اور یہی وقت اڑائی کے لیے بہترین خیال کیا جاتا تھا۔

چھاج کے ذریعے دانے کو توڑی سے الگ کرنے کا عمل اڑائی کہلاتا تھا۔ چھاج عموماً کانوں سے بنائے جاتے تھے۔ گہی ہوئی گندم کو چھاج میں ڈالا جاتا اور چھاج کو ہوا کے الٹے رخ کھڑے ہو کر فضا میں دائیں بائیں اور اوپر نیچے اچھالا جاتا۔ ہوا توڑی کو اڑا کر ذرا آگے پھینک دیتی لیکن دانہ اڑانے والے کے قدموں میں گرتا رہتا۔ اگر ہوا بند ہو جاتی، پھر سارا عمل رک جاتا اور ہوا کے دوبارہ چلنے کا انتظار کرنا پڑتا، لیکن اس کی نوبت عام طور پر کم ہی آتی تھی۔ صبح کے وقت پرا عموماً چلتا رہتا تھا اور جو لوگ اس وقت باہر نکلتے تھے، انھیں یہ ہوا بے حد خوشگوار اور راحت افزا معلوم ہوتی تھی۔

گندم کو بوریوں میں بھرا جاتا تھا [بوریوں کو اجتماعی طور پر باردانہ کہا جاتا ہے]۔ یہ بوریاں پٹ سن کی ہوتی تھیں۔ پٹ سن اگائی بنگال میں جاتی تھی لیکن انگریز حکمرانوں کی مہربانی سے بوریاں سکاٹ لینڈ کے شہر ڈنڈی میں بنتی تھیں، بالکل اسی طرح جیسے روئی پیدا تو ہندوستان اور مصر میں ہوتی تھی مگر کپڑا مانچسٹر

اور اس کے گرد ونواح کے قصبوں میں بنا جاتا تھا۔ پھر کلکتہ اور آزادی کے بعد مشرقی پاکستان میں پٹ سن کے اور بمبئی اور احمد آباد اور بعد میں کراچی اور فیصل آباد میں کپڑے کے کارخانے لگ گئے۔ کلکتہ اور مشرقی پاکستان نے ڈنڈی کا اور برصغیر کی ٹیکسٹائل ملوں نے مانچسٹر کا بھٹا بٹھا دیا۔ اب ولایت میں نہ پٹ سن کے کارخانے رہے ہیں اور نہ ٹیکسٹائل ملیں، ایک ایک کرکے سبھی کی سبھی بند ہو چکی ہیں مگر ہمارے بھولے اخبار نویس ابھی تک پرانی لکیر پیٹے جا رہے ہیں اور فیصل آباد کو پاکستان کا مانچسٹر قرار دینے پر مصر رہتے ہیں گویا فیصل آباد کی اپنی کوئی اہمیت نہیں، محض مانچسٹر کا چربہ ہے۔

گندم کو سنبھالنے اور آئندہ ضروریات کے لیے محفوظ کرنے کے لیے عموماً گھروں کے صحنوں میں بڑھولے بنائے جاتے۔ محکمہ خوراک جس قسم کے bins میں گندم محفوظ کرتا ہے، وہ دراصل انھیں بڑھولوں کی نقل ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ بڑھولے bins کے مقابلے میں بہت چھوٹے ہوتے تھے اور سیمنٹ کی بجائے مٹی سے بنائے جاتے تھے۔ بعض لوگ اس مقصد کے لیے کوٹھیاں بھی استعمال کر لیتے تھے۔ کوٹھی عموماً کسی کمرے کے اندر دیوار کے ساتھ تعمیر کی جاتی تھی۔

برسات کا موسم ختم ہونے اور سرما شروع ہونے سے پہلے گندم کو دھوپ میں سکھانا پڑتا تھا ورنہ اس میں سسری[1] لگ جانے کا اندیشہ رہتا تھا۔ جس طرح دیمک اندر ہی اندر لکڑی کو کھاتی اور اس کا برادہ بناتی رہتی ہے، سسری یہی حال گندم کا کرتی تھی۔ گندم عام طور پر گھروں کی چھتوں پر بکھیر کر سکھائی جاتی تھی۔ اس کا چھت پر چڑھانا ذرا مشکل کام تھا۔ اس مقصد کے لیے اسے عموماً تغاریوں میں بھرا جاتا تھا اور تغاریاں سروں پر رکھ کر چوبی پوڑی (سیڑھی) کے ذریعے چھت پر پہنچائی جاتی تھیں۔ ہر چھت کے درمیان ایک موگھ (موکھا) ہوتا تھا جس میں سوکھنے پر شام کو گندم نیچے کمرے میں گرا دی جاتی تھی یوں اس کا اتارنا کوئی خاص بڑا مسئلہ نہیں بنتا تھا۔

گندم بونے، کھینچنے، اٹھانے، سنبھالنے وغیرہ کے پرانے طور طریقے اب پاکستان میں تقریباً ختم ہو چکے ہیں۔ بڑے زمیندار اور آڑھ combine harvesters استعمال کرتے ہیں۔ امریکی اسے مختصراً کمبائن بھی کہتے ہیں۔ پہلا کمبائن 1834 میں ایجاد ہوا تھا اور اسے گھوڑے یا خچر کھینچتے تھے۔ جدید کمبائن سٹیم انجن سے چلتا ہے۔ یہ بیک وقت گندم کاٹتا بھی ہے اور سٹوں کو پھل کر دانے بھی نکالتا ہے لیکن توڑی نہیں بناتا۔ امریکی کچلے ہوئے تنکوں پر ٹریکٹر چلا کر زمین میں دبا دیتے ہیں اور یوں اس کی کھاد بنا لیتے ہیں۔ امریکی مکئی، جو

1۔ سسری دیمک سے ملتا جلتا ایک کیڑا ہے۔ اس کا رنگ بھورا ہوتا ہے۔ اس کا چھوٹا سا جسم بالکل سیدھا ہوتا ہے اور اس پر کوئی پر، بال وغیرہ نہیں ہوتے۔

سویابین وغیرہ کی فصلیں بھی اسی سے کاٹتے اور گاہتے ہیں۔

کمبائن بہت ہی مہنگی مشین ہے۔ پاکستان کے چھوٹے زمیندار اور کسان اسے خرید نہیں سکتے۔ ان کا مسئلہ کسی حد تک حل کرنے کے لیے مقامی صنعت کاروں نے 1980 کی دہائی میں ایک مشین متعارف کروائی جس کا نام ویٹ تھریشر (wheat thresher) رکھا گیا۔ [ دیہاتی بھی اسے ویٹ تھریشر ہی کہتے ہیں۔ ] ویٹ تھریشر کا اپنا کوئی انجن نہیں ہوتا، یہ ٹریکٹر کے انجن پر چلتا ہے۔ یہ خود گندم کاٹ نہیں سکتا، صرف کٹی ہوئی گندم کو گاہ سکتا ہے۔ اس کا البتہ اضافی فائدہ یہ ہے کہ یہ بھوسے سے دانے الگ کرنے کے ساتھ ساتھ توڑی بھی بناتا جاتا ہے۔ اس سے کسان کا کچھ بھلا ہو جاتا ہے کہ اسے اپنے مویشیوں کو کھلانے کے لیے حسب سابق خشک چارہ مل جاتا ہے۔

کسان گندم کی پکائی [ کٹائی، گہائی اور اڑائی کا مکمل عمل ] سے فراغت پانے کے بعد بھی فارغ نہیں بیٹھ سکتا تھا، اب اسے ساونی ( خریف ) کی فصلیں بونا ہوتی تھیں، تاہم اس سے پہلے ہمارے علاقے میں اسے سستانے کا موقع مل جاتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں ایک بزرگ بابا مالے شاہ کا مزار تھا۔ بابا مالے شاہ ہمارے گاؤں کے ہی نہیں پورے علاقے کے patron saint (مربی ولی) تھے۔ وہ رہنے والے تو کہیں اور کے تھے لیکن انھوں نے اپنا مستقل ڈیرا ہمارے گاؤں میں بنا لیا تھا اور یہیں انھوں نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی تھی۔ ان کا مزار سڑک سے کچھ ہٹ کر ایک کھیت میں تعمیر کیا گیا تھا اور مرجع خاص و عام تھا۔ جس کھیت میں یہ مزار واقع تھا، اس کی سڑک کے کنارے چھتر تھوہر کی باڑ تھی۔ اس تھوہر کا تنا (stem) خاصا موٹا اور پتے بہت دبیز اور چوڑے ہوتے تھے۔ [ شاید اسی لیے چھتر تھوہر کہلاتا تھا۔ ] ان پتوں کے کناروں پر بہت بڑے بڑے اور خوفناک کانٹے اُگے ہوتے تھے۔ اگر کیکر کا کانٹا پاؤں یا جسم کے کسی دوسرے حصے میں چبھ جائے، اسے عام سوئی کی مدد سے آسانی سے نکالا جا سکتا ہے مگر چھتر تھوہر کا کانٹا آپ کے پاؤں میں چبھ جائے، پھر خدا ہی آپ کا حافظ ہے۔ آپ سوئی سے جتنا اسے چھیڑیں گے، یہ اتنا ہی پاؤں کے اندر دھنستا جاتا ہے، اسے صرف پاؤں میں چیرا دے کر ہی نکالا جا سکتا ہے۔ ہمارا جب بھی ادھر گزر ہوتا تھا، ہم ان تھوہروں کے قریب بھی نہیں پھٹکتے تھے، سڑک کے مخالف کنارے کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔

ہمارے چھٹی اور ساتویں جماعت کے اساتذہ ہر سال اپنے طالب علموں سے بابا مالے شاہ پر لازما جواب مضمون لکھواتے تھے۔ ان کی سوانح حیات میں ان کی چند کرامات کا بھی ذکر کیا جاتا تھا۔ یہ کرامات کیا تھیں، اتنا عرصہ گزرنے کے بعد مجھے ایک بھی یاد نہیں آ رہی۔

بابا مالے شاہ کا عرس ہر سال 26 اور 27 جیٹھ (بمطابق 9 اور 10 جون) کو بڑی عقیدت اور احترام سے منایا جاتا تھا۔ دور دور سے لوگ، بالخصوص عورتیں چڑھاوے چڑھانے، نذر نیاز پیش کرنے اور دعائیں مانگنے آیا کرتی تھیں۔ اس موقع پر خواہ چھینٹا ہی پڑے، بارش ضرور ہوتی تھی اور اسے بھی باباجی کی کرامت سمجھا جاتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان تاریخوں کو مزار سے ملحق کھیتوں میں بہت بھاری میلا لگتا تھا۔ چونکہ کھیتوں سے گندم اٹھائی جا چکی ہوتی تھی، اس لیے وہ خالی پڑے ہوتے تھے۔ دور و نزدیک کے دیہاتوں، قصبوں بلکہ جالندھر شہر سے بھی دکاندار اپنے سودے سلف لاتے اور تنبو گاڑ کر عارضی سٹال بنا لیتے تھے۔ سٹال دونوں طرف لگائے جاتے تھے۔ اگرچہ بیچ میں خاصا چوڑا رستہ چھوڑ دیا جاتا تھا مگر بھیڑ اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ گزرنا امر محال بن جاتا۔ چونکہ دیہاتوں میں عورتیں عموماً پردہ نہیں کرتی تھیں اور نہ برقع وغیرہ پہنتی تھی، اس لیے وہ جہاں جی چاہتا، بے دھڑک چلی جاتی تھیں۔ میلے میں بھی ان کی شرکت پر کوئی قدغن نہیں ہوتی تھی، اس لیے مردوں کے شانہ بشانہ وہ بھی تفریح کے اس نادر موقع کا بھرپور فائدہ اٹھاتیں اور جی بھر کر لطف اندوز ہوتیں۔

سٹالوں پر دنیا جہان کی اشیا دستیاب ہوتی تھیں۔ کہیں چوڑیاں بک رہی ہیں، کہیں ملوں کا کپڑا، کہیں تازہ پکوڑے تلے جا رہے ہیں تو کہیں مٹھائیوں والے اپنے سٹال جمائے بیٹھے ہیں۔ خربوزوں والے [ابھی تربوز وغیرہ کا موسم نہیں آیا ہوتا تھا] زمین پر خربوزوں کے ڈھیر لگائے بیٹھے ہیں۔ الغرض کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو دیہاتیوں کے کام کی ہو اور وہاں موجود نہ ہو۔ سب سے زیادہ بھیڑ چوڑیوں کی دکانوں پر ہوتی تھی۔ عام دیہاتی دکانوں میں اتنی رنگ برنگی چوڑیاں نہیں ملتی تھیں، چنانچہ عورتیں اس نادر موقع کا فائدہ اٹھا کر خوب خریداری کرتی تھیں۔

بندروں اور ریچھوں کا تماشا کرنے والے بھی آتے اور مختلف کرتب دکھا کر وقتی طور پر لوگوں کو خوش کر دیتے۔ کبھی کبھی ایک آدھ ناچ گانے والی بھی آ جاتی۔ اس کا کاروبار زیادہ تر رات کو چلتا تھا۔ ایک ٹیٹو بنانے والا بھی آتا تھا۔ وہ اپنی سوئی اور نیلی سیاہی سے لوگوں کی کلائیوں پر چھوٹی موٹی تصویریں بنا دیتا مگر گابھوں کو جس چیز میں سب سے زیادہ دلچسپی ہوتی، وہ کلائی پر اپنا نام کھدوانا ہوتا تھا۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی ایک مرتبہ میرے دل میں بھی اپنا نام لکھوانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ پھر جانے کیا ہوا، میں نے اس خیال کو جھٹک دیا اور یہ اچھا ہی ہوا، ورنہ مجھے ساری عمر اپنی کلائی دوسروں سے چھپانا پڑتی اور شاید گھر والوں سے مار بھی کھاتا۔

# 13

جب میں پانچویں جماعت میں داخل ہوا، پنجاب کی صوبائی کابینہ بن چکی اور اپنا کام شروع کر چکی تھی۔ اس میں گنتی کے چند وزیر تھے۔ سکندر حیات وزیر اعظم اور سر چھوٹو رام زراعت، سر منوہر لال خزانہ، میاں عبدالحئی تعلیم، سر خضر حیات ٹوانہ امور داخلہ اور سردار سندر سنگھ مجیٹھیا تعمیرات عامہ کے وزیر تھے۔ ہمارے سکول کے ہر کمرے کے آگے برآمدہ تھا۔ آٹھویں جماعت کے کمرے کے باہر دیوار پر ایک مستقل تختہ سیاہ بنا ہوا تھا۔ اس تختے کے اوپر کے حصے پر وائسرائے، گورنر اور صوبائی وزراء کے نام مستقلاً لکھے رہتے تھے۔ وائسرائے اور گورنر کے ناموں سے پہلے ہز ایکسی لینسی اور وزیروں کے ناموں سے پہلے آنریبل کے القاب مندرج ہوتے تھے۔ تختے کے زیریں حصے پر منشی غلام حیدر ہر روز کی تازہ خبروں کی سرخیاں لکھتے رہتے تھے اور یوں ہمیں حالات حاضرہ سے کچھ نہ کچھ آگاہی ملتی رہتی تھی۔

قدرے پکے رنگ کے منشی غلام حیدر زراعت کے استاد تھے۔ وہ منشی علی محمد کی طرح دانے وال کے رہنے والے تھے۔ ان کا تعلق جس خانوادے سے تھا، وہ ہنبد کہلاتا تھا۔ ہنبدوں کا شمار بیٹ کے ان خاندانوں میں ہوتا تھا جن کے تمام افراد پڑھے لکھے تھے۔ منشی غلام حیدر کے چار بھائی تھے۔ ان میں سے ایک چودھری محمد بخش وہاڑی کے قریب کسی گاؤں میں قانون گو کی حیثیت سے ملازمت کر رہے تھے۔ وہ بہت ہوشیار اور سمجھدار آدمی تھے۔ قیام پاکستان کے بعد جب مشرقی پنجاب کے زراعت پیشہ لوگوں کو ان کی چھوڑی ہوئی زمینوں کے عوض پاکستان میں زمینیں الاٹ کرنے کا فیصلہ ہوا تو معاوضے کے لیے مشرقی اور مغربی پنجاب کے ہر علاقے کی پیداواریت (productivity) اور زرخیزی (fertility) کے حساب سے نمبر معین ہوئے۔ ان نمبروں کے تعین میں زیادہ تر حکام نے من مانی سے کام لیا تھا اور معروضیت (objectivity) کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ ان لوگوں کے حساب سے زرخیز ترین زمینوں کے 80 سے اوپر نمبر مقرر ہوئے [بیٹ کی زمینیں اسی زمرے میں آئی تھیں] اور بنجر زمینوں کے محض 9 یا 10۔ تاہم مغربی پنجاب کی بعض اچھی بھلی نہری زمینیں اسی زمرے میں ڈال دی گئیں۔ اس سے بعض لوگوں کی تو لاٹری نکل آئی اور انھیں اپنی حیثیت سے کہیں زیادہ زمین مل گئی۔ [محترمہ بے نظیر بھٹو کے انکل اور معتمد خصوصی اور ہمارے برخوردار بشیر ریاض کا خاندان اسی زمرے میں آتا ہے۔ اسے بورے والا کے قریب ایک گاؤں میں اپنے چار پانچ ایکڑ کے عوض 25، 30 ایکڑ مل گئے۔] بعض لوگ جو محکمہ مال کے پٹواریوں، قانون گوؤں اور تحصیل داروں کے رشتے دار تھے، انھوں نے چن چن کر ایسی زمینیں اپنے نام کرا لیں۔ چودھری محمد بخش تو

خود قانون گو تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ وہاڑی کے قریب ایک ایسا خاصا بڑا قطعہ زمین ہے جس کے نمبر محض 9 متعین ہوئے ہیں۔ انھوں نے یہ قطعہ اپنے اور اپنے بھائیوں کے نام الاٹ کرالیا۔ چند سال تو پانچوں بھائی اس پر فصلیں کاشت کراتے رہے۔ پھر انھیں احساس ہوا کہ وہاڑی کے قریب ہونے کی وجہ سے اس قطعہ زمین پر ایک بستی تعمیر کرائی جا سکتی ہے اور یوں خاصا منافع کمایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان [اس زمانے میں وہاڑی ضلع ملتان کی تحصیل تھا] سے منظوری حاصل کی اور اللہ کا نام لے کر نئی بستی کی نیو رکھ دی۔ انھوں نے اس بستی کا نام اپنے آبائی گاؤں کے نام پر وانے وال رکھا۔ سب بھائیوں کی اولادیں جوان ہو چکی تھیں سب نے اس نئی بستی میں چار چار کنال کی کوٹھیاں بنوائیں اور باقی زمین دوسرے ضرورت مندوں کو بیچ دی۔ یہ بستی وہاڑی بس سٹینڈ کے قریب لاہور ملتان روڈ اور وہاڑی لڈن روڈ کے سنگم پر واقع ہے اور وہاڑی کی اہم بستیوں میں شمار ہوتی ہے۔

خود منشی غلام حیدر نے قیام پاکستان کے بعد تدریس کا پیشہ ترک کر دیا اور اپنے بھائی کے کوم (سمدھی) چودھری نیاز احمد کی، جو ہمارے گاؤں کے رہنے والے تھے اور شطرنج کے ماہر کھلاڑی تھے، شراکت میں کپڑے کا کاروبار شروع کر دیا۔ دونوں بہت کامیاب بزنس مین بنے۔ ان کے اکلوتے بیٹے غلام مصطفیٰ نے انگلستان سے ایف آر سی ایس کیا۔ اس کی شادی اپنی ایک کزن سے ہوئی تھی لیکن بچے ہونے کے باوجود یہ شادی ناکام رہی اور مصطفیٰ نے انگلستان میں ایک ایرانی دوشیزہ سے نکاح کر لیا۔ وہ زیادہ عرصہ جی نہ پایا، ایک موذی مرض میں مبتلا ہوا، پاکستان آیا اور فوت ہو گیا۔ اس کی ایرانی بیوی اس کے بیمار ہونے پر واپس ایران چلی گئی تھی۔ منشی جی کا ایک بھتیجا چودھری منظور احمد پنجاب کے محکمہ جنگلات کا سب سے بڑا افسر یعنی conservater of forests بنا۔ خاصا موتی آدمی تھا، شراب و کباب کا دلدادہ، دل کا دورہ پڑا اور ریٹائر ہونے سے پہلے ہی انتقال کر گیا۔ اس کا چھوٹا بھائی اور منشی جی کا داماد بشیر احمد محکمہ انہار میں ایس ڈی او تعینات ہوا۔ کچھ سال کے بعد مستعفی ہو گیا اور اپنی تعمیراتی فرم بنائی۔ ایوان اقبال لاہور کی تعمیر کے ٹھیکے داروں میں یہ فرم بھی شامل تھی۔

وہنڈوں کے ساتھ میرے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔ ان میں سے چند ایک میرے کلاس فیلو تھے اور بعض شاگرد بھی۔ منشی غلام حیدر کے ساتھ خصوصی تعلق اس لیے بھی بن گیا کیونکہ ہم دونوں ہی ننکل انجیا اسلامیہ ہائی سکول کی، جو تقسیم کے بعد ننکل انجیا سے ساہی وال منتقل ہو گیا تھا، مجلس انتظامیہ کے رکن تھے۔ 1972 میں جب پیپلز پارٹی کی حکومت نے نجی تعلیمی اداروں کو قومیا لیا تو یہ سکول بھی سرکاری تحویل میں چلا گیا اور یوں ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

# 14

آپ زرعی زمین کے مالک ہوں یا کاروباری زمین کے، پٹواری سے آپ کا واسطہ بہرصورت پڑتا ہے۔ دیہاتی پٹواریوں کے پاس زمین داروں اور کسانوں کی زمینوں کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ جب تک وہ آپ کی زمین کے متعلق فرد بنا کر نہ دے، آپ کہیں ثابت نہیں کر سکتے کہ آپ اس کے مالک ہیں اور اس کا یہی اختیار اس کی بالائی آمدنی کا ذریعہ بنتا ہے، پھر دیہاتوں میں تو اس کا کلی راج ہوتا ہے اور زمین کے مالکوں کی جان، خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، اس کی مٹھی میں ہوتی ہے۔ وہ برسرِ موقع فصلوں کا جائزہ لیتا اور ان کا لگان متعین کرتا ہے۔ وہ چاہے تو آپ کو چھوٹ دلا دے اور چاہے آپ کی کمر توڑ دے، آپ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ شہروں میں چاہے آپ کا مکان ہو یا دکان، کارخانہ یا خالی پلاٹ، ملکیت کا ریکارڈ پٹواری ہی کے پاس ہوتا ہے۔ اس کے پاس ایک ایسی جادو کی چھڑی ہوتی ہے کہ وہ چاہے تو آپ کی ملکیت میں اضافہ کر دے، تخفیف کر دے یا سرے سے انکار کر دے، حرفِ آخر اسی کے پاس ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ 1930 کی دہائی میں جب سر فضل حسین نے شملہ پہاڑی کے قریب اپنی کوٹھی تعمیر کرانا چاہی تو انھیں نقشہ پاس کرانے سے پہلے پٹواری سے فرد بنوانے کی ضرورت پیش آئی۔ پٹواری نے حسبِ معمول اپنے ''محنتانے'' کا معاوضہ، اگرچہ بصد ادب، مانگ لیا۔ سر فضل حسین کو بڑا مان تھا کہ وہ وائسرائے کی کونسل کے رکن اور متعدد بار پنجاب حکومت کے وزیر رہ چکے ہیں، ایک معمولی سے پٹواری کی کیا مجال کہ وہ ان سے رشوت (پنجابی: وڈھی) طلب کرے۔ چنانچہ جب انھوں نے اپنا رعب جمایا، تو اس نے فرد تو بنا دی مگر اپنا لُچ تلنے سے باز نہ آیا، اس نے اپنے نقشے میں سر فضل حسین کے پلاٹ کی ایک لکیر ٹیڑھی کر دی اور یوں پلاٹ کا رقبہ اصل سے کم ہو گیا۔ سر فضل حسین بہت تیخ پا ہوئے مگر پٹواری پر کوئی اثر نہ ہوا، وہ یہی اصرار کرتا رہا کہ ''میرا ریکارڈ تو یہی کہتا ہے۔'' سر فضل حسین کچھ بھی نہ کر سکے، انھیں اپنی شکست تسلیم کرتے ہی بنی۔ چنانچہ جب انھوں نے پٹواری صاحب کی خدمت کر دی تو ان کے پلاٹ کی لائن سیدھی ہو گئی۔ [کوٹھی تعمیر ہو گئی اور سر فضل حسین کے انتقال کے بعد اس میں پہلے آل انڈیا ریڈیو اور تقسیم کے بعد ریڈیو پاکستان کام کرتا رہا تا آنکہ ایمپریس روڈ پر اس کی اپنی نئی عمارت نہ بن گئی۔]

ہمارے گاؤں کے ایک نمبردار [ہمارے گاؤں میں چار نمبردار تھے] کے چھوٹے بھائی چودھری غلام علی بار کے کسی گاؤں میں پٹواری تھے۔ پھر اللہ جانے ان کے جی میں کیا آیا کہ انھوں نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور واپس گاؤں آ گئے۔ ان کے مکان کا دروازہ تو ایک گلی میں کھلتا تھا مگر اس کی بڑی دیوار

بڑی سڑک سے ملحق تھی۔ انھوں نے اس دیوار میں نیا دروازہ بنوایا اور پرچون کی دکان کھول کر بیٹھ گئے۔ گھر کا خرچ تو وہ اپنی آبائی زمین کی یافت سے، جو انھوں نے بھولی[1] پر دے رکھی تھی، چلاتے تھے اور دکان سے جو آمدنی ہوتی، وہ ان لوگوں کو لوٹاتے رہے جن سے انھوں نے ملازمت کے دوران میں نذرانے وصول کیے تھے۔ یہ سلسلہ قیامِ پاکستان تک جاری رہا۔

پرجیاں خرد کے ایک پٹواری بھی ملازمت سے فارغ ہو کر گھر آ کر بیٹھ گئے تھے۔ پتا نہیں وہ نوکری سے نکالے گئے تھے یا خود ہی اکتا کر مستعفی ہوئے تھے۔ ان کا نام محمد افضل تھا۔ اس فرصت کے زمانے میں انھیں ایک انوکھا خیال سوجھا۔ انھوں نے "پٹوارنامہ" کے نام سے ایک آٹھ ورقی رسالہ چھاپنا شروع کر دیا۔ وہ پورے صوبے کے پٹواریوں کے مسائل اور سرگرمیوں کی خبریں اکٹھا کرتے تھے۔ [عموماً یہ خبریں خود پٹواری ہی انھیں بھیج دیا کرتے تھے۔] وہ اداریہ اور بعض مضامین خود ہی تحریر کرتے، سارا مواد سمیٹتے، اسے جالندھر لے جاتے، کسی کاتب کو پکڑتے، کتابت کراتے اور وہیں کے کسی چھاپے خانے میں چھپواتے اور سیکڑوں رسائل پر مشتمل پلندا اپنے گاؤں لے آتے۔ وہاں وہ اپنے گاہکوں کے پتوں کی پرچیاں چسپاں کرتے اور اگلے روز صبح سویرے ہمارے گاؤں کے ڈاک خانے میں لے آتے۔ یہاں وہ ایک ایک پیسے کی ٹکٹیں خریدتے [کیا سستا زمانہ تھا]، چٹوں پر لگاتے اور پلندا برانچ پوسٹ ماسٹر منشی علی محمد کے حوالے کر دیتے۔ وہ ایک ایک کر کے سب رسالوں پر مہریں لگا دیتے۔ بے چارے ڈاکیے موہلی کی شامت آ جاتی۔ اسے یہ سارا اپشتارہ اپنی کمر پر اٹھا کر شاہکوٹ جانا پڑتا۔ بہر حال اس سے ہمارے گاؤں کا نام اشاعتی مراکز کی فہرست میں شامل ہو گیا۔

## 15

تنگ دھڑنگ سیاہ فام، مضبوط کاٹھی کے مالک، چھ فٹے بابا ولی مست تھے، مجذوب تھے، ولی تھے یا محض ہوش و حواس سے عاری شخص، میں آج تک اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا۔ دور بجے والے دانے وال کے تھے مگر وہاں کتنے شاذ ہی تھے، آج یہاں تو کل وہاں۔ کبھی کسی روڑی (کھاد کا ڈھیر) پر بیٹھے نظر آتے تھے تو کبھی کسی کنوئیں کی منڈیر (پنجابی: منڈیر) پر۔ بھاگنے پر آتے تو بھاگتے ہی چلے جاتے، آہستہ روی اختیار کرتے تو جوں کی رفتار سے چلنے لگتے۔ گرمیاں ہوں یا سردیاں، زور کی بارش ہو رہی ہو، اولے پڑ

---

1۔ بھولی (اردو بٹائی)۔ بھولی کا تلفظ بولی کی ب اور ہ جیسا ہے مگر آواز بھ اور بھ کے درمیان آئے گی۔

رہے ہیں یا لو چل رہی ہو، انھیں کبھی کوئی کپڑا پہنے نہیں دیکھا گیا۔ اگر کوئی رحم دل شخص ان کے کندھوں پر چادر ڈالنے کی کوشش کرتا تو وہ فوراً ہی اسے نوچ کر کہیں دور پھینک دیتے۔ وہ ہر موسم میں اپنے فطری لباس میں ہی نظر آتے تھے۔ وہ جدھر جاتے، لوگوں، بالخصوص عورتوں کی اچھی خاصی بھیڑ ان کے گرد جمع ہو جاتی۔ ہر کوئی انھیں اللہ کا فرستادہ ولی سمجھتا تھا [شاید اسی لیے ان کا نام بابا ولی پڑ گیا تھا] اور گمان کرتا تھا کہ ابھی بابا ولی کی نظر کرم اس پر پڑے گی، وہ کوئی کرامت دکھائیں گے اور اس کے سارے بگڑے کام درست ہو جائیں گے۔ مگر بابا ولی پر لوگوں کی دعاؤں، التجاؤں، منتوں سماجتوں یا گڑگڑاہٹوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ یا تو انھیں غلیظ گالیوں سے نوازنے لگتے یا کوئی پتھر، اینٹ، روڑا، ڈھیلا وغیرہ جو بھی ان کے ہاتھ لگتا، ان پر پھینک دیتے مگر جب ضرورت مند پھر بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑتے، وہ بگٹٹ بھاگنے لگتے اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔ پھر ایک دن خبر آئی کہ وہ کسی پگڈنڈی پر مردہ پائے گئے ہیں۔ انھیں وہاں سے وہاں پہنچایا گیا، وہاں غسل دے کر کفن پہنایا گیا اور بصد احترام دفنا دیا گیا۔

## 16

پستا[1] سے ذرا ہی اونچی قامت کی زہرہ قبول صورت بلکہ پرکشش دوشیزہ تھی۔ اس کا رنگ شہابی، گال گلابی، ہونٹ عنابی، آنکھیں غلافی، ناک ستواں، پیشانی قدرے تنگ اور ابرو تیر کمان تھے۔ جب وہ ہنستی یا مسکراتی تھی، اس کے رخساروں پر ہلکا سا گڑھا بن جاتا تھا۔ اس کے شب دیجور جیسے سیاہ بال خاصے لانبے تھے مگر جب وہ انھیں گوندھنے کے بعد ان میں سرخ پھندنوں والا سیاہ پراندہ پرو لیتی اور ان کا جوڑا بنا لیتی تو اس کی کشش بے حد و بیحد ہو جاتی۔ اگر وہ مدری نہیں بلکہ دراز کشیدہ قامت ہوتی تو بالکل ہی قیامت ڈھا دیتی۔ وہ ایک طرح کی موری تھی جسے کسی کل قرار نہیں تھا۔ وہ پھرکی کی طرح اچھلتی، پھدکتی، ناچتی، اٹھلاتی ایک سے دوسرے کنویں پر پہنچ جاتی، کبھی فصلوں کے بیچ اس پگڈنڈی پر دکھائی دیتی اور کبھی دوسری پر۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے تھے مگر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ وہ الف کے نام لٹھ بھی نہیں جانتی تھی کیونکہ اس کے باپ نے کھاتے پیتے ہونے کے باوجود اسے کبھی سکول میں داخل کرانے کا تردد نہیں کیا تھا۔ چنانچہ وہ ہمہ وقت فارغ رہتی تھی، جو من میں آتا کرتی، جدھر دل چاہتا ادھر چل پڑتی۔ یوں سمجھیں ایک چکر تھا اس کے پاؤں میں زنجیر نہیں۔

---

1۔ اس کہانی کے تمام کرداروں کے نام تبدیل کر دیے گئے ہیں۔

پھر اس کے باپ محمد اسحٰق نے اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالنے کی کوشش کی۔ نصیر احمد میرے بڑے بھائی عبدالمجید کا ہم جماعت اور انتہائی گہرا دوست تھا۔ دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ وہ اکٹھے اٹھتے بیٹھتے، اکٹھے اسلامیہ ہائی سکول ننگل انبیا جاتے، اکٹھے گھومتے پھرتے، اکٹھے پڑھتے اور اکٹھے تاش کھیلتے تھے۔ نصیر احمد پڑھنے میں بہت تیز تھا اور اس نے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا تھا (اس وقت ہائی سکولوں میں بھی ذریعہ تعلیم انگریزی تھا)۔ اس کی بس ایک ہی آرزو تھی کہ اسے کسی طرح موگہ رسول[1] کے انجینئرنگ سکول میں داخلہ مل جائے جہاں سے وہ سب انجینئرنگ کا اڑھائی تین سالہ کورس پاس کرنے کے بعد محکمہ انہار میں اوورسیئر[2] (overseer) کی ملازمت حاصل کر سکے گا لیکن اس کے گھر والوں کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ اس تعلیم کے خطیر اخراجات برداشت کر سکتے۔ محمد اسحٰق کے پاس وسائل تھے۔ اس نے نصیر احمد کے اخراجات اٹھانے کی ہامی بھر لی مگر شرط یہ رکھی کہ وہ اس کی بیٹی زہرہ کے ساتھ فوری نکاح کرے، رخصتی البتہ تعلیم مکمل ہونے پر کی جائے گی۔ نصیر احمد کو راہ نجات نظر آ گئی اور اس نے اپنے ماں باپ کے ساتھ مشورے کے بعد ہاں کر دی۔ چنانچہ دونوں کا سادگی کے ساتھ نکاح پڑھوا دیا گیا۔

نصیر احمد تو اپنی نئی منزل کی طرف روانہ ہو گیا مگر ادھر زہرہ کے اطوار میں رتی برابر فرق نہ آیا۔ اس کی اٹکھن بٹکھن اسی طرح جاری رہی جس طرح کہ نکاح سے پہلے تھی۔ وہ اتنک مٹک کرتی ہر طرف بھاگی پھرتی رہتی تھی۔ لوگوں کی زبانیں قینچی کی طرح چلنے لگی تھیں۔ عورتیں اس معاملے میں بالخصوص پیش پیش تھیں۔ وہ اکثر اس کی غیبتیں کرتیں، اسے کوسنے دیتیں، اور بعض تو یہاں تک چلی جاتیں کہ برملا کہنے لگیں کہ اس حرافہ کا پنڈا کوارا نہیں رہا، بلکہ وہ گابھن ہو چکی ہے اور انھیں "بے چارے" نصیر احمد پر ترس آنے لگتا۔ افواہیں کالے کوسوں دور موگہ رسول میں نصیر احمد تک پہنچ رہی تھیں مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی پڑھائی

---

1۔ یہ سکول 1873 میں اورینٹل کالج لاہور میں سروینگ (surveying) کلاس کے طور پر شروع ہوا تھا۔ اس کی سرپرستی پنجاب یونیورسٹی کے ذمے تھی۔ 1885 میں اس کلاس کو میو سکول آف آرٹس لاہور میں منتقل کر دیا گیا۔ 1906 میں اس کا درجہ بڑھا کر اس کا نام سکول آف انجینئرنگ رکھ دیا گیا۔ بہت جلد حکام کو احساس ہو گیا کہ طلبا کو پریکٹیکل تعلیم دینے کے لیے جس قسم کی ورکشاپ وغیرہ کی ضرورت ہے وہ جگہ کی تنگی کے باعث یہاں قائم نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ رسول ہیڈ ورکس کے قریب، جہاں سے لوئر جہلم کینال نکلتی ہے، نیا کیمپس تعمیر کیا گیا اور سکول وہاں منتقل کر دیا گیا۔ چونکہ یہ ایک گاؤں کی جس کا نام موگہ رسول تھا، زمین پر بنایا گیا تھا اس لیے اسے عام طور پر موگہ رسول سکول کہا جاتا تھا۔ 1974 میں اسے گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی بنا دیا گیا۔ 2008 میں یہاں طلبا کی تعداد 4062 تھی۔ 2014 میں پنجاب گورنمنٹ نے اسے یونیورسٹی کا درجہ دے دیا۔

2۔ اوورسیئر کو آج کل سب انجینئر کہا جاتا ہے۔

میں پوری طرح ڈوب چکا تھا اور مہینوں کے بعد جب بھی گاؤں آتا تھا، اپنے گھر میں پڑا رہتا اور دوسروں سے ملنے سے گریز کرتا۔ آخر وہ دن آ گیا جب اس نے آخری امتحان ایک بار پھر امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا اور چھوٹتے ہی اسے محکمہ انہار میں اوورسیئر کی ملازمت مل گئی۔

ملازم ہوتے ہی اس نے پہلا کام یہ کیا کہ زہرہ کو طلاق دے دی۔ طلاق کا کیا تھا، خاوند بیک وقت تین بار طلاق طلاق طلاق کہہ دیتا اور طلاق مؤثر بھی جاتی تھی۔ محمد اسحٰق ہکا بکا رہ گیا۔ نصیر احمد نے کوئی پروا نہ کی تاہم اس نے چند ہی مہینوں میں محمد اسحٰق کی ساری رقم لوٹا دی اور بے فکر ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک باورچی بھی رکھ لیا تھا۔ مزے کی کھاتا تھا اور ٹھاٹھ کا پہنتا تھا۔ وہ جب بھی گاؤں آتا، بہت پورے سال میں تانگہ کرا کر آتا تھا۔

ایک ڈیڑھ سال بعد اسے خیال آیا کہ اب اسے شادی کر لینا چاہیے۔ اس نے ہمارے گاؤں کے ایک نمبردار کی بیٹی سے رشتے کا پیغام بھیجا جو والدین نے فوراً قبول کر لیا، آخر کماؤ لڑکا تھا اور اوپر سے بالائی یافت بھی کافی تھی۔

نصیر احمد کی نئی دلہن ذرا لمبی تڑنگی تھی۔ وہ خوبصورت تو نہیں تھی مگر بدصورت بھی نہیں تھی۔ وہ کچھ کچھ پڑھی لکھی تھی اور سب سے بڑھ کر کنگھی چوٹی کی بہت شوقین تھی۔ اس نے ساری عمر نصیر احمد کو انگلیوں پر نچائے رکھا اور وہ اس کے سامنے ہمیشہ بھیگی بلی بنا رہا۔ آخر اس کے ساتھ شادی اپنی مرضی سے کی تھی۔ کچھ سال بعد وہ ترقی کر کے ایس ڈی او بن گیا تھا مگر گھر کے اخراجات اور بیوی کے ناز نخرے اور نت نئے مطالبات اسے وہ کچھ کرنے پر مجبور کر دیتے تھے جو شاید وہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پہلے جنرل یحییٰ خاں کے 313 میں اس کا نام آیا اور پھر ذوالفقار علی بھٹو کے ہزار بارہ سو میں لیکن وہ دونوں مرتبہ صاف بچ نکلنے اور اپنی ملازمت پر بحال ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

میٹرک تک پہنچتے پہنچتے میری بھی نصیر احمد سے ایک قسم کی دوستی ہو گئی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے مجھے رندھیر کالج کپورتھلہ کے کسی انگریزی کے پروفیسر کی میٹرک کے طلبہ کے لیے انگریزی مضامین کی کتاب بھی تحفتاً دی تھی۔ اس نے ایک روز باتوں باتوں میں مجھے بتایا: "میں دو چیزیں بالکل نئی نکور اور ان چھوئی (untouched) چاہتا ہوں: ایک کتاب، دوسری عورت، دوسروں کی ہنڈلی[1] ہوئی اور سیکنڈ ہینڈ اشیا مجھے قطعاً پسند نہیں۔"

نصیر احمد کی "وعدہ خلافی" پر محمد اسحٰق کا دل ٹوٹ گیا۔ اس نے بہتیری کوشش کی مگر وہ اپنی بیٹی کا رشتہ

---

1- ہنڈلنا: جوٹھی کرنا۔

کسی دوسری جگہ کرنے میں ناکام رہا۔ پاکستان بننے کے کچھ ہی عرصہ پہلے اس کا انتقال ہو گیا۔ زہرہ اپنے بھائی کے ساتھ پاکستان آ گئی مگر بھائی نے یہاں پہنچتے ہی اپنی آنکھیں بدل لیں۔ پر جیاں کلاں میں اسے پھر بھی برادری کا خوف تھا، یہاں کون پوچھنے والا تھا۔ اس نے بہن کو اپنے پاس رکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ زہرہ کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ وہ بہتیرا روئی پیٹی، چیخی چلائی مگر بھائی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ پھر ایک دن وہ ساہی وال کے کسی چکلے میں بیٹھ گئی۔ میرا راوی انتہائی معتبر تھا، اسے کسی صورت جھٹلانا ممکن نہیں تھا۔

## 17

مڈل سکول میں میرے ساتھ دو غیر مسلم لڑکے پڑھتے تھے۔ وہ دونوں ایک ہی گاؤں اوڈھو وال کے رہائشی تھے۔ یہ گاؤں سکھوں کا تھا۔ دونوں میں گہرا یارانہ تھا۔ میری دونوں کے ساتھ کچھ کچھ دوستی ہو گئی تھی۔ لمبا تڑنگا اور قدرے بھاری جسم کا مالک لال سنگھ سکھ تھا، جب کہ دبلا پتلا اور لال سنگھ کے مقابلے میں ذرا مدرا چاکری ہندو تھا، پتا نہیں چاکری کا باپ زندہ تھا یا مر چکا تھا مگر مجھے اتنا ضرور معلوم تھا کہ چاکری کی ماں[1] پیتل کے گھڑے (پنجابی: دِلتو ہا) میں سکھوں کے گھروں میں پانی پہنچاتی تھی، کبھی کبھی چاکری بھی ماں کی مدد کر دیا کرتا تھا۔ چاکری پڑھنے لکھنے میں بالکل کورا تھا اور اس کی زبان بھی اکثر لکنت کھاتی رہتی تھی۔ منشی صاحبان کی ان تھک کوششوں کے باوجود وہ "ش" کوش اور "س" کوس نہ کہہ سکا، ہمیشہ اس کا الٹ بنا دیتا تھا [مثلاً کوشش کو کوسس اور کسرت کو کشرت]۔

وہ دونوں تفریح کے گھنٹے کے دوران میں کہیں غائب ہو جاتے تھے۔ ایک دن مجھے ذرا کرید ہوئی اور میں ٹوہ لگانے دبے پاؤں ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ انھیں پتا تب چلا جب وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکے تھے اور چاکری اپنی جیب سے سگرٹ کی ڈبیا نکال چکا تھا۔ مجھے دیکھ کر دونوں قدرے محجوب ہو گئے مگر کر کچھ نہیں سکتے تھے۔ اپنی خفت مٹانے کے لیے دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ چاکری نے ڈبیا سے دو سگرٹ نکالے، ماچس سے جلائے، ایک اپنے منہ میں ٹھوس لیا اور دوسرا لال سنگھ کو تھما دیا۔ لال سنگھ نے سوچا کہ میرا منہ بند کرنے کے لیے کیوں نہ ایک سگرٹ کا ذائقہ مجھے بھی چکھا دیا جائے چنانچہ اس نے اپنا سگرٹ مجھے پکڑا دیا اور بولا: "پیو، میرے یار، تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کس رئیس سے پالا پڑا تھا۔" چاکری نے اس کے لیے نیا سگرٹ سلگا دیا۔

---

1- ہندو ماشکی چمڑے کا مشکیزہ یا مشک استعمال نہیں کرتے تھے۔

سگرٹ لیمپ کا تھا۔ یہ اس زمانے کی ولایتی فرم امپیریل ٹوبیکو کمپنی آف انڈیا کا بنایا ہوا تھا [پاکستان ٹوبیکو کمپنی اسی کی جانشین ہے] اور اپنے زمانے کا ارزاں ترین سگرٹ تھا۔ میں نے اس سے گھٹیا سگرٹ نہ کبھی دیکھا ہے اور نہ پیا ہے۔ تاہم دیہاتیوں اور شہروں کے غریب غربا میں یہ بے حد مقبول تھا۔ یاروں نے اس کے متعلق ایک کہاوت بھی گھڑ لی تھی:

پانی پمپ دا سگرٹ لمپ دا

میں نے اس سے پہلے سگرٹ تو کیا، کبھی حقے کو بھی منہ نہیں لگایا تھا حالانکہ میرے ابا اور چچا دونوں ہی اس کے بے حد شوقین تھے۔ سگرٹ کا پہلا کش لگاتے ہی میرے چودہ طبق روشن ہو گئے اور میں کھو کھو کرنے لگا۔ میں نے سگرٹ فوراً وہیں زمین پر پھینک دیا اور پاؤں سے مسل دیا۔ لال سنگھ نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہنس کیوں رہا ہے۔ ذرا دم لینے کے بعد لال سنگھ بولا: ''بڑا اصلا بنیا پھردا اے، سگرٹ دا تو ہی گھٹ لگاؤں دے سارا ای بے ہوش ہندے ہندے بچیا ای۔ میتوں ویکھ، سکھ ہوندے وی کنے مزے نال سگرٹ پی رہا آں۔'' [اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ سکھ تمباکو نوشی نہیں کرتے۔]

18

میرے دو ماموں تھے۔ دونوں بڑے سادہ، سیدھے سادے لوگ تھے اور زمانے کی اونچ نیچ سے قطعی ناواقف مگر اخبار پڑھنے کے بے حد شوقین تھے۔ وہ شہ سرخی سے لے کر اخبار کی پرنٹ لائن تک اشتہارات سمیت سب کچھ پڑھ جاتے تھے، پھر زور زور سے بحثیں کرتے تھے اور دور دور کی کوڑی لاتے تھے۔ دونوں سکول ٹیچر تھے۔ چھوٹے ماموں اپنے گاؤں کے قریب ہی مبت پور کے مڈل سکول میں پڑھاتے تھے لیکن بڑے ماموں عبدالواحد کو قسمت گھیر گھار کر قصور لے گئی تھی۔ وہ شادی شدہ تھے اور دو بیٹوں کے باپ لیکن ان کی اہلیہ کبھی ان سے خوش نہ رہ سکی۔ وہ ماڈرن زمانے کی عورت تھی۔ اس کا بدن چھریرا، ناک نقشہ ٹھیک ٹھاک اور قد قدرے اونچا تھا۔ وہ نئے فیشنوں پر جان دیتی تھی اور ماموں کا ناطقہ بند کیے رکھتی تھی۔ ماموں کبھی اس کی رمزیں نہ سمجھ سکے۔ وہ جب کبھی قصور سے ہمارے ہاں آتے، ان کی بیوی اور بچے کبھی ان کے ہم رکاب نہیں ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ تشریف لائے، وہ اور اماں اکثر آپس میں کھسر پھسر کرتے رہتے

تھے۔ اماں کرید کرید کر سوال پوچھتی رہتی تھی۔ ایک دن جب میں باہر سے گھر آیا تو دروازے کی دہلیز پر طلاق کا لفظ میرے کانوں میں پڑا۔ اس وقت مجھے اس کی اہمیت (significance) معلوم نہیں تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ماموں کی چھیل چھبیلی اور فیشن پسند بیوی کا کسی تھانے دار کے ساتھ آنکھ مٹکا ہو گیا ہے اور وہ طلاق کا مطالبہ کر رہی ہے۔ جب آپ کا مقابلہ کسی تھانے دار سے ہو جائے، آپ اس کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں، وہ تو آپ کا جینا حرام کر دے گا۔ ماموں کو طلاق دیتے ہی بن پڑی۔

ممانی جاتے جاتے اپنے دونوں بیٹے بھی ساتھ لے گئی۔ ماموں چھڑے چھانٹ رہ گئے۔ انھوں نے زندگی بھر دوبارہ کبھی شادی کا نام نہ لیا۔ آخر عمر میں جب ممانی فوت ہو چکی تھی، بڑے بیٹے نے باپ کے ساتھ صلح کر لی۔ وہ شادی شدہ تھا۔ اس کی بیوی انتہائی تمیز، سمجھدار اور نیک فطرت لڑکی تھی۔ اس نے اپنے سسر کی دل و جان سے خدمت کی۔ پہلے اوکاڑا کے قریب ایک گاؤں میں جہاں قیام پاکستان کے بعد ماموں پڑھاتے تھے، ان کے ساتھ رہی، پھر وہ اور اس کا شوہر شجاع آباد چلے گئے جہاں دونوں کو ملازمت مل گئی تھی۔ پھر ایک دو سال بعد جب ماموں ریٹائر ہوئے، وہ انھیں بھی اپنے ساتھ لے گئی اور ان کے انتقال تک انھیں ہر ممکن سکھ پہنچاتی رہی۔

ماموں کا چھوٹا بیٹا (میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی) خاصا پڑھ لکھ گیا تھا اور لائل پور کی کسی ٹیکسٹائل مل میں کسی خاصے بڑے عہدے پر فائز ہو گیا تھا۔ وہاں اس نے کسی سید گھرانے میں شادی کر لی اور خود بھی سید کہلانے لگا۔ ماموں تک خبر پہنچی تو وہ ہکا بکا رہ گئے۔

چھوٹے ماموں کی شادی اپنی چچازاد بہن سے ہوئی تھی۔ بظاہر وہ اپنی شادی پر بہت مطمئن معلوم ہوتے تھے، لیکن ان کی اولاد کوئی نہیں تھی، وہ اوائل عمر میں (لا اولاد) ہی فوت ہو گئے۔ سکول کے زمانے میں ان کے ایک گہرے دوست تھے۔ نام ان کا محمد اقبال تھا۔ وہ گھور لودھیاں ریلوے لائن پر واقع ایک سٹیشن گاہندراں کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے اچھی خاصی تعلیم پائی تھی مگر ڈھنگ کی ملازمت حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ تنگ آ کر وہ حیدر آباد دکن چلے گئے۔ وہاں انھیں حسب منشا ملازمت مل گئی مگر بہت جلد بیزار ہو گئے۔ انھیں شعر و شاعری اور ادب سے بڑا لگاؤ تھا اور اپنے حیدر آباد کے قیام کے دوران میں ان کے متعدد ادیبوں، مورخوں اور دیگر لکھاریوں کے ساتھ مراسم استوار ہو گئے تھے۔ انھوں نے ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد چولا بدلا اور اپنے گاؤں کے نام کی رعایت سے اپنا نام اقبال سلیم گاہندری رکھا اور نفیس اکیڈمی کے نام سے اپنا ایک اشاعتی ادارہ قائم کر لیا۔

نفیس اکیڈمی نہایت اچھے چکنے کاغذ پر بہت عمدہ کتابت شدہ کتابیں چھاپتی تھی۔ ان میں سے دو

کتابیں جو مجھے خاص طور پر پسند آئی تھیں، وہ مولانا عبدالرزاق کانپوری کی "البرامکہ" اور "یادِ ایام" تھیں۔ "یادِ ایام" کمال کی کتاب ہے۔ اس میں بعض عظیم ادیبوں کے خاکے بھی ہیں اور موسیقی اور رقص کے بارے میں تفصیلات بھی۔ اس قسم کی تفصیلات اتنی خوبصورت زبان میں شاید ہی کسی اردو کی کتاب میں دی گئی ہوں گی۔

قیامِ پاکستان کے بعد اقبال سلیم گاہندری نفیس اکیڈمی کراچی لے آئے اور جب تک زندہ رہے، بڑے اہتمام سے نت نئی کتابیں چھاپتے رہے۔ ان کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے کسی کو بھی کتابوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ ایک بہت اچھی پبلشنگ فرم بند ہوگئی۔ ان کا ایک بیٹا خالد اقبال پہلے انگلستان اور پھر امریکا چلا گیا۔ وہاں وہ سلے سلائے ملبوسات کا کاروبار کرتا ہے۔ اسے آپ حسنِ اتفاق ہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کی شادی مانچسٹر میں آباد ہمارے عزیزوں میں ہوئی تھی۔

ہمارے سکول میں ایک چھوٹی سی لائبریری تھی۔ اس میں تمام کی تمام کتابیں اردو میں تھیں، لیکن جس کسی نے بھی ان کا انتخاب کیا تھا، اس کے ذوقِ سلیم کی داد دینا پڑتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد، مصورِ غم علامہ راشد الخیری، عبدالحلیم شرر، حسن نظامی، رتن ناتھ سرشار، غالب، اقبال کی مختلف تصانیف اور نول کشور بک ڈپو لکھنؤ، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، دارالاشاعت پنجاب لاہور وغیرہ کی مطبوعہ دیگر تصانیف کے علاوہ نقشِ چغتائی کا ایک نسخہ بھی موجود تھا۔ مجھے اب بھی بعض اوقات افسوس ہوتا ہے کہ ترکِ وطن کے موقع پر میں اس نسخے کو چرا کر کیوں نہ لایا حالانکہ یہ کام بہت آسان تھا۔ پتا نہیں ہماری جگہ وہاں آباد ہونے والے سکھوں نے اس کا اور اردو کی دیگر نفیس کتابوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا؟ وہی کیا ہوگا جو ہم نے یہاں اپنی لائبریریوں میں ہندی، سنسکرت اور گورمکھی کی کتابوں کے ساتھ کیا ہے۔ نہ وہاں اردو پڑھنے والے رہے اور نہ یہاں ہندی، سنسکرت اور گورمکھی پڑھنے سمجھنے والے۔ جو ہیں ان کی گنتی ہاتھ کی انگلیوں پر کی جا سکتی ہے۔

خیر، ہماری اس چھوٹی سی لائبریری میں ہمایوں، عالمگیر، نیرنگِ خیال، شہکار اور زمانہ (کانپور) جیسے اعلیٰ معیار کے رسائل بھی منگوائے جاتے تھے اور بعض اساتذہ، جن میں منشی غلام حیدر بھی شامل تھے، ان کا بہت شوق سے مطالعہ کرتے تھے۔ بچوں کے جو رسائل آتے تھے ان میں دارالاشاعت پنجاب کا پھول، فیروز سنز کا تعلیم و تربیت اور مولانا تاجور نجیب آبادی کا ہونہار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ہم طلبا کا مسئلہ یہ تھا کہ ہمیں نہ کوئی کتاب دی جاتی تھی اور نہ کوئی رسالہ۔ میرے جیسے طالب علم جو درسی کتب کے علاوہ بھی کچھ نہ کچھ پڑھنے کے شوقین تھے، وہ الماریوں میں سجی کتابوں پر شیشے میں سے حسرت کی نظر ڈال کر آگے گزر جایا کرتے تھے لیکن اللہ مسبب الاسباب ہے، اس نے میرے لیے ایک صورت پیدا کر ہی دی۔

لائبریری کے انچارج عربی کے استاد مولوی عبدالرحمٰن تھے۔ دیکھنے میں وہ بہت متشرع تھے مگر ساتھ ہی وہ بہت نستعلیق بھی تھے۔ ایک دن انھیں خیال آیا کہ گتے جیسے دبیز سفید کاغذ پر قرآن مجید کی آیات لکھوائی جائیں اور انھیں لائبریری کے کمرے میں آویزاں کر دیا جائے۔ کتابت کے لیے ان کی نظرِ انتخاب مجھ پر پڑی۔ جانے نہیں کیوں؟ شاید انھیں اندھوں میں میں ہی کانا نظر آیا تھا۔ جب انھوں نے مجھے اپنے اس منصوبے سے آگاہ کیا، میں بہت سٹپٹایا کیونکہ مجھے یقین نہیں تھا کہ میں یہ کام کر سکوں گا۔ میں ٹھیک ٹھاک لکھ لیتا ہوں مگر اتنا اچھا بھی نہیں کہ اپنے آپ کو خوش خط کہہ سکوں۔ ہم مولوی صاحب کا اتنا احترام کرتے تھے کہ مجھ میں انکار کا حوصلہ نہ ہوا۔ تاہم ڈرتے جھجکتے اتنا عرض کر دیا: ''کیا آپ لائبریری کی کتابیں اور رسالے پڑھنے کے لیے مجھے دے دیا کریں گے؟'' مولوی صاحب نے جھٹ فرمایا: ''یہ کون سی بڑی بات ہے، میں تمھیں ایک الماری کی چابی دے دیتا ہوں، تمھیں جو کتاب یا رسالہ پسند آئے، جب جی چاہے لے جایا کرو۔ ہاں، پڑھنے کے بعد اسے واپس رکھ دیا کرو اور نیا لے جایا کرو۔''

اپنی عید ہو گئی۔ میں نے پہلے تو پھول کی تمام فائلیں چٹ کر ڈالیں۔ پھر بچوں کے دیگر رسائل پڑھ ڈالے۔ ایک ہوکا سا لگا تھا کہ تسکین پانے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ اس کے بعد کتابوں کی باری آئی۔ علامہ راشد الخیری اور ڈپٹی نذیر احمد کے نام تو سنے تھے لیکن ان کی کوئی کتاب پڑھنے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ کوئی ملی تھی نہ کوئی رہنمائی کرنے والا تھا۔ بہرحال علامہ راشد الخیری کی دو تصنیفات — آمنہ کا لال اور سیدہ کا لال — کے عنوان پرکشش نظر آئے۔ زندگی میں پہلی بار آں حضرت ﷺ کی حیات طیبہ اور امام حسینؓ کی داستان دل خراش پڑھنے کا موقع نصیب ہوا۔ پھر صبح زندگی، شام زندگی اور شب زندگی پڑھ ڈالیں۔ ان سب میں ایک بات مشترک نظر آئی اور وہ تھی عورت کی مظلومیت کا مؤثر اور دل نشین انداز سے بیان۔ اسی لیے انھیں مصورِ غم کا خطاب دیا گیا تھا۔

انیسویں صدی کی طرح ہمارے زمانہ طالب علمی میں بھی ڈپٹی نذیر احمد کے ابتدائی دو ناولوں — مراۃ العروس اور بنات النعش — کا بڑا چرچا تھا۔ دونوں ہی ہماری لائبریری میں موجود تھیں۔ مجھے اب ڈپٹی صاحب کی بعض باتوں سے اختلاف ہے لیکن میں دیانت داری سے سمجھتا ہوں کہ ان کا اردو ادب پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اسے ادب کی نئی صنف — ناول — سے روشناس کرایا۔ بال کی کھال نکالنے والے ادیب بھلے مرزا ہادی حسن رسوا کی تصنیف امراؤ جان ادا کو صحیح معنوں میں اردو کا پہلا ناول قرار دیتے رہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر ڈپٹی نذیر احمد یہ نئی راہ نہ تراشتے تو شاید امراؤ جان ادا بھی وجود میں نہ آتی۔

سکول کی لائبریری سے جو اور دو کتابیں ملیں اور بڑے شوق سے پڑھیں، وہ امتیاز علی تاج کی چچا چھکن اور پیارے لال آشوب کی نت کھٹ پانڈے تھیں۔ دونوں کتابیں علی الترتیب انگریز مصنفین جیروم کے جیروم (Jerome K. Jerome) کی Three Men in a Boat اور ٹامس ہیوز (Hughes) کی Tom Brown's School Days کا ترجمہ ہیں لیکن کیا ترجمہ ہیں، اصل مصنف یاد ہی نہیں آتا، بالکل طبع زاد تخلیق (original) معلوم ہوتی ہیں۔ پیارے لال آشوب کی کتاب آخر میں ناصحانہ انداز اختیار کر لیتی ہے مگر امتیاز علی تاج کی کتاب شروع سے آخر تک مزاح و ظرافت سے بھرپور ہے۔

حسن نظامی سے میرا تعارف عجیب و غریب انداز سے ہوا۔ چونکہ ہمارا گاؤں علاقے کا سب سے بڑا گاؤں تھا اور اسے ایک قسم کی مرکزی حیثیت حاصل تھی، اس لیے جو سرکاری افسر اس علاقے کے دورے پر آتا تھا، وہ ہمارے گاؤں کے مڈل سکول کی عمارت میں قیام کرتا تھا۔ اس عمارت میں کمرے کافی تھے اور اس کی گراؤنڈ بھی خاصی بڑی تھی۔ ڈپٹی کمشنر عموماً انگریز ہوتا تھا۔ وہ ڈیڑھ دو سال بعد اپنی میم سمیت لازماً چکر لگاتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا عملہ اور نوکر چاکر بھی ہوتے تھے۔ سب کی رہائش کے لیے سکول کی گراؤنڈ میں خیمے نصب ہو جاتے تھے۔ سب لوگ چونکہ گھوڑوں پر آتے تھے، اس لیے گھوڑوں کو ٹھہرانے کا الگ انتظام ہوتا تھا۔ انگریزوں کا اس زمانے میں اتنا رعب داب تھا کہ کسی مقامی شخص کو ادھر جانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ پورے ہندوستان میں سول انتظامیہ اور فوج دونوں میں انگریزوں کی تعداد صرف چھ ساڑھے چھ ہزار سے کبھی متجاوز نہیں ہوتی تھی لیکن وہ کس شان سے اتنے بڑے ملک پر حکومت ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کو پوری طرح اپنے شکنجے میں بھی کس رکھا تھا۔ ڈپٹی کمشنر اور اس کی میم سارا دن ارد گرد کے دیہاتوں کا دورہ کرتے، لوگوں کے مسائل سنتے اور موقع پر ہی انھیں حل کر دیتے۔ صرف شب بسری کے لیے وہ واپس خیموں میں آتے تھے۔ انگریز ڈپٹی کمشنر اپنے ضلع کے لوگوں کے حالات و معاملات میں گہری دلچسپی لیتے تھے اور ان کے بارے میں ہر قسم کی معلومات اکٹھی کرتے رہتے تھے۔ اس کا نتیجہ ایک کتاب کی صورت میں نکلتا تھا جسے ڈسٹرکٹ گزیٹیر (District Gazetteer) کہا جاتا تھا۔ پاکستان کے کسی ڈپٹی کمشنر کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ وہ انھیں اپ ٹو ڈیٹ (up to date) کرا دیتا۔ حنیف رامے نے اپنے دورِ حکومت میں ہمارے دوست سعید محمود کو اس کام پر مامور کیا مگر سعید محمود اپنی کسی مجبوری کے تحت کراچی چلا گیا، پھر وہاں بہت جلد فوت ہو گیا۔ یوں یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔

سکولوں کا معائنہ کرنے کے لیے کبھی اے ڈی آئی (اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر) اکیلے ہی اور کبھی ڈی آئی (ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز) کی معیت میں آتے تھے۔ جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں، اسی

زمانے میں اے ڈی آئی میاں عبدالخالق اور ڈی آئی میاں احمد الحسن تھے۔ دونوں اکثر دورے پر آتے رہتے اور سکول کی عمارت میں ہی قیام کرتے تھے۔ دونوں کی ہمارے اساتذہ کے ساتھ گاڑھی چھنتی تھی۔ اساتذہ عام دنوں میں باقی دیہاتیوں کی طرح دھوتیاں ہی پہنتے تھے مگر جب دورے کی اطلاع ملتی وہ اپنے افسران کے احترام میں اپنے ٹرنکوں سے تہ کی ہوئی شلواریں نکالتے اور پہن لیتے۔

ایک سال جب میں ساتویں یا آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا، خود ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز تشریف لے آئے۔ ان کا پورا نام تو مجھے یاد نہیں رہا لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ موہن ان کے نام کا حصہ تھا۔ وہ خاصے گورے چٹے خوش شکل انسان تھے۔ انھیں تاریخ سے بہت شغف تھا اور ان کی تاریخ ہند پر ایک دو کتابیں بھی شائع ہو چکی تھیں۔ انھیں معلوم نہیں کیا سوجھی کہ جون جیسے گرم مہینے میں دورے پر آ نکلے۔ وہ صبح کو تو اردگرد کے سکولوں کے معائنے پر نکل جاتے تھے مگر دوپہر کو ہمارے سکول کے ایک کمرے میں آرام کرتے تھے۔ کمرے کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے اس کے فرش پر چھڑکاؤ کر دیا جاتا تھا۔ کمرے کے عین درمیان میں ایک چارپائی رکھوا دی جاتی اور اس پر اجلی چادر بچھا دی جاتی۔ چارپائی کے اوپر سنگی پنکھا لٹکا دیا جاتا جسے جھلانے کے لیے ساتویں یا آٹھویں جماعت کے کسی طالب علم کی ڈیوٹی لگا دی جاتی۔

ایک روز انھیں پنکھا جھلنے کی ڈیوٹی مجھے تفویض ہوئی۔ میں وقت مقررہ پر ان کے کمرے میں پہنچ گیا، نیچے فرش پر بیٹھ گیا اور پنکھا جھلنے لگا۔ موہن صاحب چارپائی پر لیٹے لیٹے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ پڑھتے پڑھتے انھیں نیند آ گئی۔ انھوں نے کتاب تکیے کے قریب رکھی اور سو گئے۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ دنیا و مافیہا سے غافل ہو چکے ہیں، میں دبے پاؤں ان کی چارپائی کی طرف بڑھا اور ڈرتے جھجکتے کتاب اٹھالی۔ واپس آیا، کچھ دیر پنکھا جھلتا رہا، پھر پنکھا بھول کر کتاب پڑھنے لگا۔ یہ حسن نظامی کی ''مغل شہزادیوں کی بپتا'' تھی۔ پہلی کہانی ایک نوخیز مغل شہزادی کے متعلق تھی جو 1857 میں بہادر شاہ ظفر کی فوجوں کی شکست کے بعد اپنی جان بچانے کی خاطر باقی مغل شہزادیوں اور بیگمات کی طرح قلعہ معلیٰ سے چادر منہ اٹھایا، ادھر بھاگ کھڑی ہوئی تھی لیکن بدقسمتی سے وہ ریچھ یا حصار کے جاٹوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ ان لوگوں نے اسے جس جس طرح تنگ کیا، اس سے چکی پسوائی، گوبر اٹھوایا، مویشیوں کے لیے چارہ کٹایا اور اسی طرح کے دیگر کام کرائے۔ ان سب کا بیان اگرچہ انتہائی دل فگار و دل خراش تھا مگر طرز تحریر اتنا دل کش تھا کہ میں اس میں اس طرح کھو گیا کہ گرد و پیش کا کوئی ہوش نہ رہا۔ انسپکٹر صاحب ایک ڈیڑھ گھنٹہ تو خواب خرگوش کے مزے لیتے رہے، پھر انھوں نے جھرجھری لی اور آنکھیں کھول دیں۔ ان کا پورا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ مہمان تو جاگ گئے ہیں۔ میری تو جان ہی نکل گئی۔ موہن صاحب

ڈانٹنے کی بجائے مسکرا کر مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کاپی کتاب ان کے تکیے کے قریب رکھ دی اور دوبارہ پنکھا جھلنے لگا مگر انھوں نے مجھے روک دیا اور گھر جانے کی اجازت دے دی۔ انھوں نے غالباً ہیڈ ماسٹر صاحب سے میری کوئی شکایت نہیں کی تھی کیونکہ کسی نے میری جواب طلبی نہیں کی۔ کیا بھلا زمانہ تھا اور کیا بھلے لوگ تھے۔

## 19

بیٹ کے دیہاتوں میں زیادہ تر وہی کھیل کھیلے جاتے تھے جو پنجاب کے دیگر دیہاتوں میں کھیلے جاتے تھے بلکہ اب بھی کھیلے جاتے ہیں اور بعض تو شہروں میں بھی مروج رہے ہیں۔ ہمارے مڈل سکول میں زیادہ تر فٹ بال کھیلنے کا دستور تھا۔ کوئی کھلانے والا نگران تو ہوتا نہیں تھا لڑکے خود ہی دو ٹیمیں بنا کر کھیلتے رہتے تھے۔ خوب دھکم پیل اور بھاگ دوڑ ہوتی تھی۔ گول پوسٹ کی جگہ گراؤنڈ کے دونوں جانب ایک دوسری سے کچھ فاصلے پر دو دو اینٹیں رکھ دی جاتی تھیں اور انھیں ہی گول قرار دے دیا جاتا تھا۔ کھیل کے قواعد وضوابط کیا ہوتے ہیں، ان کا کسی کو کچھ علم نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے رول یا رونڈ (فاؤل) عام چلتا تھا، لیکن اس کی کسی کو پروا نہیں ہوتی تھی۔ اصل مقصد تو کھیلنا اور لطف اندوز ہونا ہوتا تھا اور کھلاڑی لطف اندوز خوب ہوتے تھے۔

ہماری حویلی کے قریب جو کھیت تھا، جب وہ خالی ہوتا ولی محمد اس میں چھڑکاؤ کرواتا، والی بال کا جال (net) لگواتا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ والی بال کھیلتا رہتا۔ مگر گاؤں کے عام لوگ، جنھیں کھیلوں سے رغبت ہوتی، وہ ان روایتی کھیلوں میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ وہ زیادہ تر ایک دوسری کی بینی[1] پکڑتے، کشتی کرتے یا کبڈی کھیلتے تھے۔ کبڈی کو پنجابی میں کوڈی کہا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ دنیا کا سستا ترین کھیل ہے۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری، رنگ بھی چوکھا آنے والا معاملہ ہے۔ قمیص کوئی پہنی نہیں جاتی، صرف جانگیا ہی کافی ہے اور اگر جانگیا بھی نہیں، دھوتی ہی کو لنگوٹ بنایا جا سکتا اور میدان میں اترا جا سکتا ہے۔ میدان بھی کوئی خاص بڑا نہیں ہوتا اور اگر میدان میسر نہیں، کھیت میں بھی کھیلی جا سکتی ہے۔ میدان یا کھیت کے مقررہ حصے کے درمیان میں لکیر کھینچ دی جاتی ہے۔ دونوں ٹیموں کے کھلاڑی اپنی اپنی اطراف کے سروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کھلاڑیوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں ہوتی۔ یہ پانچ بھی ہو سکتے ہیں، سات بھی وغیرہ۔ جس ٹیم نے کھیل کا آغاز کرنا ہوتا ہے، اس کا ایک کھلاڑی کوڈی کہتا مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں کی

---

1- کلائی کرنا یا پنجہ لڑانا۔

طرف دوڑتا ہے۔ اس نے کسی کھلاڑی کو چھونا اور سانس توڑے بغیر درمیانی لکیر تک واپس آنا ہوتا ہے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ جو کھلاڑی کوڈی کوڈی کہتا مخالف ٹیم کی طرف بھاگتا ہے، اسے سائی[1] کہا جاتا ہے اور جس کھلاڑی کو وہ چھوتا ہے، وہ جاپھی کہلاتا ہے کیونکہ وہ چھونے والے کھلاڑی کو جپھا مارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب سائی اور جاپھی میں گھول[2] شروع ہو جاتا ہے۔ اگر سائی کوڈی کوڈی کہتا اپنے کو چھڑانے اور درمیانی لکیر تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے، تو وہ جیت جاتا ہے اور اسے ایک پوائنٹ مل جاتا ہے، بصورت دیگر جیت مخالف ٹیم کے کھلاڑی کے کھاتے میں چلی جاتی ہے۔

قومی اور بین الاقوامی سطح پر جو کبڈی کھیلی جاتی ہے، اس میں سائی کوڈی کوڈی نہیں کرتا، اسے صرف مخالف ٹیم کے کسی کھلاڑی کو چھونا اور واپس آنا ہوتا ہے۔ اگر وہ جاپھی کے ہتھے چڑھ جائے [قبضے میں آجائے] اور کسی صورت اپنے آپ کو چھڑا نہ سکے اور بے بس ہو جائے، پھر وہ خود ہی اپنی ہار تسلیم کر لیتا ہے۔

بعض اوقات دوسرے دیہاتوں کے ساتھ کشتیوں یا کبڈی کے مقابلے ہو جاتے۔ اگر یہ مقابلے کسی دوسرے گاؤں میں ہوتے تو اپنے گاؤں کے بے شمار لوگ اپنے کھلاڑیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ان کے ساتھ ہو لیتے۔ بعض لوگ ڈھول بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔ خوب دھوم دھڑکا ہوتا۔

گلی ڈنڈا تو نوجوان لڑکوں میں عام چلتا تھا اور یہ سارے شمالی ہندوستان کا مقبول عام کھیل تھا۔ شہروں میں تو اب یہ تقریباً ختم ہو چکا ہے لیکن دیہاتوں میں اب بھی کھیلا جاتا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ خطرناک کھیل ہے۔ ڈنڈا تو بے ضرر سی چیز ہے لیکن گلی چونکہ نوکیلی ہوتی ہے اور اگر اتفاقاً چہرے پر لگ جائے تو خاصا ضرر پہنچا سکتی ہے۔ بعض اوقات تو آنکھ بھی زد میں آجاتی ہے۔ ہمارے ہاں گلی ڈنڈا کھیلنے کے لیے کسی میدان، کھیت یا سڑک پر ایک چھوٹا سا سوراخ بنایا جاتا تھا، اسے کھتی کہا جاتا تھا۔ یہ کھتی ایک طرف ذرا نوکیلی ہوتی تھی۔ جب کھیل شروع ہوتا، گلی اس کی نوک پر افق کے متوازی رکھی جاتی اور کھیلنے والا کھلاڑی اپنا ڈنڈا کھتی میں گلی کے نیچے رکھ کر پورے زور سے اوپر اچھال کر دور سے دور پھینکنے کی کوشش کرتا۔ دوسرے کھلاڑی [ان کی کوئی تعداد مقرر نہیں ہوتی تھی، یہ ایک بھی ہو سکتا تھا اور ایک سے زیادہ بھی] اسے پکڑنے کی کوشش کرتے۔ اگر گلی پکڑی جاتی، تو کھیلنے والے کھلاڑی کی باری ختم ہو جاتی اور پکڑنے

---

1- سائی پنجاب کی ایک خاص معروف قوم ہے۔ سائی وال شہر کا نام بھی اسی قوم کے نام پر رکھا گیا ہے۔ کھلاڑی کو سائی اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ قوم کبڈی کھیلنے میں بہت مشہور ہے۔ پنجابی میں سانس کو ساہ کہا جاتا ہے۔ یہ بھی کھلاڑی کو سائی کہنے کی وجہ تسمیہ ہو سکتی ہے۔

2- زور آزمائی۔ پنجابی میں کشتی کو گھول بھی کہا جاتا ہے۔ جنسی معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں اس کا صحیح متبادل ملنا ناممکن ہے۔

والے کی شروع ہو جاتی۔ اگر گلی کسی کے ہاتھ نہ آتی اور زمین پر گر پڑتی، پھر کھیلنے والا کھلاڑی وہاں پہنچتا جہاں گلی زمین پر گری پڑی ہوتی تھی۔ وہ اپنے ڈنڈے سے گلی کے ایک نوکیلے سرے پر ضرب لگا کر پہلے اسے فضا میں اچھالتا اور پھر پورے زور سے دوبارہ ضرب لگانے کی کوشش کرتا۔ اس ضرب کو 'ٹل'[1] کہا جاتا تھا۔ اگر کھلاڑی ٹل لگانے میں ناکام ہو جاتا یا ٹل لگانے میں تو کامیاب ہو جاتا مگر گلی کسی دوسرے کھلاڑی کے ہاتھ آ جاتی، دونوں صورتوں میں اس کی باری ختم ہو جاتی۔ اس کھیل میں کوئی پوائنٹ نہیں ہوتے تھے، کھلاڑی جب تک جی چاہے کھیلتے رہتے تھے۔

ہاکی سے ملتا جلتا ایک کھیل بھی ہمارے ہاں بہت مقبول تھا۔ [پنجاب کے بعض دوسرے علاقوں میں بھی یہ کھیلا جاتا تھا مگر کھیلنے کے انداز میں کہیں کہیں فرق پایا جاتا تھا۔] اسے عموماً کھدو کہا جاتا تھا۔ کھدو دراصل ایک قسم کا گیند ہوتا تھا۔ یہ کپڑے کی دھجیوں یا کترنوں کو ایک دوسرے کے اوپر لپیٹ کر بنایا جاتا تھا۔ یہ گھروں میں عموماً مائیں بہنیں بنا دیتی تھیں۔ جب کھدو تقریباً کرکٹ کے گیند کے برابر ہو جاتی، وہ اس کے اوپر رنگین دھاگوں کی گنجان سلائی کر دیتی تھیں۔ یوں کھدو خاصی مضبوط ہو جاتی اور خوبصورت بھی نظر آتی تھی۔ اس کھیل میں بھی کھلاڑیوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں ہوتی تھی، دو لڑکے بھی آپس میں کھیل سکتے تھے اور دس بارہ بھی۔ میدان یا کھیت کے مقررہ حصے کے عین درمیان میں گلی ڈنڈے کے کھیل کی طرح کھتی بنائی جاتی تھی۔ کھلاڑیوں کے ہاتھوں میں ہاکی سٹک سے ملتے جلتے ڈنڈے ہوتے تھے۔ یہ ڈنڈا کسی درخت (عموماً ٹاہلی/شیشم) کا دو شاخہ کاٹ کر بنایا جاتا تھا۔ دو شاخے کی پتلی شاخ کو کاٹ کر اتنا چھوٹا کر دیا جاتا کہ ایک قدرتی ہک (hook) بن جاتا۔ باقی تراش خراش ترکھان کر دیتا۔ جب کھیل شروع ہوتا، ہر کھلاڑی کی کوشش ہوتی کہ وہ کھدو کو کھتی میں ڈال سکے۔ ہر کامیابی پر ایک پوائنٹ یا نمبر مل جاتا، جس کھلاڑی یا ٹیم کے زیادہ نمبر بنتے، وہ فاتح قرار پاتی۔

indoor games عموماً گھروں کے اندر بیٹھ کر کھیلے جاتے ہیں مگر بعض اوقات گھروں میں کافی گنجائش نہ ہونے کے سبب یا شور شرابے کے ڈر سے گاؤں میں جہاں بھی مناسب جگہ مل سکے لڑکے وہیں بیٹھ کر اس قسم کے کھیل کھیل لیتے ہیں۔ ہمارے گاؤں کے تکیے میں ایک بوڑھ (بڑ) کا درخت تھا۔ اس کے اردگرد خاصا اونچا اور چوڑا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ ہم عموماً اسی چبوترے پر بیٹھ کر کھیلا کرتے تھے۔ چکڑی، بارہ ٹہنی، اڈا کھدا وغیرہ مقبول عام کھیل تھے اور سب ایک دوسرے سے تقریباً ملتے جلتے ہیں اور پنجاب کے اکثر دیہاتوں میں اب بھی مروج ہیں۔

---

1۔ پنجابی میں ٹل لگ جانا بطور محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کا مفہوم ہے ٹل جانا / لگ جانا ہے۔

ان میں سب سے دلچسپ اور پرلطف پچیزی ہے۔ اسے اردو میں پچیسی کہا جاتا ہے۔ ایک زمانے میں یہ پنجاب ہی کا نہیں، کم از کم سارے شمالی ہند کا مقبول عام کھیل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کھیل 500 عیسوی کے لگ بھگ ہندوستان میں ایجاد ہوا تھا اور عوام کے علاوہ راجوں، مہاراجوں اور بعد میں مسلمان بادشاہوں کا بھی پسندیدہ کھیل بن گیا تھا۔ اس لیے اسے شاہی کھیل بھی کہا جاتا تھا۔ عام لوگ اس کھیل کو کپڑے کی بساط پر کھیلتے ہیں۔ اس بساط کے چار بازو ہوتے ہیں اور بیچ میں جگہ خالی ہوتی ہے۔ اس کا پانسا چھ رخی ہوتا ہے۔
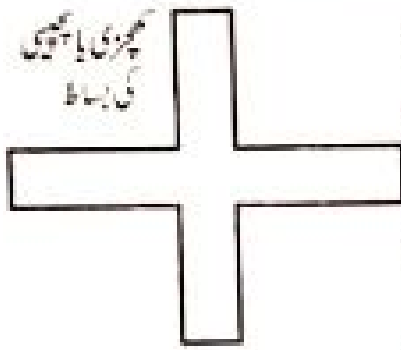
پچیزی یا پچیسی کی بساط

پانسے کے ان چھ رخوں پر 1، 2، 3، 4، 5 اور 6 کے ہندسے درج ہوتے ہیں۔ اس کی نردیں عموماً کوڑیاں ہوتی ہیں۔ کھیلنے والا پانسے کو ایک بہت ہی چھوٹی سی پیالی میں ڈالتا ہے، پیالی کو ہلاتا جاتا ہے اور پھر اسے بساط پر انڈیل دیتا ہے۔ پانسے کا جو رخ اوپر آتا ہے، اس پر جو نمبر درج ہوتا ہے، وہ اس کے مطابق اتنے ہی خانے یا گھر اپنے پیادے یا نرد کو چلاتا ہے۔ بعض کھیلوں میں دو پیادے بھی بیک وقت چلائے جاتے ہیں۔ اگر حریف کا پیادہ بیچ میں آجائے تو وہ پٹ جاتا ہے۔ بساط کے ہر بازو میں پچیس خانے یا گھر ہوتے ہیں۔ اس لیے شاید اسے پچیسی کہا جاتا ہے۔ یہ پیادے یا نردیں عموماً کوڑیوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ کھلاڑی کو اپنی نردیں بیچ میں خالی جگہ پہنچانا ہوتی ہیں۔ جو کھلاڑی سب سے پہلے اپنی نردیں منزل مقصود پر پہنچاتا ہے، وہ کامیاب یا فاتح قرار پاتا ہے۔

میرے بچپن میں لڑکے یہ کھیل کپڑے کی بساط پر نہیں کھیلتے تھے، وہ ورڑی زمین پر ہی لکیریں کھینچ کر بساط بنا لیتے تھے اور اسی پر کھیل لیتے تھے تاہم بزرگ کپڑے کی بساط ہی استعمال کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے راجے، مہاراجے، نواب اور بادشاہ کوڑیوں یا ہاتھی دانت کی نردیں استعمال نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے محل کے باہر عموماً باغ میں بہت بڑی پختہ بساط بنواتے تھے اور خانوں میں نردوں کی جگہ اپنی لونڈیوں کو کھڑا کرتے تھے۔ مغل شہنشاہ اکبر اعظم نے فتح پور سیکری میں جو بساط بنوائی تھی، اس کا نقشہ انٹرنیٹ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

پچیسی چلتے چلتے امریکا بھی پہنچ گئی۔ وہاں اسے کسی غلط فہمی کی بنا پر پارچیسی (parcheesi) کا نام دے دیا گیا اور اس کے قاعدے قوانین بھی اپنے گھڑ لیے گئے۔ برصغیر کی پچیسی اور امریکی پارچیسی میں بڑا فرق یہ ہے کہ ہمارے سو خانوں کے مقابلے میں ان کے ہاں ان کی تعداد 72 ہے۔ ہسپانیہ میں اس سے ملتا جلتا کھیل parchis کہلاتا ہے اور وہاں بے حد مقبول ہے۔

برصغیر میں اپنے قیام کے دوران میں انگریز بھی پچیسی میں بہت دلچسپی لیتے رہے اور اسے انگلستان بھی لے گئے۔ وہاں انھوں نے اس میں چند معمولی تبدیلیاں کیں اور اس کا نام لڈو (ludo) رکھ دیا۔ پھر یہی لڈو برصغیر بھی پہنچ گئی اور اس نے عورتوں اور بچوں میں بالخصوص بہت مقبولیت حاصل کر لی۔

مجھے معلوم نہیں کہ شہروں میں بارہ ٹہنی کھیلی جاتی ہے یا نہیں لیکن پنجاب کے دیہاتوں میں یہ اب بھی خاصا مقبول ہے۔ اس کا پانسا اور نردیں چوپڑ جیسی ہی ہوتی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اس کے خانے یا گھر صرف سولہ ہوتے ہیں۔ نردیں خانوں میں سیدھی بھی چلائی جا سکتی ہیں اور چاروں کونوں کو ملانے کی جو آڑی ترچھی لکیریں کھینچی ہوتی ہیں، ان پر بھی۔ دیہاتوں کے لوگ چوپڑ کی طرح بارہ ٹہنی کی بساط عموماً زمین پر لکیریں کھینچ کر بناتے ہیں۔
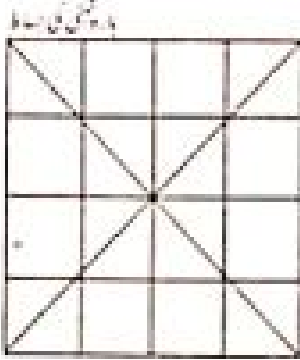
ساری دنیا کی طرح ہند میں بھی تاش کے مختلف کھیل بہت مقبول تھے۔ بیشتر لوگ رنگ، سویپ (sweep) یا سیپ اور رمی (rummy) کھیلتے تھے۔ ہمارے ہاں رنگ کو سریں بنانا بھی کہا جاتا تھا۔ اصلاً یہ کھیل گیارھویں صدی میں چین میں ایجاد ہوا تھا، گیارھویں صدی تک یہ سارے ایشیا میں پھیل چکا تھا اور چودھویں صدی میں یورپ بھی پہنچ گیا۔ پتوں کی تعداد باون ملوکوں کے زمانے (618 تا 907) میں مقرر ہوئی تھی جب وہ مصر میں برسر اقتدار تھے۔ ہندوستان میں ایک روایت یہ بھی گردش کرتی رہی ہے کہ ایک راجہ کی رانی اپنے پتی کی اس عادت سے بہت نالاں رہتی تھی کہ وہ ہر وقت اپنی داڑھی کے بال نوچتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس کے ہاتھوں کو داڑھی تک پہنچنے سے روکنے، انھیں مصروف رکھنے اور پھر اپنی تفریح طبع کے لیے اسے تاش کا یہ کھیل ایجاد کرنے کی سوجھی۔ تاہم یہ نرا افسانہ ہی ہے، اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

شروع میں یہ کھیل صرف امرا ہی کھیلتے تھے کیونکہ ان کے پتے ہاتھی کے دانتوں یا کچھوے کی ہڈیوں کے بنے ہوتے تھے اور ان پر ہیرے جواہرات جڑے ہوتے تھے۔ عام لوگ کھجور، ناریل جیسے درختوں کے پتوں یا چوبی کترنوں سے کھیلتے تھے۔ اسے مقبولیت تب حاصل ہوئی جب پرنٹنگ پریس کی ایجاد کے بعد موٹے کاغذ یا گتے کے پتے دستیاب ہونے لگے۔

ہمارے ہاں ایک باری جیتنے کو سر کرنا کہا جاتا تھا۔ انگریزی میں اسے hand اور اردو میں غالباً ہاتھ بنانا ہی استعمال ہوتا ہے۔ جو ٹیم سات سریں بنانے میں کامیاب ہو جاتی تھی، وہ فاتح قرار پاتی تھی۔ اس جیت کو کوٹ کرنا کہا جاتا تھا۔ اگر کوئی ٹیم مسلسل سات سریں بنا لیتی، تو دوسری ٹیم کے متعلق کہا جاتا کہ

اسے گھٹ کر کوٹ ہو گیا ہے۔ چونکہ انگریزی میں رنگ کو court piece کہا جاتا ہے، کوٹ غالباً اسی کی بگڑی شکل ہے۔

رنگ کی مدلّس (sophisticated) شکل کو برج (bridge) کہا جاتا ہے۔ یہ رنگ کی نسبت کہیں مشکل اور پیچیدہ ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ سریں بنانے کا دعویٰ کرنے والے کھلاڑی کا ساتھی کھیل سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ اس کے پتے سیدھے کر کے میز پر رکھ دیے جاتے ہیں اور باقی تینوں کھلاڑی انھیں دیکھ سکتے ہیں۔ کھیلنے والے کھلاڑی کو اپنے بھی اور اپنے دست بردار ہونے والے ساتھی کے پتے بھی چلنا ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ کھیل زیادہ تر شہروں میں کھیلا جاتا ہے۔ پاکستان نے اس کھیل میں بھی بین الاقوامی شہرت کے مالک چند نامور کھلاڑی پیدا کیے ہیں جن میں ضیا محمود خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ساہی وال میں میرے جاننے والوں میں ملک غلام جیلانی (پاکستان کی نامور وکیل اور انسانی حقوق کی علم بردار عاصمہ جیلانی کے والد)، چودھری عبدالشکور (سابق وفاقی وزیر نوریز شکور کے والد) اور میرے رفیق کار پروفیسر محمود خاں بھٹی اس کے بہت اچھے کھلاڑی تھے۔

ایک اور کھیل کانچ (پنجابی: کچ) کی گولیوں سے کھیلا جاتا تھا۔ اس کھیل میں ایک گولی گھُتّی کے دہانے پر رکھ دی جاتی تھی اور اسے ایک خاص فاصلے سے دوسری گولی سے نشانہ بنا کر گھتی میں گرانا پڑتا تھا۔ اگر نشانہ ٹھیک بیٹھا اور پہلی گولی گھتی میں گر گئی تو آپ جیت گئے ورنہ آپ کی باری ختم ہو جاتی تھی۔ جیت کی صورت میں آپ کو گولیوں کی ایک خاص تعداد، جو پہلے سے مقرر کر لی جاتی تھی، مل جاتی تھی اور ہار کی صورت میں اتنی ہی گولیاں آپ کو فریق مخالف کو دینا پڑتی تھیں۔ آپ تب تک کھیلتے رہتے تھے جب تک آپ کا نشانہ صحیح بیٹھتا رہتا تھا، باری صرف نشانہ چوک جانے پر ختم ہوتی تھی۔

کوڑیوں (پنجابی: کوڈیوں)، کانچ کی گولیوں اور ریٹھوں سے متعدد دیگر کھیل بھی کھیلے جاتے تھے۔ ریٹھے کا چھلکا گرم پانی میں بھگونے اور ابالنے کے بعد صابن کا کام دیتا تھا۔ ریٹھوں کو کپڑوں سمیت ابلتے پانی میں ڈالا جاتا تھا۔ چھلکا علیحدہ ہو جاتا اور ریٹھے کھولتے پانی میں گھل کر کپڑوں کی میل کاٹ دیتے تھے۔ چھلکے کے اندر گول بیر برابر کالے رنگ کا بیج ہوتا تھا۔ گولی کی شکل کا یہی بیج مختلف کھیلوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اس بیج کو بھی ریٹھا ہی کہا جاتا تھا۔

چھوٹے بچے بچیاں زیادہ تر لُکن مِیٹی (آنکھ مچولی) کھیلتی تھیں۔ لڑکیوں کے اپنے کھیل ہوتے تھے، لیکن یہ آؤٹ ڈور (outdoor) نہیں بلکہ صرف ان ڈور (indoor) ہوتے تھے اور عموماً گڑیوں (پنجابی: گڈیاں پٹولے) سے کھیلے جاتے تھے۔ یہ گڑیاں دکانوں پر نہیں ملتی تھیں، کپڑے سے گھروں میں ہی بنائی جاتی تھیں۔

# 20

بیٹ میں شادیاں اگرچہ عام طور پر دو دو تین دن چلتی رہتی تھیں مگر زیادہ تر کم خرچ اور سادہ ہوتی تھیں۔ دعوتی کارڈ چھپوانے اور بھجوانے کا رواج نہیں تھا۔ عموماً زبانی سندیسے بھیجے جاتے تھے۔ یہ سندیسے مقامی بھی اور دوسرے دیہاتوں کے رشتے داروں اور احباب کو بھی نائی کے ذریعے پہنچائے جاتے تھے۔ مہمان شادی سے دو تین دن پہلے ہی پہنچنا شروع ہو جاتے تھے۔ اگر شدید گرمیوں کا موسم ہو تو ان کی تواضع کانجی سے کی جاتی تھی۔ کانجی بڑے شہروں میں بھی چلتی تھی۔ یہ عموماً نمکین اور کھٹی ہوتی تھی اور گاجروں کے اچار میں پانی ڈال کر بنائی جاتی تھی۔ بیٹ کی کانجی اس سے مختلف ہوتی تھی۔ لڈو کے حجم کے بیسن کے پکوڑے بنائے جاتے اور پکوڑوں ہی کی طرح انھیں سرسوں کے کھولتے تیل میں تلا جاتا۔ پکنے کے بعد انھیں چھاننی کے ذریعے کڑاہی سے باہر نکال لیا جاتا اور سوکھنے کے لیے انھیں یونہی چند دن پڑا رہنے دیا جاتا۔ سوکھنے کے بعد یہ خاصے سخت ہو جاتے۔ انھیں ٹوک ٹوک ویسے بھی کھایا جا سکتا تھا۔ اگرچہ انھیں توڑنے میں دانتوں کو بعض اوقات اچھا خاصا زور لگانا پڑتا تھا مگر کھانے میں مزہ بہت آتا تھا۔ تاہم انھیں بنانے کا اصل مقصد ان سے کانجی تیار کرنا ہوتا تھا۔ اس مقصد کے لیے کمہار سے مٹی کا بہت بڑا مٹ (مٹکا/گھڑا) بنوایا جاتا۔ [ایک زمانے میں اچھرے کے قریب اس قسم کے مٹکے نظر آ جاتے تھے۔] اس میں بیسن کے گول پکوڑے اور شکر کی اچھی خاصی مقدار ڈال دی جاتی اور اسے پانی سے بھر دیا جاتا۔ مٹکے کا منہ ڈھکنے سے بند کر دیا جاتا اور گندھے ہوئے آٹے سے seal (مہر بند) کر دیا جاتا اور اسے یونہی کئی دن پڑے رہنے دیا جاتا۔ پکوڑے اور شکر بالکل حل ہو جاتے اور محلول عمل تخمیر کے ذریعے ایک قسم کی غیر نشہ آور نبیذ کی شکل اختیار کر لیتا۔ گرمیوں میں پیاس بجھانے کا یہ بہترین نسخہ تھا۔

اگرچہ کھاتے پیتے لوگ شادیوں پر طرح طرح کے کھانوں کا اہتمام کرتے تھے مگر ان کی تعداد بہت کم تھی۔ عام لوگ عموماً صرف دو کھانے پکواتے تھے۔ بکرے کا شوربا اور گڑ کے میٹھے چاول۔ دیہاتوں میں caterers [شادی بیاہوں اور دیگر تقریبات پر ماکولات و مشروبات اور فرنیچر، دریاں، خیمے وغیرہ فراہم کرنے والے] تو ہوتے نہیں تھے، چنانچہ لوگوں کو تمام لوازمات کا اہتمام خود ہی کرنا پڑتا تھا۔ کھانا جن پلیٹوں میں کھلایا جاتا تھا، انھیں سانک کہا جاتا تھا۔ یہ پکی ہوتی تھی، انھیں مقامی کمہار اپنے آوے میں پکاتا تھا اور وہی فراہم کرتا تھا۔ شوربے اور چاول کی دیگیں نائی پکاتے تھے۔ ان میں بعض اپنے کام کے بہت ماہر ہوتے تھے اور انھیں دور دور بلایا جاتا تھا۔ اس موقع پر عام قسم کی روٹیاں نہیں بلکہ ایک خاص قسم

کے چھلکے پیش کیے جاتے تھے۔ یہ ہوتے تو پھلکوں کی طرح ہلکے، پتلے اور سبک، مگر ان کی جسامت ان سے دگنی سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔ انھیں منڈے کہا جاتا تھا۔ انھیں ایک بہت لمبی توی پر پکایا جاتا تھا۔ توی کے لیے وقتی طور پر زمین میں گڑھا کھود کر چولہا بنا لیا جاتا تھا اور یہ اتنی لمبی ہوتی تھی کہ اس کی دونوں طرف بیک وقت پانچ پانچ چھ چھ عورتیں بیٹھ سکتی تھیں۔ یہ عورتیں عموماً جھیریاں ہوتی تھیں۔ وہ ساری رات منڈے پکاتیں اور ان کے اونچے اونچے ڈھیر لگاتی رہتی تھیں۔ چنانچہ اگلے روز [شادیاں دن کی روشنی میں دوپہر کے وقت ہوتی تھیں] جب انھیں مہمانوں کو پیش کیا جاتا، وہ ابھی گرم ہوتے تھے اور اٹھانے پر ان سے بھاپ خارج ہونے لگتی تھی۔

مہمانوں کو کھانا کھلانے کے لیے زمین پر دھوبی کی دھلی ہوئی اجلی، سفید چادریں بچھا دی جاتی تھیں اور انھیں ان کے دونوں طرف بٹھایا جاتا تھا۔ کھانا ڈونگوں میں پیش نہیں کیا جاتا تھا۔ شوربے کی دیگوں سے بوٹیاں نکال کر ایک پرات میں رکھ دی جاتی تھیں۔ دیگ اور پرات کے قریب دو نسبتاً سیانے آدمیوں کو بٹھا دیا جاتا تھا۔ مہمان ساتھ میں اور نسبتاً خاصے بڑے بڑے پیالے لے کر آتے تھے۔ وہ اپنی ساتھ میں میٹھے چاولوں سے بھر لیتے تھے [بعض تو بالکل ٹیسی لگا لیتے تھے] اور دیگ کے قریب آتے تھے۔ ایک شخص ان کے پیالوں میں دو دو تین تین بوٹیاں رکھتا اور دوسرا انھیں شوربے سے بھر دیتا تھا۔ اگر کسی مہمان کو مزید شوربے کی ضرورت پیش آتی، رضاکارانہ خدمات سرانجام دینے والے نوجوان ایک جگ نما برتن سے ان کے پیالے میں انڈیل دیتا تھا۔ پانی بھی یہی رضاکار پلاتے تھے۔

بیشتر مہمان شوربے کے ساتھ منڈے کھاتے تھے لیکن بعض چاولوں پر شوربا انڈیل لیتے تھے، وہ نہ منڈے کھاتے تھے اور نہ پانی پیتے تھے، بس بار بار شوربا ڈلواتے رہتے تھے۔ بعض بزرگ شادی سے تین دن پہلے نہ تین دن بعد اپنے گھر کا کھانا کھاتے تھے۔

لڑکے کی شادی پر ولیمہ نہیں کھلایا جاتا تھا بلکہ بڑی دعوت برات کی روانگی سے ایک روز قبل منعقد کی جاتی تھی۔ اس موقع پر نیندا (نیوتا) اکٹھا کیا جاتا اور لاڑے (دولہا) اور اس کے سبالے (شہ بالا) کو سلامی دی جاتی تھی۔ دونوں رقوم کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا تھا۔ اس مقصد کے لیے ہر گھر میں وہی (بہی) ہوتی تھی۔ دراصل بہی ہندو مہاجنوں اور کراڑوں کی حساب کی لمبی کتاب ہوتی تھی۔ اس کی پتلی گتے کی جلد کا رنگ سرخ ہوتا تھا۔ چونکہ یہ بہت لمبی ہوتی تھی، اس لیے اسے تہہ کرنا پڑتا تھا مگر عجیب بات یہ تھی کہ اسے تہہ درمیان سے نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اس کے نچلے دو تہائی حصے کو دو حصوں میں بانٹ کر انھیں ایک دوسرے کے اوپر تہہ کیا جاتا تھا اور یوں اس کا اوپر کا تہائی حصہ تہہ کی زد میں نہیں آتا تھا مگر بہی کو سنبھالنا آسان ہو

جاتا تھا۔ شادیوں کے لین دین کا جو حساب بہی میں لکھا جاتا تھا، اس سے یہ معلوم کرنے میں آسانی ہو جاتی تھی کہ آپ کو کس کا کتنا دینا ہے اور کس سے کتنا لینا ہے۔

نیندرا اکٹھا کرنے کا بڑا فائدہ یہ تھا کہ اس سے شادی کے اخراجات کافی حد تک پورے ہو جاتے تھے اور یوں لوگوں کو قرض لینے اور زیر بار ہونے کی زیادہ ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ مگر نیندرا صرف لڑکے کی شادی پر لیا جا سکتا تھا۔ اور وہ بھی ہر لڑکے کی شادی پر نہیں۔ جیسا کہ اب بھی ہوتا ہے اصل مصیبت لڑکی کی شادی پر پیش آتی تھی لوگ اپنی ناک اونچی رکھنے کے لیے اپنی بساط سے بڑھ کر جہیز دینے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کے لیے انھیں مہاجنوں سے قرضہ لینا پڑتا تھا جو کئی پشتوں تک ادا نہیں ہو پاتا تھا۔ جہیز (داج) میں دلہن (ووہٹی یا ووہٹی) کو عموماً پانچ سات تولے سونے کے زیورات اور دس بارہ جوڑے کپڑوں کے دیے جاتے تھے اور تقریباً یہی کچھ وری (بری) میں سسرال والے لے کر آتے تھے۔ فرنیچر گھروں میں ایک آدھ کرسی اور میز کے علاوہ اور کوئی استعمال نہیں ہوتا تھا اور جدید مشینیں (gadgets، ریڈیو، ٹی وی، فرج وغیرہ) ابھی وجود میں نہیں آئے تھے۔ اس لیے ان چیزوں کے دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیا سستا سادہ زمانہ تھا۔

مایاں کیا ہوتی ہیں، کم از کم بیٹ میں اس زمانے میں ان کا کسی کو کوئی علم نہیں تھا۔ ووہٹی کے ہاتھوں اور پیروں میں مہندی ضرور لگائی جاتی تھی مگر کوئی تقریب منعقد نہیں ہوتی تھی اور نہ کوئی کھانا دیا جاتا تھا۔

اگر برات کسی دوسرے گاؤں جاتا ہوتی، لاڑے کو عموماً کلے والی پگڑی پہنائی جاتی، اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے [ابھی کرنسی نوٹوں کے ہار پہنانے کا رواج نہیں ہوا تھا] اور اسے گھوڑے پر بٹھایا جاتا۔ اس موقع پر عورتیں پنجابی کا مشہور لوک گیت "ٹی وی میرا گھوڑی چڑھیا" اور دوسرے فی البدیہہ گھڑے ہوئے گیت اور ٹپے گاتیں۔ براتی عام طور پر پیدل ساتھ چلتے [لاری، تانگہ یا کوئی دوسری سواری دستیاب ہی نہیں ہوتی تھی اور گھوڑے صرف پٹواریوں کے پاس ہوتے تھے]۔ بعض لوگ باجا بجانے والوں کا اہتمام کر لیتے تھے۔ یہ لوگ بھی باجوں سمیت پیدل ہی چلتے تھے۔ دلہا کے گاؤں سے رخصت ہوتے اور دلہن کے گاؤں پہنچنے پر وہ دھوم دھڑکے سے باجے بجاتے اور عموماً پنجابی کے لوک گیت گاتے تھے [ابھی فلمی گانوں کا رواج نہیں ہوا تھا]۔ دلہن کے رشتے دار گاؤں سے ذرا باہر نکل کر برات کا پرجوش استقبال کرتے، دلہا، شہ بالے اور ان کے بزرگوں کے گلوں میں پھولوں کے ہار پہناتے اور بڑے احترام کے ساتھ براتیوں کو اس مکان میں لے جاتے جہاں نکاح کی رسم سرانجام دی جاتا اور براتیوں کو کھانا کھلانا ہوتا تھا [ٹینٹ اس زمانے میں کوئی نہیں لگاتا تھا کیونکہ انھیں فراہم کرنے والی کوئی فرم ہی نہیں تھی]۔

براتیوں کا استقبال کرنے والوں میں عورتیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ وہ پنجابی کے لوک گیت تو گاتی ہی تھیں لیکن فی البدیہہ گھڑے ہوئے گانوں میں دلہا کی سات پشتوں کو کھدیڑ کر رکھ دیتی اور اسے ایسی ایسی بے نقط سناتی اور غلیظ گالیوں سے نوازتی تھیں کہ نوجوان لڑکے تو بہت خوش ہوتے اور زور زور سے قہقہے لگاتے پھرتے لیکن بزرگ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے تھے لیکن تعرض کوئی نہیں کرتا تھا بلکہ اسے زندگی کا حصہ سمجھا جاتا تھا[ ابھی پاکستان وجود میں نہیں آیا تھا اور نہ ضیاء الحق کی شریعت نافذ ہوئی تھی ]۔

اگر برات صبح سویرے پہنچ جاتی، نکاح کی رسم دوپہر سے پہلے، ورنہ دوپہر کے بعد سرانجام پاتی۔ اس موقع پر دلہن کا مہر بھی طے پاتا۔ بعض اوقات مہر کی رقم پر اختلاف بھی ہو جاتا لیکن دونوں فریقوں کے بزرگوں کی مداخلت سے معاملہ کوئی سنگین صورت اختیار نہ کرتا اور بہت جلد تشفی بخش انداز سے سلجھ جاتا۔ جہیز میں دلہن کو پانچ سات تولے کے سونے کے زیورات اور پانچ سات سے دس بارہ تک کپڑوں کے جوڑے دیے جاتے تھے اور تقریباً اتنی ہی بری سسرال والے لے کر آتے تھے۔ رخصتی سے پہلے دلہا سسرالیوں کی عورتوں کے نرغے میں آ جاتا، وہ اسے سلامی ڈالتیں اور دلہن کی کوئی بہن اسے دودھ پلاتی اور دودھ پلائی کا اچھا خاصا معاوضہ وصول کرتی۔

پاکستان میں جہیز لوگوں کے گلوں کا ہار بن چکا ہے اور اس سے جان چھڑانے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ پروفیسر رفیع اللہ شہاب مرحوم نے جو عربی اور اسلامی علوم کے بہت بڑے عالم تھے، اپنے مضامین (مطبوعہ پاکستان ٹائمز) میں بار بار لکھا تھا (اور کسی نے ان کی تردید نہیں کی تھی) کہ جہیز عربی زبان کا لفظ ہی نہیں۔ پنجابی میں جہیز کو داج اور ہندی میں دان کہا جاتا ہے۔ ایس ٹی فیلن نے اپنی اردو انگلش لغت میں بتایا ہے کہ یوپی کے دیہات میں اسے تیج یا دیج کا نام دیا جاتا تھا۔ یہ سارے الفاظ آپس میں قرابت دار معلوم ہوتے ہیں اور سبھی سنسکرت کے ایک لفظ [ جس کا دیوناگری خط مجھ سے پڑھا نہیں گیا ] سے نکلے تھے۔

بعض لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ رسول کریمؐ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کو جہیز دیا تھا لیکن پروفیسر شہاب نے بتایا ہے کہ یہ ادعا تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شادی سے چند روز پیشتر رسول کریمؐ نے حضرت علیؓ سے دریافت کیا تھا کہ ان کے پاس کوئی ایسی چیز ہے جسے بیچ کر ان کے شادی کے اخراجات پورے کیے جا سکیں۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا: "یا رسول اللہؐ، میرے پاس تو کوئی ایسی چیز نہیں۔" اس پر رسول کریمؐ نے مختلف اشیا کے فرداً فرداً نام لے کر پوچھا کہ ان کا کیا بنا۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ فلاں چیز فلاں وقت پر بیچ دی گئی تھی اور فلاں چیز فلاں وقت پر۔ چنانچہ جب آنحضرتؐ

نے استفسار کیا: "تمھارے پاس زرہ بھی تو تھی؟" اس پر حضرت علیؓ نے کہا، "جی، وہ تو اب بھی ہے۔"
چنانچہ اس پر حکم ہوا کہ زرہ بیچ دی جائے۔ وہ بیچ دی گئی اور اس سے جو یافت ہوئی، اس میں سے نصف تو
ولیمے کی دعوت پر خرچ ہوگئی اور باقی رقم سے حضرت فاطمہؓ کے لیے چکی اور چند دیگر گھریلو اشیا خریدی گئیں۔
یہ ہے اسلامی جہیز کی اصل حقیقت۔ اس کی تائید اس رواج سے بھی ہو جاتی ہے جو آج بھی عرب ممالک
اور ہمارے بلوچستان اور قبائلی علاقوں میں پایا جاتا ہے کہ شادی سے پہلے لڑکے یا لڑکے کے گھر والوں کو
لڑکی کے والدین یا سرپرستوں کو ایک معقول رقم ادا کرنا پڑتی ہے۔

لڑکی کا جو مہر باندھا جاتا ہے، اس میں بھی اکثر دھاندلی کی جاتی ہے۔ بے شمار لوگ سوا بتیس روپے مہر
مقرر کرنے پر اصرار کرتے ہیں اور اس کی تائید میں بھی حضرت فاطمہ الزہرؓ کے مہر کی مثال دی جاتی ہے۔
اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس مہر کی رقم سوا بتیس ہی مقرر ہوئی تھی، اس زمانے میں یہ بہت بڑی رقم تھی اور
آج کل کے حساب سے یہ لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ضرور پہنچتی ہوگی۔ اسلامی اصولوں کے مطابق مہر
کی رقم والدین کی توفیق کے مطابق ہونا چاہیے۔ اصل میں ہمیں عورتوں کا حق مارنے کی عادت پڑ گئی ہے اور
یہ عادت اتنی راسخ ہوگئی ہے کہ ہم اس کے لیے نت نئے بہانے تراشتے رہتے ہیں۔ سندھ کے وڈیرے تو
عورتوں کا جائیداد میں حصہ غصب کرنے کے لیے ان کی قرآن مجید سے شادی کروا دیتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔

میرے جاننے والی ایک اچھی بھلی پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ جب ان کے بیٹے کی شادی کا وقت آیا تو
انھوں نے تعین نکاح کے وقت فرمایا: "میں مہر شرعی (یعنی سوا بتیس روپے) باندھوں گی لیکن جہیز رواج
کے مطابق لوں گی۔" گویا چت بھی میری پٹ بھی میری۔

بیت میں جب شادی کی ساری رسوم طے ہونے کے بعد رخصتی کا وقت آتا، روتی دھوتی دلہن کو
ڈولی میں بٹھا دیا جاتا۔ مردوں کے ساتھ رشتے دار خواتین بھی الوداع کہنے کے لیے گھر سے باہر نکل
آتیں۔ وہ روتی بھی جاتی تھیں اور رخصتی کے گیت بھی گاتی جاتی تھیں۔ برات کا سربراہ دلہن کی ڈولی پر
چھوٹی مالیت کے سکے [دھیلا، پیسہ، ٹکا، آنہ، دونی، چونی وغیرہ] نچھاور کرتا تھا۔ [آج کل یہ سکے صرف
کتابوں میں رہ گئے ہیں، نئی نسل نے تو شاید ان کی شکل بھی نہ دیکھی ہو بلکہ خود روپیہ بھی انتہائی حقیر سکہ
بن گیا ہے اور بھکاری بھی اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا مگر جنگ عظیم دوم سے پہلے پیسا ہی نہیں بلکہ
دھیلا، پائی اور دمڑی بھی خاصی اہمیت رکھتی تھی اور غالب کے زمانے میں تو کوڑی بھی بطور سکہ استعمال
ہوتی تھی۔ پائیاں تو قیام پاکستان کے بعد بھی کافی سال چلتی رہیں۔ ان کا چلن تب ختم ہوا جب
1962 میں ملک میں اعشاری نظام متعارف ہوا اور نیا پیسا وجود میں آیا اور اب یہ نیا پیسا بھی کہاں

رہا ہے۔]

جب دلہن کی ڈولی اس کے سسرال پہنچتی، وہاں بھی اس کی ڈولی پر سے سکے نچھاور کیے جاتے۔ بیشتر سکے تو ڈھندل (ڈھول) میں ہی کہیں غائب ہو جاتے۔ باقیوں کے لیے لڑکوں، غریب غربا اور چوڑوں چماروں میں خوب چھینا جھپٹی ہوتی۔ جب دلہن ڈولی سے برآمد ہوتی، رشتے دار خواتین اور گاؤں کی دیگر عورتیں ناچتی گاتی اور گدا ڈالتی اس کے گرد اکٹھی ہو جاتیں اور اپنی جلو میں دولہا کے گھر کی دہلیز تک لے جاتیں لیکن دلہن کے اندر قدم رکھنے سے پہلے دروازے کی تھی پر وجب (دایاں بازو) کی لی (بغیاو) پر اس کی ساس سرسوں کے تیل کی شیشی انڈیلتی۔ اس رسم کو پنجابی میں تیل چونا کہا جاتا تھا اور یہ غالباً دلہن کو نظر بد سے بچانے کے لیے نبھائی جاتی تھی۔

دلہن اپنے میکے [پنجابی میں پیکے زیادہ مستعمل ہے] سے اکیلی نہیں آتی تھی بلکہ اس کے ساتھ اس کی ایک بہن اور ایک بھائی ضرور ہوتا تھا [اگر سگا موجود نہ ہو، پھر کوئی کزن، پھوپھی، خالہ وغیرہ]۔ چونکہ نکاح کے بعد کھانا کھانے اور دوسری رسوم پر خاصا وقت صرف ہو جاتا تھا، بعض اوقات فاصلہ بھی خاصا طویل طے کرنا پڑتا تھا، چنانچہ رات کو واپس آنے میں کافی دیر ہو جاتی تھی اور باور یہ کر لیا جاتا تھا کہ دلہن خاصی تھک گئی ہوگی، اس لیے اس رات دلہا دلہن کو اکٹھے سونے کی اجازت نہیں ہوتی تھی [یہ رواج پاکستان بن جانے کے بعد ٹوٹ گیا ہے اور ولیمے کی تقریب بھی منعقد ہونے لگی ہے]۔ دلہن کی بہن، جو اس کے ساتھ آئی ہوتی تھی، متقابل نگاہوں سے نگرانی کرتی رہتی تھی کہ کہیں اس اصول کی خلاف ورزی نہ ہو جائے۔

دلہن صرف ایک رات اور وہ بھی ادھوری، اپنی سسرال کے ہاں گزارتی تھی اور اگلے روز اپنی بہن بھائی کے ساتھ میکے واپس چلی جاتی تھی۔ اس کا دلہا بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس مرتبہ دونوں کو پیدل چلنا پڑتا تھا کیونکہ انہیں کوئی سواری فراہم نہیں کی جاتی تھی۔ دلہا پانچ سات دن اپنی سسرال گزارتا تھا۔ اس دوران میں اس کے خوب چونچلے اٹھائے جاتے تھے۔ دلہن کے رشتے دار باری باری صبح و شام دعوتیں کرتے رہتے تھے لیکن اسے ان کی اچھی خاصی قیمت بھی چکانا پڑتی تھی۔ دلہن کی بہنیں اور کزن وغیرہ مناسب موقع کی تلاش میں رہتیں اور جونہی وہ ذرا غافل ہوتا، اس کا جوتا چرا لیتیں اور اس سے اچھی خاصی رقم اینٹھنے کے بعد ہی واپس کرتیں۔ پانچ سات دن بعد دلہا اپنی نئی نویلی دلہن سمیت واپس آ جاتا تھا۔ اس رسم کو مکلاوا/اانا کہا جاتا تھا۔

مکلاوے کے بعد دلہا دلہن کو چھٹی مل جاتی تھی کہ وہ جی چاہے کرتے پھریں۔ شروع کے آٹھ دس دن

ان دونوں کی خوب ناز برداری ہوتی تھی۔ سارے رشتے دار باری باری ان کی پرتکلف دعوتیں کرتے تھے اور انھیں تحفے تحائف دیتے تھے لیکن ان مواقع پر دلہن دلہا کے ماسوا شاذ ہی کسی دوسرے شخص کو بلایا جاتا تھا اور یوں میزبان زیادہ زیر بار ہونے سے بچ جاتا تھا۔

لیکن یہ دن پلک جھپکنے میں گزر جاتے تھے، پھر زندگی معمول پر آ جاتی تھی۔ دلہن گھر کی دیگر عورتوں کی طرح گھریلو کاموں میں جت جاتی تھی۔ دلہن عموماً دبی دبی رہتی تھی اور ساس اور نندوں (پنجابی: ننان) کے سامنے ذرا بھی کسکتی نہیں تھی۔ دبنگ دلہنیں کم کم ہی ہوتی تھیں اور جو ہوتی تھیں، وہ ذرا سی زیادتی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی تھیں اور ساس بہو کے مابین کبھی خاموش، کبھی علانیہ جنگ چھڑ جاتی تھی۔ برصغیر کے تمام ممالک میں تب بھی یہی ہوتا تھا اور اب بھی یہی ہوتا ہے۔

ساس اور نندیں بہو کی ذرا ذرا سی حرکت پر ہی نہیں، اس کے جسم پر بھی کڑی نظر رکھتی تھیں۔ اگر ان کے حساب سے بہو کا پاؤں بھاری ہونے میں قدرے تاخیر ہو جاتی، تب طرح طرح کی چہ میگوئیاں شروع ہو جاتیں۔ اگر بہو خوش قسمت ہوتی اور وقت پر امید سے ہو جاتی، اس پر کام کا بوجھ ہلکا ہونا شروع ہو جاتا اور اس کی خوراک بھی عموماً معمول سے بڑھ کر بہتر ہو جاتی۔ اس بات کا خاص طور پر پورا خیال رکھا جاتا کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے حمل کے ضائع ہونے کا احتمال ہو مثلاً کوئی بھاری چیز اٹھانا وغیرہ۔ وضع حمل سے کوئی ڈیڑھ دو ماہ پہلے وہ اپنے پہلوٹھی کے بچے کو جنم دینے کے لیے اپنے میکے چلی جاتی۔

مس کیتھرین میو (Katherine Mayo) ایک امریکی مصنف اور سماجی مورخ تھی۔ وہ 1920ء کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں برصغیر کے مختلف علاقوں میں گھومی پھری، مندروں اور ہسپتالوں کے دورے کیے، مقامی رسوم کا مشاہدہ کیا، مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کی کارروائیوں کا مطالعہ کیا، مہاتما گاندھی سمیت بے شمار اشخاص سے ملاقاتیں کیں اور اس نتیجے پر پہنچی کہ ہندوستان ابھی آزادی کے قابل نہیں ہوا۔ (ظاہر ہے اس کے اس فتوی پر انگریزوں کی باچھیں کھل گئی ہوں گی۔)

اس نے اپنے مشاہدات کو قلم بند کرنے کے لیے Mother India کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس نے اس کتاب میں صغر سنی کی شادیوں اور اس کے نتیجے میں نابالغ لڑکیوں کو مائیں بنانے کے رویے / رواج کو خاص طور پر ہدف تنقید بنایا۔ اگرچہ اس کتاب کے خلاف ہندوؤں نے خاص طور پر سخت ردعمل کا اظہار کیا اور سو سال گزر جانے کے باوجود یہ تنقید آج بھی جاری ہے مگر یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت تھی کہ اگر کسی ہندو لڑکی کی بارہ سال کی عمر تک شادی نہیں ہوتی تھی تو اس کے ماں باپ سمجھنے لگتے تھے کہ وہ سماج میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے اور اس کتاب کی اشاعت کے بعد ہی ہندوستان میں لڑکیوں کے لیے

شادی کی عمر کم از کم چودہ سال اور لڑکوں کے لیے کم از کم سولہ سال مقرر ہوئی۔

کتاب پر اصل اعتراض یہ نہیں تھا کہ اس میں ہندوستانی، خاص طور ہندو معاشرے کی تنقیص کی گئی تھی اور وہ بھی سنسنی خیز انداز میں گویا سارا ہندوستان ایک open gutter (ان ڈھکی بدررو) ہو۔ اس میں معاشرے کی اچھائیوں اور خوبیوں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ مس میو کا رویہ یک طرفہ سہی تاہم اس نے جن برائیوں کا ذکر کیا تھا، وہ اپنی جگہ اٹل حقیقت تھیں، انھیں کسی طور جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔

برصغیر کی عورت ازل سے مظلوم چلی آ رہی ہے۔ پاکستانی عورت کی حالت زار بیان کرتے کرتے ممتاز اور انتہائی روشن خیال کالم نگار عرفان حسن نے اپنے 4 اگست 2012 کے روزنامہ ڈان میں کالم میں ہندوستانی عورت کی مظلومیت کے متعلق یہ حیرت انگیز جملہ لکھ دیا:

> Despite being the world's biggest democracy, the lot of India women is the worst in the G20[1] countries, trailing behind even Saudi Arabia

کہا جاتا ہے کہ مرد نے عورت کو ستی ہونے پر اس لیے مجبور کیا تھا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ وہ عورت پر جو ظلم و ستم ڈھاتا ہے، کہیں اس کے ردعمل میں وہ اپنے پتی کو زہر وغیرہ دے کر ہلاک نہ کر دے۔ سوچنے کی بات ہے کہ آخر کوئی پتی اپنی پتنی کے انتقال پر خود کیوں نہیں ستی ہوتا تھا۔

عورت کی مظلومیت کا بیان تو ضمنی طور پر آ گیا۔ اصل مقصد ان طور طریقوں کا ذکر کرنا تھا جو بچے کی ولادت کے سلسلے میں پورے برصغیر میں آج سے سوڈیڑھ سو سال پہلے اختیار کیے جاتے تھے۔ مس میو نے اپنی کتاب میں ان کی انتہائی بھیانک تصویر کھینچی ہے۔ اگرچہ بعض شہروں میں زچہ اور بچہ کے ہسپتال کھل چکے تھے اور وہ نہایت قابل قدر خدمات سرانجام دے رہے تھے مگر ملک کی ماؤں کی بہت بھاری تعداد، خواہ وہ ہندو تھیں، مسلمان، سکھ یا کوئی اور، مقامی دائیوں کی محتاج تھی۔ ہندو دائیوں کا تعلق عموماً سماج کے پست ترین طبقوں — شودروں، چماروں وغیرہ — سے ہوتا تھا کیونکہ اس پیشے کو انتہائی گھٹیا اور شرفا کے وقار کے منافی سمجھا جاتا تھا۔ یہ دائیاں عموماً جاہل، ان پڑھ اور کندۂ ناتراش ہوتی تھیں اور وہ اس پیشے کے اسرار و رموز اپنی ماؤں، بہنوں، ساسوں وغیرہ سے سیکھتی تھیں لیکن مس میو کے بقول بعض اوقات جب

---

1- G20، دنیا کے بیس خوشحال ترین ممالک کی تنظیم ہے۔ دنیا کی اسی فیصد تجارت، دولت اور وسائل انھیں کے قبضے میں ہیں۔ ان ممالک میں امریکا، کینیڈا، برطانیہ، فرانس، روس، ترکی، بھارت، جنوبی افریقہ، سعودی عرب، جرمنی، چین، جاپان، انڈونیشیا، جنوبی کوریا، اٹلی، میکسیکو، برازیل، ارجنٹائن اور آسٹریلیا شامل ہیں۔ بیسواں کوئی ملک نہیں بلکہ یورپی یونین کو ملک مان کر رکن بنایا گیا ہے۔

اصل دائی، جو خود بھی زیادہ تر تیر تکے سے کام چلاتی تھی، کسی وجہ سے دستیاب نہیں ہوتی تھی، وہ اپنی جگہ اپنی کسی بالکل ہی ناتجربہ کار بیٹی، بہو، بھتیجی، بھانجی وغیرہ کو بھیج دیتی تھی جو آتے ہی دائی کا فریضہ سنبھال لیتی تھی۔ خود حاملہ عورت کو، جس نے بچے کو جنم دینا ہوتا تھا، ہندو معاشرے میں نجس سمجھا جاتا تھا کیونکہ آخرکار اس کا واسطہ پست ترین اور غلیظ ترین طبقے سے تعلق رکھنے والی دائی سے پڑتا ہوتا تھا۔ ہندوؤں کے خیال کے مطابق وضع حمل کرانے والی زچہ اور اس کے ہونے والے بچے دونوں کو نظرِ بد (evil eye) لگ جانے کا اندیشہ ہوتا تھا، اس لیے دائی خواہ کتنی ہی سیانی اور تجربہ کار کیوں نہ ہوتی، اگر اس کا اپنا کوئی بچہ فوت ہو چکا ہوتا، یا اس کا کوئی حمل ضائع ہو چکا ہوتا یا وہ بیوہ ہو چکی ہوتی، منحوس سمجھی جاتی اور کوئی بالکل ہی اناڑی، نیم اندھی، بوڑھی، معذور، مفلوج، مدقوق اور دیگر امراض کی ماری ہوئی قابلِ قبول ٹھہرتی۔

زچہ کو بھی گھر کے غلیظ ترین اور تاریک ترین کونے میں دھکیل دیا جاتا تھا جہاں نہ ہوا کا گزر ہوتا تھا اور نہ روشنی کا کیونکہ اگر کوئی روزن وغیرہ ہوتا بھی تھا تو کپڑا ٹھونس کر اسے بند کر دیا جاتا تھا۔ اسے ادھر ادھر پھیلی ہوئی غلیظ ترین اترنیں پہننے کو دی جاتیں تھیں اور اس کے ہونے والے بچے کے ملبوسات بھی انھیں سے بنائے جاتے تھے۔ یہ سب کچھ بچت کے نام پر ہوتا تھا کیونکہ انھیں ضرورت پوری ہو جانے پر پھینک دیا جانا ہوتا تھا۔ زچہ کو کسی پرانی سڑانی چارپائی پر، خواہ اس کی کوئی ٹانگ ٹوٹ چکی ہوتی، لٹایا جاتا تھا۔ وضع حمل کے بعد یہ چارپائی کہیں سنبھال کر رکھ لی جاتی تاکہ اگلے موقع پر کام آسکے۔

جب وضع حمل کا وقت قریب آجاتا، دائی کو بلاوا بھیج دیا جاتا۔ آنے سے پہلے اگر دائی نے صاف ستھرے کپڑے پہنے بھی ہوتے وہ انھیں اتار دیتی اور اس موقع کے لیے جو بوسیدہ، پھٹے پرانے اور غلیظ کپڑے محفوظ کیے گئے ہوتے، انھیں پہن لیتی۔ یوں وہ غلیظ ترین اور جراثیم سے بھرپور لباس میں جراثیم زدہ کونے میں اپنی تیخیر کے ساتھ بند ہو جاتی۔

تاریک کونے کو مزید تاریک بنانے کے لیے چارپائی کے اردگرد پھٹے پرانے کپڑوں سے اگر وہ وافر مقدار میں دستیاب ہوتے، تیار شدہ پردہ تان دیا جاتا۔ کمرے میں مٹی یا سرسوں کے تیل کا دیا جلا دیا جاتا جس سے اندھیرا مزید گہرا معلوم ہونے لگتا۔ دائی زچہ کی چارپائی کے نیچے دہکتے کوئلوں کی انگیٹھی رکھ دیتی۔ مقصد زچہ کے جسم کو حرارت پہنچانا ہوتا تھا مگر عملاً ان کا دھواں کمرے کی عفونت میں مزید اضافہ کر دیتا تھا۔

مس میو اپنے ایک آنکھوں دیکھے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہے: ''جونہی میں اندر داخل ہوئی، دائی نے کوئلوں کی انگیٹھی میں کوئی چیز پھینک دی جس سے سخت ترین بو آرہی تھی تاکہ زچہ کو نظرِ بد، میری نظرِ بد، سے بچایا جاسکے۔ اس چیز کے پھینکے جانے پر دہکتے کوئلوں سے گاڑھا دھواں اور ایک شعلہ برآمد ہوا جس کی

روشنی میں مجھے اس کا چہرہ یوں لگا جیسے میں عین دور کی جادوگرنی[1] کا سامنا کر رہی ہوں — وہی جوؤں سے بھرے بال، غلیظ پنجوں جیسے غلیظ ناخن، تقریباً بے نور آنکھیں، غلیظ، تعفن زدہ ملبوسات — چارپائی کو جس پر زچہ لیٹی ہوئی تھی، آگ لگ گئی دائی ٹس سے مس نہ ہوئی اور ہوتی بھی کیسے۔ وہ واقعی کور چشم تھی کہ اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور اتنی کند حس (dull) کہ اسے پتہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔"

مس میو نے ایک سرکاری رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے مزید لکھا: "اگر وضع حمل میں تاخیر ہو جاتی تو توقع کی جاتی کہ دائی کو اس کی وجہ معلوم ہوگی۔ وہ اپنے غلیظ ہاتھ کو، جسے معلوم نہیں اس نے کب دھویا تھا، جو غلیظ انگوٹھیوں اور غلیظ چوڑیوں سے لدا پھندا اور لاتعداد جیتے جاگتے جراثیم سے بھرپور ہوتا، مریضہ کے پیٹ کے اندر دھکیل دیتی اور جو کچھ اسے وہاں ملتا، اسے مروڑنے تروڑنے اور باہر کھینچنے کی سعی کرنے لگتی۔ اگر وضع حمل میں کچھ زیادہ ہی تاخیر ہو جاتی اور پیچیدگی رونما ہونے لگتی، تو دوسری اور بعض اوقات تیسری دائی بلالی جاتی بشرطیکہ گھر والے ان کا معاوضہ دینے کے لیے تیار ہو جاتے اور ایک ایک عضو کر کے بچہ باہر نکال لیا جاتا۔ اس کھینچا تانی میں بعض اوقات بچے کی کوئی ٹانگ یا بازو ٹوٹ جاتا یا جسم سے بالکل ہی علیحدہ ہو جاتا۔"

مس میو کو ایک ہندو خاتون گائنی ڈاکٹر نے بتایا: "جب دائی کو نومولود کے سر کے باہر آنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا، وہ اس کے اعضا کو زبردستی باہر کھینچنے کی تگ و دو کرنے لگتی ہے خواہ اس کے نتیجے میں اس کا کوئی بازو یا ٹانگ ٹوٹ ہی کیوں نہ جائے۔ اس زورا زوری کا نتیجہ نہ صرف نومولود کو بھگتنا پڑتا ہے بلکہ خود زچہ بھی ایک نئی مصیبت میں پھنس جاتی ہے۔ اس کی اندام نہانی کو مثانے سے ملانے والی نالی ضرورت سے زیادہ فراخ ہو جاتی ہے۔ (اسے انگریزی میں obstetric vesicovaginal fistula کہا جاتا

---

1- پرانے عہد نامہ کی کتاب سموئیل۔1 کے باب 28 (آیات 3-25) کے مطابق یہودیوں کا بادشاہ طالوت (Saul) کا بھیس بدل کر ایک پیش گوئی کرنے والی جادوگرنی کے پاس یہ معلوم کرنے کے لیے پہنچا کہ اگلے روز اس کی فلسطینیوں سے جو جنگ ہونا تھی، اس میں اس کا کیا بنے گا۔ جادوگرنی نے اسے بتایا کہ وہ اور اس کے بیٹے مارے جائیں گے۔ اس کے بیٹے واقعی ہلاک ہو گئے لیکن خود طالوت نے بعد میں خودکشی کر لی۔ اس جادوگرنی کی خیالی داستانوں اور فلموں میں اس کا کردار ادا کرنے والی اداکاراؤں کی تصویریں انٹرنیٹ پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ روڈیارڈ کپلنگ نے اپنے بیٹے کی موت پر 1916 میں ایک نظم بعنوان "Endor" لکھی جس میں اس نے روحوں سے ہم کلامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا

Oh the road to Endor is the oldest road/ And the craziest road of all! / Straight it runs to the witch's abode./ As it did in the days of Saul./ And nothing has changed of the sorrow in store/ For such as go down on the road to Endor!

ہے۔) اس کی وجہ سے اسے آئندہ زندگی میں بھی اذیت سے دوچار رہنا پڑتا ہے۔ صرف (ہسپتال میں) مرمت کرانے سے ہی اس کی جان چھوٹ سکتی ہے۔

''اگر آنول کو بچے کی پیدائش کے بعد پانچ منٹ سے زیادہ گزر جائیں تو دائی ایک مرتبہ پھر اپنا غلیظ انگوٹھیوں اور غلیظ چوڑیوں سے بھرا ہوا غلیظ ہاتھ اور غلیظ بازو دوبارہ اندام نہانی میں گھسیڑ دیتی اور آنول نال (placenta یا afterbirth) زبردستی باہر کھینچ لیتی ہے۔''

مس میو نے ایک اور گائنی ڈاکٹر مس وویا ایم رام کی ایک تحریر کا حوالہ دیا ہے: ''زچگی کے دوران میں زچہ کو نہ صرف صاف ستھرے کپڑوں سے محروم رکھا جاتا ہے بلکہ اس کا جسم گرم رکھنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔ اگر اس کا جسم ٹھنڈا پڑنے لگے، تو گائے کے گوبر کی پاتھیوں اور بکری کی مینگنوں کو جلا کر انگیٹھی کے نیچے رکھ دیا جاتا ہے۔''

''بنارس (اب وارانسی) شہر میں، جو قدامت پسند ہندومت کا گڑھ ہے، خاکروبوں کو جو سارے کے سارے شودر ہوتے ہیں، سات طبقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ دائیوں کا تعلق سب سے اونچے اور آنول نال کاٹنے والیوں کا سب سے نچلے طبقے سے ہوتا ہے۔ چنانچہ گندی غلیظ دائی اپنے سے بھی زیادہ گندی غلیظ عورت کو زچہ اور نومولود کو اپنے ''ہنر'' کا نشانہ بنانے کے لیے لے آتی ہے۔ آنول نال کاٹنے کے لیے وہ جو چیز بھی ہاتھ آئے، اسے استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتی۔ بانس یا شیشے کا ٹوٹا ہوا ٹکڑا، زنگ آلود میخ وغیرہ اس کے محبوب اوزار ہیں۔ ایک دائی کو جب اور کچھ نہ ملا، اس نے ایک چھری کو، جس سے تازہ تازہ سبزیاں کاٹی گئی تھیں، برت ڈالا۔ کاٹی گئی نال کے آخری سرے کی مرہم پٹی کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ اگر اس میں کوئی گڑبڑ محسوس ہوتی ہے تو اس کا مٹھی بھر مٹی، لکڑی کے کوئلوں، گائے کے گوبر وغیرہ سے تجویز کر علاج کیا جاتا ہے۔ جو ڈھیٹ بچے اس اذیت ناک پیدائش کو برداشت کر جاتے تھے، ان میں سے بیشتر بعد ازاں دانت بھچی (lockjaw) یا erysipelas (حمرہ/ حمرۃ الجلد/ الفعموفی/ سرخ باد: ایک جلدی مرض جس میں جسم پر پھوڑے پھنسیاں نکل آتی ہیں، مریض کو بخار آ جاتا ہے اور اسے سردی لگ جاتی ہے) سے مر جاتے ہیں۔''

مس میو نے ایک اینگلو انڈین ڈاکٹر مس ایڈرس[1] گرفن (Edris Griffin) کے ایک مضمون میں سے یہ حوالہ نقل کیا ہے: ''زچہ کو زچگی کے دوران میں اور بعد تک چار سے سات دن تک بھوکی پیاسی رکھا جاتا

---

1- Edris کو عربی اور ویلش (Welsh) میں ادریس کہا جاتا ہے۔ حضرت ادریس ایک جلیل القدر پیغمبر تھے۔ خود اس لفظ کا مفہوم بھی پیغمبر یا مشعل بیان رہنما ہے۔ برطانیہ اور امریکا میں یہ ''لڑکیوں'' کا مقبول عام نام ہے۔

ہے اور اگر کچھ کھانے کو دیا جاتا ہے تو چند اخروٹ کی گریاں، مونگ پھلی کے دانے یا کھجوریں۔ معلوم ہوتا ہے یہاں مقصد کفایت شعاری ہے۔ اگر زچہ کو کھانا کھلایا جائے، تو ظاہر ہے کہ برتن استعمال ہوں گے۔ چونکہ زچہ نجس تصور کی جاتی ہے، چنانچہ جن برتنوں میں وہ کھانا کھائے گی، وہ بھی نجس ہو جائیں گے اور نئے خریدنا بڑا مہنگا سودا ہوگا۔ دریں اثنا ماں بڑے بچے کو اپنا دودھ پلاتی رہتی ہے کیونکہ بچے کا دودھ تین سال کی عمر سے پہلے نہیں چھڑایا جاتا۔ ماں درد زہ سے تڑپ رہی ہے اور بچہ بڑے مزے سے اس کا دودھ چوس رہا ہے۔"

وضع حمل کے پانچ چھ روز بعد ہی زچہ کو صاف ستھرے کپڑے پہننے کو دیے جاتے تھے۔

مس میو کا انداز تحریر سنسنی خیز سہی، شاید اس میں کچھ مبالغہ آرائی بھی کی گئی ہو لیکن اگر ایمانداری سے دیکھا جائے تو وہ برصغیر کی عورت کی بہت بڑی محسن نظر آتی ہے۔ عورتوں کی حالت بہتر بنانے کی جتنی بھی کوششیں ہوئی ہیں، ان میں سے بیشتر اس کی کتاب کی اشاعت کے بعد ہی ہوئی ہیں۔

اگرچہ مس میو نے مسلمانوں کے بعض رسوم و رواج کو زبردست تنقید کا نشانہ بنایا ہے، خاص طور پر اس نے پردے اور برقعے کے دستور کے بخیے ادھیڑ دیے ہیں، تاہم زچگی کے معاملے میں مسلمان عورت کو قدرے خوش قسمت بتایا ہے، پھر بھی "ستے خیراں" یہاں بھی نہیں تھیں۔ مسلمان عورت کے ساتھ وہ سلوک تو نہیں ہوتا تھا جو مس میو کے بقول ہندو عورت کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا۔ اگرچہ مسلمان زچہ بھی پہنتی پرانے کپڑے ہی تھی لیکن وہ نہا دھو کر ہوتی تھی اور نہ اس کے کپڑے بلکہ اجلے اور صاف ستھرے ہوتے تھے۔ تاہم کم از کم بیت میں لٹایا اسے بھی کسی گندے، غلیظ کمرے کے کسی کونے کھدرے میں ہی جاتا تھا جہاں نہ روشنی کا گزر ہو سکتا تھا اور نہ ہوا کا۔ اسے حرارت پہنچانے کے لیے اس کی چارپائی کے نیچے دہکتے کوئلوں کی انگیٹھی رکھ دی جاتی تھی جن کا دھواں کمرے کی فضا کو مسموم بنانے میں مدد ثابت ہوتا ہوگا۔ کمرے میں روشنی کے لیے مٹی یا سرسوں کے تیل کا دیا اور بعض اوقات لالٹین استعمال ہوتی تھی جس سے تاریکی کم ہونے کی بجائے اور گہری محسوس ہونے لگتی تھی۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب زچہ کو ٹائلٹ (toilet) کے bowl سے مشابہ اینٹوں کے چولہے پر بٹھا دیا جاتا تھا۔ خیال کیا جاتا تھا کہ اس سے delivery (جنم دینے کا عمل) میں آسانی رہتی ہے مگر بعد میں یہ دستور ترک کر دیا گیا تھا۔

بیت کے مسلمانوں کے ہاں کسی چوڑی چماری کو دائی کے فرائض سرانجام دینے کے لیے نہیں بلایا جاتا تھا لیکن جو آتی تھی وہ ہوتی تو مسلمان ہی مگر اس کا تعلق معاشرے کے پس ماندہ طبقات سے ہوتا تھا مثلاً نائی، جھیور وغیرہ۔ ان کا فن نسلاً بہ نسلاً چلتا رہتا تھا۔ اگرچہ وہ چٹی ان پڑھ ہوتی تھیں مگر ان میں سے

بعض تجربے کے بعد خاصی سمجھدار اور سیانی ہو جاتی تھیں [نا تجربہ کار دائی کو نزدیک بھی پھٹکنے نہیں دیا جاتا تھا] لیکن بنیادی اسرار و رموز کا علم نہ ہونے کی وجہ سے بعض کیس بگڑ بھی جاتے تھے اور زچہ یا بچے کا کیا حشر ہوتا ہوگا، اس کا محض تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کے دیہاتوں اور بڑے شہروں کے، جن میں خود لاہور بھی شامل ہے، غریب اور غیر مراعات یافتہ طبقوں پر اب بھی دائی ہی کا راج چلتا ہے۔ صرف پیچیدگی ہی کی صورت میں مریضہ کو ہسپتال لے جایا جاتا ہے اور وہ بھی اسی صورت میں کہ وہ کہیں نزدیک موجود ہو۔

بھارت اور پاکستان دونوں ہی میں اب حالات پہلے سے کہیں بہتر ہو گئے ہیں۔ صفائی ستھرائی، ہوا اور روشنی کی فراہمی پر توجہ دی جانے لگی ہے۔ حکومتیں دائیوں کو بنیادی تربیت دینے پر توجہ صرف کرنے لگی ہیں لیکن کامل تسلی بخش صورت حال کے لیے ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔

ہندوؤں کے برعکس مسلمان بچے کو اس کی پیدائش کے فوراً بعد ننگے فرش پر نہیں لٹاتے تھے بلکہ اسے پہلے نہلاتے دھلاتے اور صاف ستھرے نئے کپڑے پہناتے تھے۔ پھر اسے گڑھتی (بعض لوگ اسے گھٹی بھی کہتے تھے) دی جاتی تھی۔ گڑھتی گڑ کی باریک کیتر (کترن) بھی ہو سکتی تھی، شہد کا ایک آدھ قطرہ بھی اور اسی قسم کی کسی دوسری میٹھی چیز کی حقیری مقدار بھی۔ گڑھتی عموماً بچے کی دادی، نانی، پھوپھی، خالہ یا کوئی دوسری قریبی رشتے دار دیتی تھی۔ اگر ان میں سے کوئی بھی موقع پر موجود نہ ہوتی، پھر کوئی مرد رشتے دار یہ فریضہ ادا کر دیتا تھا۔ پنجابی میں گڑھتی کے متعلق متعدد کہاوتیں گھڑی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک خاصی مشہور ہے۔ اگر آپ کو کسی شخص کی کوئی حرکت نازیبا معلوم ہوتی ہو تو آپ اس سے ازرہ تفنن یا طنزاً کہتے ہیں: ''اوئے تینوں کنیں گڑھتی دتی سی۔'' یا ''تینوں کا ہدی گڑھتی ملی سی۔'' گویا گھڑتی دینے والے یا گڑھتی میں دی جانے والی چیز کی خصلت گڑھتی لینے والے کے کردار میں منعکس ہو جاتی ہے۔

گھڑتی کے بعد نومولود کے کان میں اذان دی جاتی تھی اور یہ اذان عموماً مقامی مسجد کا امام یا موذن دیتا تھا اور اگر ان میں سے کوئی بھی دستیاب نہ ہوتا، پھر گھر کا ہی کوئی فرد یہ کام سرانجام دے دیتا تھا۔

ہندوؤں کی طرح مسلمان زچہ یا اس کے بچے کو بھوکا پیاسا نہیں رکھا جاتا تھا۔ اس کے برعکس زچہ کو قوت بخش غذائیں کھلائی جاتی تھیں تاکہ اس کی کھوئی ہوئی طاقت جلد سے جلد بحال ہو سکے۔ ان غذاؤں میں یخنی اور ایک قسم کی پنجیری (پنجیری) خاص طور پر شامل ہوتی تھی۔ یہ پنجیری سوجی، گوند قطیرہ (کیکر کی گوند)، چاروں مغز (کدو، خربوزہ، ہدوانہ (تربوز) اور تر (ککڑی یا کھیرا) کے بیجوں کا گودا)، سنڈھ (سونٹھ)، کمرکس [ایک قسم کی دوا جو ڈلیوں کی شکل میں پنساریوں سے مل جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قوت باہ

میں بھی اضافہ کرتی ہے، یہی شاید نام کی وجہ ہے] اور گھی ملا کر بنائی جاتی تھی۔

جب نومولود لڑکا پانچ سات دن کا ہو جاتا تھا، اس کے ختنے کر دیے جاتے تھے۔ یہ ختنے عموماً نائی کرتا تھا۔ اس زمانے میں دیہاتوں میں پورے جسم یا اس کے کسی عضو کو سن کر دینے والی ادویات (anaesthetics) کا کوئی علم نہیں ہوتا تھا چنانچہ ختنے اتنی جلدی اس لیے کر دیے جاتے تھے تا کہ بچے کو شعوری طور پر احساس نہ ہو سکے کہ اسے کوئی تکلیف پہنچائی جا رہی ہے۔ لڑکیوں کے ختنے کوئی نہیں کرتا تھا اور نہ کسی کو اس بارے میں کچھ معلوم تھا۔ یہ تو مجھے بھی چند سال قبل معلوم ہوا تھا کہ افریقہ کے بعض مسلم ممالک میں یہ قبیح رسم مذہبی فریضہ سمجھ کر ادا کی جاتی ہے۔

بیٹ میں ایک اور خاص بات یہ تھی کہ مائیں نومولود بچوں کے سر شروع میں ہی ہلکے ہلکے دبانا شروع کر دیتی تھیں جب وہ ابھی نرم و گداز ہوتے تھے تا کہ وہ لمبوترے نہ ہونے پائیں، بلکہ مدور (گول) رہیں کیونکہ گول سر خوبصورت سمجھا جاتا تھا۔

اگر خاندان کھاتا پیتا ہوتا، نومولود کے، خواہ وہ لڑکا ہوتا یا لڑکی، سر کے بال منڈوا کر ان کے ہم وزن چاندی خیرات کر دی جاتی، بچے کا نام رکھا جاتا اور اس کا عقیقہ کیا جاتا۔ بعض اوقات عقیقہ ملتوی کر دیا جاتا اور کسی مناسب موقع کا انتظار کیا جاتا۔

بچے کی پیدائش کے چالیس روز بعد زچہ غسل جنابت کرتی، یوں وہ پاک صاف ہو جاتی اور زچگی کی مدت ختم ہو جاتی۔

اگر کوئی حاملہ عورت اپنے پہلوٹھی کے بچے کو جنم دینے اپنے میکے آئی ہوتی، پھر اسے، اس کے نومولود بچے اور شوہر کو تحفے تحائف دے کر رخصت کر دیا جاتا۔

سال میں ایک دو مرتبہ سرکاری ڈسپنسر آتا اور نومولود بچوں کو چیچک سے محفوظ رکھنے کے ٹیکے لگاتا تھا۔ ٹیکے کو بیٹ میں لودا کہا جاتا تھا۔ لودے بچے کے بائیں بازو میں لگائے جاتے تھے۔ یہ تعداد میں چار ہوتے تھے اور خاصے سخت ہوتے تھے، عموماً پھوڑوں کی طرح پھول جاتے تھے۔ ان کے مندمل ہونے اور ان پر کھرینڈ آنے میں خاصا وقت صرف ہوتا تھا۔ ان کے نشانات برسوں برقرار رہتے تھے۔ انھیں زیادہ تر بہت جھڑ یا بہار کے زمانے میں لگایا جاتا تھا تا کہ انھیں ڈھانپنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ جو بچے کسی وجہ سے ٹیکا لگوانے سے محروم رہ جاتے، وہ عموماً چیچک (خسرا) میں مبتلا ہو جاتے اور جو خوش قسمتی سے جان بر ہو جاتے، ان کے چہروں پر اس کے دانوں کے بڑے بڑے داغ پڑ جاتے جو چہرے کو خاصا بدنما بنا دیتے تھے۔ یہ داغ سال ہا سال گزرنے کے بعد ہی مٹنا شروع ہوتے تھے۔

آج کل اس قسم کے ٹیکے لگانے کا رواج ختم ہو گیا ہے کیونکہ عالمی ادارۂ صحت (WHO) کے مطابق چیچک ساری دنیا میں ختم ہو گئی ہے اور یوں اس کی vaccine بنانا بھی بند ہو گئی ہے۔

## 21

ہمارے بزرگ بتایا کرتے تھے کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب دیہاتوں کا ہر کسان گھرانا تقریباً خود مکتفی ہوتا تھا۔ نمک اور کبھی کبھار گوشت کے ماسوا کچھ بھی خریدنا نہیں پڑتا تھا۔ اناج، سبزیاں، دالیں وغیرہ خود اگائی جاتی تھیں، انڈوں اور گوشت کے لیے محدود تعداد میں مرغیاں اور بکرے بکریاں پالی جاتی تھیں۔ دودھ کے لیے ایک آدھ بھینس، گائے یا بکری رکھی جاتی تھی۔ بھیڑوں کا منا نہیں پالا جاتا تھا۔ دیسی بھیڑ کی بد عادت یہ ہوتی تھی کہ وہ انسانی فضلہ بھی کھا جاتی تھی اور اس کی ناک عموماً بہتی رہتی تھی۔ چنانچہ نہ کوئی شخص اس کا گوشت کھاتا تھا اور نہ اس کا دودھ استعمال کرتا تھا۔ ملوں کا کپڑا ابھی دستیاب ہونا شروع نہیں ہوا تھا، چنانچہ اپنی کاشت کردہ کپاس کی روئی سے گھر میں چرخے پر دھاگا بنا جاتا، اس سے جلاہے سے کھدر بنوایا جاتا اور دھوبی سے دھلوا لیا جاتا تھا۔ دریاں اور کھیس عورتیں خود کرگھے پر بن لیتی تھیں۔ آسائشیں اس زمانے میں نہ ہونے کے برابر تھیں تاہم عام لوگ شکوہ شکایت کم ہی اپنی زبان پر لایا کرتے تھے۔

پھر انگریز کا زمانہ آ گیا۔ کپڑا انگلستان کی ملوں کا درآمد ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ یہ دیہاتوں میں مقبول ہونے لگا۔ اسے فروخت کرنے کے لیے دیہاتوں میں بھی دکانیں کھل گئیں۔ چونکہ سائیکلیں عام دستیاب ہونے لگی تھیں، بعض لوگ ان پر تھان باندھ کر گاؤں گاؤں پھر کر اسے بیچنے لگے۔ مردوں میں جاپانی کا لٹھا اور عورتوں میں چھینٹ، جسے عموماً ٹال کہا جاتا تھا، بہت مقبول تھی۔ بعض کھاتے پیتے لوگوں نے جاپان کی بنی ہوئی خالص ریشم کی دو گھوڑا اور چار گھوڑا بوسکی کی قمیصیں پہننا شروع کر دی تھیں اور ان پر بہت فخر کرتے تھے۔

اگرچہ نوجوان لڑکیوں نے شلواریں[1] پہننا شروع کر دی تھیں لیکن تقسیم ہند تک ہر طبقے کی عورتوں کی بھاری تعداد گھگرا (گھاگرا/گھاگرا) ہی پہنتی رہی۔ (بھارت میں گھاگھرا کا بطور فیشن دوبارہ احیا ہو رہا ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے گھاگھرے کا گھیر بہت بڑا ہوتا تھا مگر بھارت کا نیا گھاگرا ولایتی سکرٹ کی طرح مختصر ہونے لگا ہے۔) عام مرد ہمیشہ دھوتی پہنتے تھے۔ (مردوں کی دھوتی کو پیٹ میں عموماً چادر یا چدر

1. شلوار کو پنجابی میں سلوار یا سُتھن کہا جاتا ہے۔ سُتھن سے کئی محاورے بھی بنے ہیں مثلاً سُتھن کا ساک۔ بہو یا بیوی کے رشتے دار۔ عموماً طنزاً استعمال ہوتا ہے۔

اور چھوٹے لڑکوں کی کو بوکی کہا جاتا تھا۔ ہم دسویں جماعت تک سکول میں بھی چادر ہی پہن کر جاتے تھے، کسی کو کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ دھوتی بازار میں بنی بنائی ملتی ہے تاہم چادر اور بوکی بازار سے لٹھا خرید کر خود بنائی جاتی تھی لیکن اس کے کنارے چھوٹی سی تہہ بنا کر درزی سے سلوا لیے جاتے تھے تاکہ وہ جلد پھٹ نہ سکیں۔ چادر کی ڈب بہت کام کی چیز ہوتی تھی۔ یہ جیب کا کام دیتی تھی۔ اگر کوئی چیز چھپانا ہوتی تو عموماً ڈب ہی میں رکھی جاتی تھی۔

عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں اور نہ گھر سے باہر نکلنے پر برقع پہنتی تھیں۔ پردہ نہ کرنے اور برقع نہ پہننے کی غالباً بڑی وجہ یہ تھی کہ انھیں کھیتوں میں اپنے باپوں، بھائیوں، شوہروں یا بیٹوں کو کھانا پہنچانا، فصلوں کی کٹائی کے موقع پر ان کا ہاتھ بٹانا، کپاس کی فصل بارآور ہونے پر پھٹی کی چنائی کرنا (چگنا)، بھینسوں وغیرہ کو چارہ اور گتنڈ ڈالنا، ان کا دودھ چونا (دوہنا) اور رڑکنا (بلونا)، بعض اوقات چکی پیسنا اور بیسیوں دیگر چھوٹے موٹے کام کرنا ہوتے تھے۔ بیٹ کا مولوی بھی ان کی بے پردگی پر جز بز نہیں ہوتا تھا اور نہ کوئی اعتراض کرتا تھا۔ برقع صرف وہ عورتیں پہنتی تھیں جن کے شوہر بسلسلۂ ملازمت کہیں باہر تعینات ہوتے تھے اور وہ ان کے ساتھ ہوتی تھیں۔ لیکن جب وہ واپس اپنے گاؤں آتیں، وہ سٹیشن یا بس اڈے پر پہنچتے ہی اسے اتار پھینکتیں اور تہہ کر کے اپنے ٹرنکوں یا سوٹ کیسوں میں رکھ لیتیں۔ ابھی فیشنی برقع کا کوئی خاص رواج نہیں ہوا تھا، شہروں میں بھی عموماً وہی پرانی وضع کا سفید برقع، جسے مزاحاً یا طنزاً شٹل کاک (shuttlecock) کہا جاتا ہے، پہنا جاتا تھا۔

دیہاتی عورتوں کو جب چاٹی، گھڑے یا ان جیسی کوئی دوسری چیز اٹھانا ہوتی، وہ پہلے سر پر اینو[1] (تلفظ: ای نو) رکھتیں اور پھر اس پر یہ چیز ٹکاتی تھیں۔ اس سے چاٹی وغیرہ کا توازن برقرار رہتا تھا اور وہ ہاتھ چھوڑ کر یا اس میں کوئی شے پکڑ کر بھی چل سکتی تھیں۔ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کی جو طالبات سالانہ کھیلوں میں چاٹی ریس میں حصہ لیتی ہیں، وہ بھی دوپٹے کا عارضی اینو بنا کر سر پر رکھتی ہیں۔

لڑکوں پر اگرچہ سر ڈھانکنے کی پابندی تو نہیں تھی اور وہ ننگے سر عام پھرا کرتے تھے لیکن بزرگ ان سے توقع کرتے تھے کہ وہ اپنے سروں کو ڈھانپ کر رکھیں گے۔ دیہاتوں میں ابھی گاندھی ٹوپی سے ملتی جلتی نماز کی ٹوپی کا رواج نہیں ہوا تھا اور جناح کیپ تو شاید وجود میں بھی نہیں آئی تھی۔ تایا جان محمد اور بعض دیگر پڑھے لکھے لوگ پھندنے والی لال ٹوپی، جسے عرف عام میں ترکی ٹوپی کہا جاتا تھا، پہننے لگے تھے۔ خاص

---

1- اینو عموماً دھان کے سوکھے ہوئے پودوں کے تنکوں کو آپس میں اچھی طرح گوندھ کر بنایا جاتا ہے۔ اس کی شکل گول ہوتی ہے لیکن یہ بیچ میں خالی ہوتا ہے۔

خاص مواقع پر بعض لوگ طرّے والی کلف لگی دستار (پگڑی)[1] پہن لیتے تھے جس کا طرّہ وہ خاص طور پر نکالتے تھے۔ تاہم عام لوگ، جن میں بزرگ اور لڑکے بھی شامل تھے، کھدر یا لٹھے کا صافہ استعمال کرتے تھے۔ بزرگ تو اسے ہر وقت پہنے رکھتے تھے لیکن لڑکے اسے زیادہ تر کندھوں پر ڈالے رکھتے تھے لیکن صافہ ہوتا سب کے پاس تھا۔

جدید قسم کے بال بنانا، جن کا چلن انگریز اپنے ساتھ لائے تھے اور جن میں کانوں کے آس پاس کے اور سر کے پیچھے کے بال تراش خراش دیے جاتے ہیں، سخت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ آج کل تو تقریباً ہم سب اسی قسم کے بال کٹواتے اور بنواتے ہیں اور کسی کو ان پر اعتراض نہیں ہوتا مگر قیام پاکستان سے قبل کم از کم دیہاتوں میں اس انداز کو سخت ناپسند کیا جاتا تھا۔ اس انداز کے بالوں کو بودا کہا جاتا اور گورے کرسٹانوں (عیسائیوں) کی نقالی قرار دیا جاتا تھا۔ زیادہ تر لوگ استرے یا مشین سے ٹنڈ کراتے تھے (مغرب میں آج کل ٹنڈ کرانا فیشن بن گیا ہے اور ویسٹ انڈیز کے کرکٹ کے بعض کھلاڑی تو ہمیشہ ٹنڈ میں ہی نظر آتے ہیں۔) بعض لوگ، خصوصاً جن کا رجحان مذہب کی طرف ہوتا تھا، لمبی لمبی زلفیں رکھ لیتے تھے لیکن وہ بھی انھیں پیچھے سے قینچی وغیرہ سے کٹوا دیتے تھے اور حد سے بڑھنے نہیں دیتے تھے۔ [آج کل زلفیں رکھنا بھی فیشن بن گیا ہے اور بعض تو عورتوں کی طرح چُٹ بھی بنا لیتے ہیں۔]

بعض کٹر قسم کے ہندو سر پر استرے سے ٹنڈ کراتے تھے لیکن سر کے عین درمیان میں چوٹی پر بالوں کا خاصا بڑا گچھا ان کتار بنے دیتے تھے جو بڑھتے بڑھتے کافی لمبا ہو جاتا تھا۔ اسے بودی کہا جاتا تھا۔ بودی رکھنے کا رواج غالباً اب بھارت میں بھی ختم ہو گیا ہے۔ کم از کم ہندی فلموں میں شاذ ہی کبھی بودی دکھائی دیتی ہے۔

برہمن عموماً ایک قسم کا دھاگا بغل کے نیچے سے نکال کر گلے میں ڈال لیتے تھے۔ اسے جنیئو کہا جاتا تھا۔ جنیئو کو عربی میں زنار کہا جاتا ہے جو اصلاً ایک یونانی لفظ کا معرب ہے۔ کسی زمانے میں مشرق وسطی کے عیسائی اور یہودی اور ایران کے مجوسی اسے اپنی کمر کے گرد لپیٹا کرتے تھے۔

## 22

ایک زمانے میں پنجاب کے دیہاتوں اور شہروں میں پِنّیاں کھانے کا عام رواج تھا۔ پنّی چونکہ پنجابی ہی کا نہیں، ہندی کا بھی لفظ ہے، اس لیے شمالی ہند کے دیگر علاقوں میں بھی کھائی جاتی ہوں گی۔ ہماری اماں

---

1۔ ہندو عموماً ڈھیلی ڈھالی بغیر کلف کے پگڑیاں پہنتے تھے اور سکھوں کی تو اب بھی پگڑیاں ہی ہوتی ہیں۔

تین قسم کی پِنّیاں بناتی تھی: نشاستے، السی اور ہلدی کی۔ بچپن میں ہمیں سب سے اچھی نشاستے کی پِنّی معلوم ہوتی تھی۔ نشاستہ بازار سے نہیں خریدا جاتا تھا بلکہ اسے گھر پر ہی بنایا جاتا تھا۔ اس مقصد کے لیے کچے گھڑے کا تقریباً نصف حصہ گندم کے دانوں اور باقی پانی سے بھر دیا جاتا تھا۔ گھڑے کو چپنی¹ سے ڈھانک دیا جاتا تھا اور دس پندرہ دن چھت پر پڑا رہنے دیا جاتا تھا۔ اس عرصے میں پانی میں گندم کے دانے بے حد نرم ہو جاتے تھے۔ پانی باہر پھینک دیا جاتا اور دانوں کو ہاتھوں سے مسل دیا جاتا۔ بھوسی الگ ہو جاتی اور خشک ہونے پر چھاننے سے چھان دی جاتی۔ جو چھان باقی رہ جاتی وہی سوجی ہوتی۔

السی ہمارے علاقے میں بہت ہوتی تھی۔ اس کے بیجوں سے تیل بھی نکالا جاتا تھا۔ ہلدی ہر کسان اپنے کھیت میں اگاتا تھا۔ اس کا بڑا مقصد اپنی ضروریات پورا کرنا ہوتا تھا، بیچنا نہیں۔ ہلدی کی اصل چیز اس کی قدرے لمبوتری جڑ ہوتی ہے۔ اس جڑ کو زمین سے اکھاڑ کر سکھایا اور گھنٹوں پانی میں ابالا جاتا ہے۔ خشک ہونے پر اس کو میدے کی طرح باریک پیسا جاتا ہے۔ السی اور پسی ہوئی ہلدی دونوں میں آٹا، چینی، شکر یا گڑ اور پانی یا دودھ ملا کر پکا کر ایک قسم کی لیس (paste) بنائی جاتی تھی جسے ہاتھوں سے مسل کر لڈوؤں کی طرح پِنّیاں بنائی جاتی تھیں۔ السی کی پِنّیاں خاصی مزے دار ہوتی تھیں مگر سوجی کی پِنّیوں میں جو سواد ہوتا تھا، وہ ان میں نہیں ہوتا تھا۔ ہلدی کی پِنّیوں میں قدرے کڑواہٹ ہوتی تھی، اس لیے بچے انھیں رغبت سے نہیں کھاتے تھے۔ ہماری اماں انھیں ہمیں زبردستی کھلاتی تھی، کہتی تھی کہ ان سے خون صاف ہوتا اور جسم صحت مند رہتا ہے۔ آیورویدک طریقہ علاج میں ہلدی بہت استعمال ہوتی تھی۔ آج کل مغرب میں اس پر زور و شور سے ریسرچ ہو رہی ہے اس میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کیا یہ کینسر، گنٹھیا (وجع مفاصل)، Alzheimer's disease اور ان جیسے بعض دیگر امراض کے علاج میں مد ثابت ہو سکتی ہے۔ تو ہماری اماں ٹھیک ہی کہتی تھیں۔

---

1. ڈھکن۔ چپنی کبھی اردو میں بھی استعمال ہوتا تھا۔ ایک تعویذ کے بول ہیں: لکھ کر چپنی سر پر دھری۔ نکل پڑا یا نکل پڑی۔ کہا جاتا ہے کہ بابا فرید الدین جب ابھی چھوٹے تھے ان کی والدہ محترمہ اپنے بھانویں انھیں نماز کی عادت ڈالنے کے لیے ان کی جانماز کے نیچے گڑ کی ڈلی رکھوا دیا کرتی تھیں۔ ایک روز وہ ڈلی رکھنا بھول گئیں۔ بابا صاحب جب نماز سے فارغ ہوئے اور انھوں نے جانماز اٹھا کر نیچے دیکھا تو ڈلی حسب معمول وہیں پڑی ہوئی تھی۔ اسے ان کے بچپن کی کرامت سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے ان کا نام بابا فرید شکر گنج پڑا۔ ایس ڈبلیو فیلن نے اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے تعویذ کی تشریح یوں کی ہے کہ یہ تعویذ اور بابا فرید شکر گنج کا نام چپنی کے اوپر لکھ کر چپنی زچہ کے سر کے اوپر رکھ دی جاتی تھی تا کہ زچہ کو تکلیف نہ پہنچے اور وہ آسانی سے اپنے بچے کو جنم دے سکے۔ ہندی میں چپنی بھر پانی میں ڈوب مرنا محاورہ ہے۔ اردو میں چپنی بھر کی جگہ چلو بھر استعمال ہوتا ہے۔

ہلدی ہزاروں سال سے برصغیر کی تہذیب کا ایک لاینفک جزو چلی آ رہی ہے۔ یہ مختلف سالنوں میں ان کا رنگ بدلنے کے لیے بطور مسالا استعمال ہوتی ہے۔ ایک زمانے میں جب جدید cosmetics (اشیائے سنگھار) متعارف نہیں ہوئی تھیں، جسم میں صفائی اور نرمی پیدا کرنے کے لیے دلہن اور دولہن کے ابدان پر جو ابٹن ملا جاتا تھا، اس کا بڑا جزو ہلدی ہی ہوتی تھی بلکہ بعض اوقات تو صرف ہلدی ہی سے کام چلا لیا جاتا تھا۔ اردو/ ہندی کی ایک ضرب المثل ہے: ہلدی لگی نہ پھٹکری، رنگ (رنگ) چوکھا آن پڑی یعنی شادی دھوم دھڑکے اور اخراجات کے بغیر آن کی آن میں ہو گئی۔

آلو ضروریات کے مطابق اگائے جاتے تھے لیکن پیاز کی کاشت برائے فروخت بھی ہوتی تھی۔ میرے لڑکپن میں ایک مرتبہ پیاز کی فصل اتنی بھرپور ہوئی کہ کوئی گاہک دستیاب ہی نہیں ہو رہا تھا۔ چند کمہار جو کسانوں سے اجناس خرید کر اور اپنے گدھوں پر لاد کر گھوڑ منڈی پہنچاتے تھے، بلائے گئے۔ ان کے ساتھ ایک آنہ فی کھوتا سودا طے پایا یعنی ایک گدھے پر جتنا پیاز لاد سکتے ہو، لادلو اور بدلے میں ایک آنہ دے جاؤ۔ پیاز کی اس بے قدری پر آپ کے یقیناً کان کھڑے ہو جائیں گے۔

بیٹ میں لوگ گرمیوں میں عموماً گندم اور سردیوں میں مکئی کی روٹی کھاتے تھے۔ چاول منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے زیادہ تر پلاؤ یا میٹھے چاول بنانے کے کام آتے تھے، اس لیے دھان کی کاشت نسبتاً بہت کم ہوتی تھی۔ کئی لوگوں نے باسمتی اگانے کی بہت کوشش کی مگر اس کا مزہ وہ پیدا نہ ہو سکا جو گوجرانوالہ اور شیخوپورہ اضلاع کی باسمتی میں ہوتا ہے۔ ان اضلاع کی باسمتی پوری دنیا میں فقید المثال ہے۔ بھارت سرتوڑ کوشش کے باوجود اس کا نعم البدل تیار نہیں کر سکا۔

ہمارے علاقے میں البتہ مکئی (مکی) بہتات سے کاشت ہوتی تھی۔ مکئی کو انگریز maize اور امریکی corn کہتے ہیں اور آلو تمباکو کی طرح آئی بھی امریکا ہی سے تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں اس سے دو سو سے زیادہ اشیا بنتی ہیں۔ اب پاکستان میں بھی اس سے تیل نکالا اور کارن فلیکس (cornflakes)، بریک فاسٹ سیریل (breakfast cereal)، کسٹرڈ پاؤڈر (custard powder) اور متعدد دیگر اشیا بنائی جانے لگی ہیں، تاہم قیام پاکستان سے قبل یہ زیادہ تر روٹی بنانے کے کام آتی تھی۔ اس کے دانے زیادہ تر بھون کر اور کبھی کبھار پانی میں ابال کر کھائے جاتے تھے۔ شہروں میں دانے بھوننے والوں کو بھٹیارا اور بھوننے والی کو بھٹیارن یا بھٹیاری کہا جاتا ہے لیکن بیٹ کے دیہاتوں میں یہ کام جھیریاں کرتی تھیں۔ وہ صبح کو تنور چلاتی تھیں جس میں وہ گاہکوں کے لیے ان کے اپنے گندھے ہوئے آٹے سے روٹیاں پکاتی تھیں اور شام کو بھٹی جلاتی تھیں جس پر وہ کڑاہی میں گاہکوں کے دانے بھونتی تھیں۔ خشک دانے اکثر کھو کر کھلاں (کھلیں) (popcorn) بن جاتے تھے

لیکن تازہ مکئی کے کھڑے نہیں تھے۔ یہ جوں کے توں رہتے تھے۔ انھیں مرمرے کہا جاتا تھا اور یہ بہت لذیذ ہوتے تھے۔ گرمیوں میں ہماری جیبیں اکثر ان مرمروں سے بھری رہتی تھیں اور ہم انھیں سارا دن ٹھونگتے رہتے تھے۔

چھلیاں (بھٹے) سالم بھی کھائی جاتی تھیں۔ اگر دانے تازہ تازہ اگے ہوتے اور بے حد نرم ہوتے تو چھلی کچی بھی کھالی جاتی تھی۔ ان دانوں سے دودھ جیسی سفید رطوبت بھی نکلتی تھی۔ مگر زیادہ تر چھلیاں کھلیڑوں[1] سمیت یا کھلیڑ چھیل کر دہکتے کوئلوں پر بھون کر یا کھولتے پانی میں ابال کر کھائی جاتی تھیں۔ شہروں میں چھلیاں عموماً کھلیڑوں سمیت گرم بھٹی میں پکا کر فروخت ہوتی ہیں۔

ایک زمانے میں چھلیاں اور ان کے بھنے ہوئے دانے غریبوں کا کھاجا سمجھے جاتے تھے اور صاحب لوگ ان کے قریب بھی نہیں پھٹکتے تھے۔ پھر جب کھلوں کو popcorn کے نام سے پاکستانیوں کو متعارف کرایا گیا، تب ہر کوئی، بالخصوص فیشن ایبل نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ان کی طرف لپک پڑے۔ یہی حال ہدوانے (تربوز) کا ہوا۔ قیام پاکستان سے قبل یہ بہت حقیر پھل سمجھا جاتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد جب امریکیوں کا اثر و رسوخ بڑھا اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ تربوز کی کم از کم ایک قاش امریکیوں کے ناشتے کا لاینفک جزو ہے، ہمارے فرج بھی ان قاشوں سے بھرے جانے لگے۔ ہمارا گھا گھرا پینڈو اور غیر متعلق لباس سمجھا جاتا ہے لیکن جب وہ مغرب کی سکرٹ بن جاتی ہے، تو معزز ہو جاتی ہے۔ شاعر نے سچ ہی تو کہا تھا:

تیری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو میرے نامۂ سیاہ میں تھی

اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے اپنے حریفوں کے متعلق طنزاً کہا تھا: بات وہ جو فتولوبار کہتا ہے۔ اور ہمارا فتولوبار امریکا ہے۔ آخر ہم اپنی تہذیب سے اتنے اوازار (بیزار) کیوں ہیں؟

مکئی کی کاشت میں گندم کی کاشت سے بھی زیادہ کھکھیڑ اٹھانا پڑتے تھے۔ کھیت کو پہلے تین چار مرتبہ واہیا[2] جاتا تھا، پھر اس پر سہاگہ پھیر کر اسے پدھرا[3] کیا جاتا تھا۔ گندم کی طرح مکئی کی بوائی (بیائی/ بجائی) کے لیے بھی تین طریقے استعمال کیے جاتے تھے۔ یا تو پہلے کھیت پر ہل چلایا جاتا تھا اور اس کے نتیجے میں جو سیاڑ

---

1- کھلیڑ: چھلی کے اوپر پتوں کا گچھا جس میں وہ لپٹی ہوتی ہے۔

2- واہنا/ وہ ہنا: ہل چلانا۔ واہنے والا: ہل جوتنا۔ ہل چلانے والا۔ ہالی۔ واہی: کاشتکاری، فکر، رانی کھچی بازی۔ "اوئے، تیرا ایہو کی کرواہ؟" "تی واہی کر دا" یعنی کا شکار ہے۔

3- ہموار (level)۔

(شیاڑ) بنتے تھے، ان میں ہاتھوں سے بیج بکھیر دیا جاتا تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ ایک آدمی ہل چلاتا جاتا تھا، دوسرا اس کے پیچھے پیچھے سیاڑوں میں بیج بکھیرتا جاتا تھا۔ اس عمل کو کیرا (تلفظ: کے را) ڈالنا کہا جاتا تھا۔ تیسری مگر سب سے احسن صورت یہ تھی کہ ہالی اپنے ہل کے ساتھ پور (بروزن مور) باندھتا تھا۔ بیج اس کی جھولی میں ہوتا تھا جو اس نے اپنے کندھے پر یا گلے میں لٹکائی ہوتی تھی۔ وہ مٹھ بھر بیج اپنی جھولی سے نکالتا اور ایک ایک دو دو کر کے دانے پور میں ڈالتا رہتا تھا۔ اس سے بیج ایک دوسرے سے تقریباً مساوی فاصلے پر گرتے تھے۔

مکی جب اگتی ہے تو خاصی گھنی ہوتی ہے۔ چونکہ اس کا ناڑا (stem) گنے کی طرح خاصا موٹا ہوتا ہے، اس لیے وہ گندم کے تنے سے جو پانی پینے کے تنکے (straw) سے بھی باریک ہوتا ہے، کھیت میں جگہ بھی زیادہ گھیرتا ہے۔ چنانچہ موزوں گنجائش پیدا کرنے کے لیے ناڑوں کو ورلا[1] کرنا پڑتا ہے۔ انھیں ورلا تب کیا جاتا ہے جب ناڑے آٹھ دس انچ اونچے ہو جاتے ہیں۔ نسبتاً مضبوط اور صحت مند پودوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کمزور، لاغر اور پتلے پودوں کو داتی (دراتی) سے کاٹ لیا جاتا ہے۔ یہ مویشیوں کے لیے چارے کا کام دیتے ہیں۔

جب ناڑے خاصے بڑے ہو جاتے ہیں، ایک قسم کی سنڈی نمودار ہوتی ہے اور فصل کا ستیاناس مارنا شروع کر دیتی ہے۔ اس سنڈی کو بیٹ میں گنڑا کہا جاتا تھا۔ اس زمانے میں کیڑے مار ادویات تو دستیاب نہیں تھیں انھیں ہلاک کرنے کے لیے داتی سے درمیان میں کاٹنا پڑتا تھا۔ سارے کھیت کو ان سے پاک کرنا بہت اکتا اور تھکا دینے والا کام ہوتا تھا۔ پھر ان سے جھیر (تلفظ: جھے ر) (گھن) بھی بہت آتی تھی لیکن جب ایک دفعہ انھیں ہلاک کر دیا جاتا، یہ دوبارہ نمودار نہیں ہوتے تھے۔

امریکی مکی پاکستانی مکی کی نسبت زیادہ میٹھی اور خوش ذائقہ ہوتی ہے۔ ان کے پودوں کی قامت بھی ہمارے پودوں کی نسبت کہیں اونچی ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض پودے 39 فٹ کی بلندی کو چھونے لگتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے پودوں کی ایک یا زیادہ سے زیادہ دو چھلیوں کے مقابلے میں ان کے پودوں پر پانچ پانچ چھ چھ چھلیاں آ جاتی ہیں اور یوں ان کی پیداوار ہماری پیداوار کی نسبت کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

جب ناڑے پر چھلیوں کے کھلپڑ سوکھنے اور ان کا رنگ ہلکا بھورا ہونے لگے، سمجھ لیں کہ چھلی پک گئی ہے۔ بیٹ میں ناڑوں کو چھلیوں سمیت کاٹ کر ایک مخروطی ڈھیر میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ کافی دن گزرنے کے بعد کھلپڑ نرم پڑنا شروع ہو جاتے تھے۔ تب ناڑوں کو زمین پر اتار کر کھلپڑوں سے چھلیاں نکال لی جاتی

1. بعض پودوں کو کاٹ کر باقی پودوں کے درمیان فاصلہ پیدا کرنا۔

تھیں۔ یہ چھلیاں کئی کئی روز دھوپ میں سوکھتی رہتی تھیں۔ تب انھیں سونٹوں (پنجابی: سوٹوں) سے کوٹ کوٹ کر دانے پھانٹ کے علیحدہ کر لیے جاتے تھے اور اندر سے جو گُلی برآمد ہوتے، وہ بالن (ایندھن) کا کام دیتے۔

مکئی کی روٹی اور ساگ لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ بہترین ساگ سرسوں کی گندلوں (stems) سے بنتا ہے۔ [شہروں میں سرسوں کے نام پر تارامیرا کا ساگ بھی فروخت کر دیا جاتا ہے۔ عام آدمی کے لیے سرسوں اور تارامیرا میں امتیاز کرنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ دونوں ایک دوسرے سے تقریباً مشابہ ہوتے ہیں البتہ تارامیرا کے ساگ میں قدرے کڑواہٹ ہوتی ہے۔] اس کو مزید ذائقہ دار بنانے کے لیے اس میں پالک کے پتوں کی آمیزش کر دی جاتی ہے۔ اگر خودرو بوٹی باتھو ملا دی جائے تو سونے پر سہاگہ ہو جاتا ہے یعنی مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔ مارچ اپریل میں چنے کے ہرے ہرے پتوں سے بھی ساگ بنایا جاتا ہے۔

ساگ پکانے کے لیے سرسوں، پالک کے پتوں (اور باتھو) کو باریک باریک کاٹ کر پانی میں پکایا جاتا ہے۔ جب ہانڈی کھد بدانے لگتی ہے، ساگ پکنا شروع ہو جاتا ہے۔ جب پتوں کا رنگ بدل جائے، سمجھیں کہ ساگ پک گیا ہے۔ تب ہانڈی چولہے سے اتار لی جاتی ہے، اس میں گندم یا مکئی کے بھنے ہوئے آٹے کو ملایا جاتا ہے (بہتر آٹا مکئی کا ہوتا ہے) اور گھوٹنے سے گھوٹا (گھوٹنا) اور اس کا بالکل ملیدہ بنا دیا جاتا ہے۔ لیجیے ساگ تیار ہو گیا۔ [بیٹ میں بعض بچے ساگ میں آٹا ملائے جانے اور اس کے گھوٹے جانے سے قبل ہی اسے روٹی پر رکھ کر کھا جاتے تھے۔ اس کا ایک اپنا علیحدہ مزہ ہوتا تھا۔]

ساگ کا اصل لطف اسے گرم گرم کھانے میں آتا ہے۔ بیٹ میں لوگ عموماً ساگ طشتری میں نہیں بلکہ مکئی کی روٹی پر رکھ کر اور اس کے درمیان میں مکھن کی ڈلی ڈال کر کھاتے تھے اور یہ روٹی بھی گرم اور نرم ہوتی تھی۔ ٹھنڈی ہونے پر یہ قدرے سخت اور کچھ کچھ بے مزہ ہو جاتی تھی۔ ساگ کے ساتھ مولی اور آم، لیموں یا ہری مرچ کا اچار لازماً کھایا جاتا تھا۔

ہمارے گاؤں میں چھوٹے گوشت کی تین دکانیں تھیں۔ اصلاً یہ دکانیں نہیں تھیں بلکہ قصائی اپنے گوشت کی چھابڑیاں تھڑوں پر رکھ کر فروخت کرتے تھے۔ وڈھا (بڑا) گوشت ایک کشمیری قصائی بیچتا تھا۔ اسے عموماً وڈھا[1] قصائی کہا جاتا تھا۔ اس کا بچڑ خانہ[2] گاؤں سے کوئی ایک آدھ میل ہٹ کر کھیتوں کے بیچ واقع تھا۔ اس بچڑ خانے کے اوپر عموماً چیلیں اور گِدھیں منڈلاتی رہتی تھیں۔ قصائی کا نام غالباً غلام محمد تھا۔

---

1- وڈھا وڈھنا (کاٹنا) سے بنا ہے۔ وڈھنا قتل کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ویریاں نے اوہدا گل وڈھ دتا (دشمنوں نے اس کا گلا کاٹ دیا)۔ اس سے لفظ کی سنگینی کا احساس ہو جاتا ہے۔

2- اردو: بوچڑ۔ اصلاً یہ لفظ یورپی زبانوں کا ہے۔ برصغیر میں کب متعارف ہوا، کچھ معلوم نہیں۔ اسٹی و لیم فیلن اور ایس ٹی پلیٹس دونوں نے یہ لفظ نہیں دیا۔ لفظ کی ساخت سے معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کوئی ہمارا دیسی لفظ ہو۔

اس نے جب کوئی لوی[2] وچھی[3] ذبح کرنا ہوتی، وہ ایک شام پہلے ان گھروں میں جنھیں اس نے خصوصی طور پر نوازنا ہوتا تھا، خود اطلاع دینے پہنچتا تھا۔ ان گھروں میں ہمارا گھر بھی شامل تھا۔ اس کا گوشت سیروں کے حساب سے خریدا جاتا تھا اور بھون کر کھایا جاتا تھا۔ میں نے اتنا لذیذ گوشت بعد میں کبھی نہیں کھایا۔

جب میں مسجد میں ناظرہ قرآن مجید پڑھنا سیکھ رہا تھا، اس نے ہم طالب علموں کی اپنے گھر دعوت کی۔ اس نے ہمارے لیے خصوصی طور پر پلاؤ کی دیگ پکائی۔ پلاؤ اور بریانی میں عموماً پیاز ڈال کر اس کی رنگت تبدیل کر دی جاتی ہے مگر غلام محمد کا پلاؤ اجلی سفید چادر کی طرح بالکل چٹا سفید تھا۔ اس نے صرف زیرہ، سیاہ مرچ اور دھنیا ڈال کر یہ پلاؤ بنایا تھا۔ بعد میں بہت اچھے باورچیوں کے تیار کردہ پلاؤ، بریانی اور تخجن کھانے کے مواقع ملے مگر جو مزہ غلام محمد کے سیدھے سادے پلاؤ کھانے میں آیا تھا، وہ میں کبھی نہیں بھول پایا۔ آج بھی جب مجھے اس کی دعوت یاد آتی ہے میں اپنی انگلیاں چاٹتا رہ جاتا ہوں۔

جس علاقے میں ہمارا گاؤں واقع تھا، اگرچہ وہاں بیساکھ، جیٹھ اور ہاڑ کے مہینوں میں اتنی سخت گرمی پڑتی تھی کہ آدمی کو چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا تھا، انسان اور جانور بھی بلبلا اٹھتے تھے لیکن ساون کا آغاز ہوتے ہی آسمان پر ایسی گھنگھور گھٹائیں چھا جاتی تھیں کہ عین دوپہر کے وقت رات کا سماں بندھ جاتا تھا۔ خوب مینہ برستا تھا اور ہر طرف جل تھل ہو جاتا تھا۔ بعض اوقات تو ایسی جھڑی[4] شروع ہوتی کہ تین تین دن ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔ سارے گاؤں میں اس قدر پانی بھر جاتا تھا کہ باہر نکلنا دشوار ہو جاتا تھا۔ پگڈنڈیاں گنڈووں[5] سے اٹ جاتی تھیں۔ مور[6]، ڈڈو[7] اور جھینگر ساری رات ٹراتے رہتے تھے۔ سبز سبز کنکھجورے[8] ایک شاخ سے دوسری شاخ پر پھدکتے نظر آتے تھے۔ سانپ اور بچھو بھی زیادہ تر اسی موسم میں نظر آتے

---

1۔ ذبح: کھدھ۔ ال: ذبح۔

2۔ لوی: youngish۔ ہندی میں لوا (تلفظ lava = ل وا) little کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ پنجاب کے دیہاتوں میں یہ عام چلتا ہے لو اجند یا لوی لڑکی۔

3۔ وچھی: بچھیری۔ پنجابی میں وچھیری بھی مستعمل ہے۔

4۔ جھڑی: مسلسل بارش، بجلی بھی تیز۔ "کر شور مور، بگلے جھڑیوں کا مینہ بلا دیں۔ پی پی کریں پپیہے، مینڈک ملہار گاویں۔" (نظیر اکبر آبادی)۔

5۔ گنڈوا: کیچوا (earthworm)۔

6۔ مور: مور کی خوبصورتی اس کے پروں میں ہے اور پاؤں بہت بھدے ہوتے ہیں۔ اس کی آواز بھی بہت کرخت اور تیکھی ہوتی ہے۔ مغرب میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایسے ہی چیختا ہے جیسے کوئی عورت چیختی ہے۔ شاید اسی لیے نظیر اکبر آبادی نے بھی "کر شور مور" لکھا ہے۔ بیت میں بعض لوگ مور کے پروں کو قرآن مجید میں نشانی (bookmark) کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

7۔ ڈڈو: مینڈک۔

8۔ کنکھجورا: ہزار پا (centipede)۔

تھے۔ سیاہ ناگ، پھنیر اور کوڈیوں والے سانپ لمبے، موٹے اور بے حد خطرناک ہوتے تھے۔ بعض اوقات دو منہی بھی نظر آ جاتی تھی۔ بعض سانپ اتنے چھوٹے اور باریک ہوتے تھے کہ ان کا پتا تب چلتا تھا جب ان میں سے کوئی ایڑی سے ذرا اوپر آپ کی ٹانگ کاٹ لیتا تھا اور بعض کا رنگ اتنا سبز ہوتا تھا کہ جب وہ درختوں سے لپٹے ہوتے، ان میں اور شاخوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔

لیکن سب سے خوبصورت دن میں بیر بوٹیاں[1] اور رات کو جگنو ہوتے تھے۔ ہم رات کو جگنو پکڑنے کی کوشش کرتے تھے لیکن شاذ ہی کامیاب ہوتے تھے۔ اگر ہو بھی جاتے تھے وہ بھی ٹمٹماتا نہیں تھا، بس مرجھا کر رہ جاتا تھا۔ بعض لڑکے بالے بیر بہوٹیاں پکڑ کر اپنی کتابوں میں رکھ لیتے تھے۔

برسات کی ''خاص سوغات'' مکھیاں، پسّو، بھڑوی اور مچھر ہوتے تھے۔ پسو عموماً منجیوں کے سنگھوں میں چھپ جاتے تھے اور رات کو سوئے ہوئے آدمی پر ایسا ان بھول (اچانک، بے خبری میں) وار کرتے تھے کہ اسے پتا تب چلتا تھا جب وہ دندی وڈھ (دانت گاڑ) کر اس کا خون چوس چکے ہوتے تھے۔ بھڑوی ایک انتہائی باریک سا کیڑا ہے جو بعض اوقات آنکھ میں بھی گر جاتا ہے۔ یہ لاہور میں بھی پایا جاتا ہے۔ اگر آپ صبح سویرے سیر کے لیے اٹھیں، کبھی کبھی آپ کو محسوس ہوتا ہے کوئی باریک سی چیز آپ کے ننگے بازو کو کاٹ گئی ہے۔ یہی بھڑوی کہلاتی ہے۔ بیٹ میں یہ انسانوں کو کم لیکن حیوانوں کو زیادہ تنگ کرتی تھی۔ ان کے جھنڈ کے جھنڈ ان پر حملہ آور ہوتے تھے اور وہ بیچارے ساری رات اپنی پوچھلیں ہلا ہلا کر انھیں اڑانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ حیوانوں کو ان کی یلغار سے بچانے کے لیے انھیں آگ کی دھوئی دی جاتی تھی۔

لیکن دنیا کی سب سے لعنتی، اوچھی، ذلیل، رذیل بلکہ ارذل مخلوق مچھر ہے۔ وہ انسان کا سفاک ترین اور مہلک ترین دشمن ہے۔

ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح بیٹ میں بھی برسات کے موسم میں خاص طور پر مکھیوں اور مچھروں کی بہتات ہوتی تھی۔ دن کو مکھیاں تنگ کرتی تھیں اور رات کو مچھر۔ اس زمانے میں بیٹ کے لوگ مچھر دانیوں سے نا آشنا تھے۔ وہ گھروں کی چھتوں پر یا حویلیوں کے کھلے صحنوں میں اور بعض اوقات کھیتوں میں سوتے تھے۔ مچھروں سے بچنے کے لیے وہ اپنے ابدان کے اردگرد چادر یا کھیس لپیٹ لیتے تھے۔ اگر

---

[1] اردو: بیر بہوٹی، بیر ہندی میں ناری/استری/عورت کو کہا جاتا ہے اور بہوٹی کا مطلب دھرتی ہے۔ پنجابی میں بوٹی یا ووٹی دلہن کو کہا جاتا ہے۔ حکیم اور وید بیر بہوٹی کو خشک کرکے ادویات میں استعمال کرتے تھے۔ بیر بہوٹی گہرے سرخ رنگ کی بھی علامت ہے۔

موسم خوشگوار ہوتا اور ہوا چل رہی ہوتی تو یہ حربہ کامیاب رہتا تھا، تاہم اگر ہوا بند ہو جاتی اور حبس اپنا جلوہ دکھانے لگتا، پھر قیامت آ جاتی۔ ساری رات مچھروں سے پیچھا چھڑانے میں گزر جاتی۔

مچھروں کے کاٹنے سے طرح طرح کے عوارض لاحق ہو جاتے ہیں۔ مشہور ترین ملیریا، ڈینگی اور زرد بخار ہیں۔ زرد بخار (yellow fever) کا نشانہ زیادہ تر جنوبی امریکا کے لوگ بنتے ہیں۔ بڑا جان لیوا مرض ہے۔ ڈینگی بخار کا اس زمانے میں کسی نے نام بھی نہیں سنا تھا۔ اسے انگریزی میں ہڈی توڑ (bone-breaking) بخار بھی کہا جاتا ہے۔ ملیریا کو تپا یا باری کا بخار بھی کہا جاتا تھا کیونکہ اس میں مبتلا مریض کو ایک دن تیز بخار ہو جاتا تھا، دوسرے دن وہ تقریباً ٹھیک ہو جاتا تھا مگر تیسرے دن بخار پھر اسے آ لیتا تھا۔ اس میں پہلے کانپا لگتا تھا یعنی مریض کو پہلے سردی لگتی اور اس پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی، پھر اسے تیز بخار آ دبوچتا تھا جو بسا اوقات 105 درجے فارن ہائیٹ تک پہنچ جاتا تھا۔ مریض کو کمبل یا رضائی اوڑھانا پڑتی تھی۔ اس کا علاج عموماً کونین کی گولی سے کیا جاتا تھا۔ اکثر اوقات یہ گولی بہت کارآمد ثابت ہوتی تھی اور مریض عموماً دو چار روز بعد ٹھیک ہو جاتا تھا۔ بخار کی حالت میں مریض کا جسم پھنک رہا ہوتا تھا مگر مقررہ وقفے وقفے سے گولی کھانے پر اسے پسینا آتا اور جسم ٹھنڈا پڑنے لگتا، تو یہ اس بات کی علامت ہوتی تھی کہ وہ صحت یاب ہونے لگا ہے۔

کونین کی گولیاں ہمارے سکول میں بھی باقاعدہ کھلائی جاتی تھیں۔ یہ گولی بے انتہا کڑوی ہوتی تھی اور اس کا نگلنا خاصا مشکل ہوتا تھا۔ نگلے جانے کے بعد منہ کی کڑواہٹ کافی دیر تک باقی رہتی تھی۔ طالب علموں کو اسے محض احتیاطی تدبیر کے طور پر کھلایا جاتا تھا۔

مچھر اتنی ڈھیٹ مخلوق ہے کہ آپ جتنی چاہیں، جراثیم کش ادویات چھڑک لیں، ان میں بعض پھر بھی بچ جاتے ہیں، وہ ان ادویات کا زور توڑنے کے لیے پہلے سے بھی زیادہ طاقتور ہو جاتے ہیں۔ ان سے صرف احتیاطی تدابیر اختیار کر کے ہی بچا جا سکتا ہے۔ جن جگہوں پر مچھر پلتا ہے، انھیں صاف ستھرا رکھا جائے، نالیوں سے بالخصوص بچا جائے۔ یہ نالیاں ہی تھے جن سے چپک کر مچھر ان علاقوں میں بھی پہنچ گئے جہاں یہ پہلے بالکل نہیں پائے جاتے تھے۔ کمروں میں بھی مچھر دانی تان کر سویا جائے۔ دروازے، دریچے اور روشن دانوں وغیرہ میں جالیاں لگوائی جائیں۔ آج سے چند سال پہلے ہمارے ہاں گھروں میں عموماً دہرے دروازے اور کھڑکیاں لگائی جاتی تھیں، ایک جالی دار اور دوسری جالی کے بغیر۔ پھر یہ رواج ختم ہو گیا۔ شاید خوبصورتی کا تقاضا تھا۔ مچھروں سے بچنے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ رات کو سوتے وقت چہرے اور ہاتھوں پر مچھروں کو بھگانے والی ادویات (repellants) استعمال کی جائیں۔

اب نئی اطلاع یہ آئی ہے کہ انگلستان کی بعض یونیورسٹیوں میں مچھر کا بالکل ہی خاتمہ کرنے کی ایک ترکیب پر کام ہو رہا ہے جس کے مطابق مچھرنی انڈے تو دے سکے گی مگر پیدا زیادہ تر نر مچھر ہی ہوں گے، یوں نہ مچھرنی رہے گی اور نہ اس کی آل اولاد۔

## 23

برصغیر کے دیگر علاقوں کی طرح بیٹ میں بھی پہلے عورتوں کو چکی پیسنا پڑتی تھی۔ پھر خراس لگنا شروع ہو گئے۔ ہمارے علاقے میں خراسوں کے مالک عموماً لوہار یا ترکھان ہوتے تھے لیکن انھیں چلانے کے لیے کسان اپنے بیل خود لے کر آتے تھے۔ پسائی کا معاوضہ نقدی کی صورت میں وصول نہیں کیا جاتا تھا بلکہ خراس کا مالک پسے ہوئے آٹے کی کچھ مقدار کاٹ لیتا تھا۔ ان خراسوں نے اکثر عورتوں کی چکی سے جان چھڑا دی۔

پھر پرجیاں خرد کے ایک نوجوان بشیر احمد نے ڈیزل سے چلنے والی مشینی چکی نصب کر لی۔ اس چکی کے اوپر ڈیزل کا دھواں باہر نکالنے کے لیے جو چمنی تعمیر کی گئی، اس کے باہر کے منہ پر ایک قسم کی جالی لگائی گئی۔ جب دھواں اس جالی سے ٹکراتا تھا، چمنی سے ٹھک ٹھک کی آواز نکلنے لگتی تھی۔ یہ آواز دور دور تک سنائی دیتی تھی۔ اس آواز کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ چکی چل رہی ہے۔ پاکستان کے بعض دیہاتوں میں، جہاں بجلی نہیں، یہ چکیاں آج بھی موجود ہیں۔

بشیر احمد خاصا خوش رو اور خوش شکل نوجوان تھا۔ اس کی شادی دانے وال کی ایک لڑکی جسے ملکھی [اصل نام مجھے یاد نہیں رہا] کہا جاتا تھا، بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ کئی دن تک دھوتیں اڑتی رہی تھیں۔ ملکھی دبلے پتلے اور سڈول جسم کی مالک تھی لیکن وہ تھی بڑی نک چڑھی۔ چنانچہ یہ شادی سرے نہ چڑھ سکی اور غالباً ایک دو سال میں ہی طلاق پر منتج ہوئی۔

ملکھی کا باپ فتح محمد خاصا کھاتا پیتا آدمی تھا۔ وہ جالندھر کے کسی نامی گرامی وکیل کا ایجنٹ تھا [اس زمانے میں وکیل کے منشی کو ایجنٹ کہا جاتا تھا]۔ ملکھی کے چار بھائی تھے۔ بڑا بھائی نذیر احمد محکمہ خوراک میں فوڈ انسپکٹر بھرتی ہوا۔ اس سے چھوٹا بشیر احمد تقسیم کے بعد چیچہ وطنی کے قریب ایک گاؤں میں آباد ہو گیا۔ وہ مقامی سیاست میں جوش و خروش سے حصہ لیتا تھا اور دیہاتیوں کے کام کرانے کے لیے اکثر کچہریوں اور سرکاری دفتروں کے چکر کاٹتا رہتا تھا۔ یوں وہ بہت مقبول ہو گیا تھا اور اسمبلیوں کے انتخابات لڑنے والے

امیدوار اس کی مدد کے محتاج رہتے تھے۔ تیسرا محمد اسلم میٹرک میں میرا ہم جماعت تھا۔ ہم بیٹھتے بھی ایک ہی بنچ پر تھے۔ وہ اور ان کا سب سے چھوٹا بھائی محمد اکرم بورے والا میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ دونوں نے بورے والا گرین مارکیٹ (دانہ منڈی) میں دکانیں بنائی تھیں۔ دونوں مقامی سیاست میں سرگرم حصہ لیتے رہے اور محمد اسلم تو ایک مرتبہ بورے والا بلدیہ کا چیئرمین بھی منتخب ہو گیا تھا۔

ایک اور نامی گرامی ایجنٹ پر جیاں خرد کے میاں محمد عبداللہ تھے۔ میاں صاحب کا خاندان بہت لمبا چوڑا اور خاصا پڑھا لکھا تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر اچھے سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔ ان کے اپنے چار بیٹے تھے۔ وہ چاروں کے چار بہت لائق فائق تھے مگر سب سے ذہین اور لائق بڑا بیٹا بشیر احمد تھا۔ وہ ہمارے علاقے کا غالباً پہلا طالب علم تھا جو مغل پورہ لاہور کے انجینئرنگ کالج (موجودہ یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی) میں داخل ہوا تھا۔ بہت کے لوگ اس کی مثالیں دیا کرتے تھے۔ بی ایس سی (انجینئرنگ) کرنے کے بعد وہ بطور ایس ڈی او محکمہ انہار میں بھرتی ہوا اور بحیثیت چیف انجینئر ریٹائر ہوا۔ اس کی شادی بٹالہ کے ایک ارائیں خاندان میں ہوئی تھی۔ دلہن کے دو بھائی تھے۔ ایک کا نام ایچ ایم ایس (صدیق) چودھری اور دوسرے کا سی ایم لطیف تھا۔ ایچ ایم ایس پاکستان بحریہ (نیوی) کے پہلے پاکستانی کمانڈر انچیف بنے۔ [متحدہ ہندوستان کی نیوی میں وہ واحد مسلمان کمانڈر تھے۔] فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے دور حکومت میں وہ صدر سے شدید اختلافات کے باعث وقت سے پہلے ریٹائر ہو گئے۔

دوسرے بھائی سی ایم لطیف تقسیم ہند سے قبل ابتدا میں صابن بنا کر بیچا کرتے تھے اور صابن والا صاحب کہلاتے تھے۔ پھر انھوں نے چارہ کترنے کی ٹوکا مشین بنانا شروع کر دی۔ ان کا یہ نیا دھندا اتنا کامیاب رہا کہ انھوں نے اپنی ایک انجینئرنگ فرم بنائی جس کا نام انھوں نے بٹالہ انجینئرنگ کمپنی (بیکو) رکھا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ اپنی فرم لاہور لے آئے۔ یہاں اسے اتنا فروغ حاصل ہوا کہ بیکو ایک سکہ بند کمپنی بن گئی۔ لطیف صاحب اب صرف ٹوکا مشینیں ہی نہیں بناتے تھے بلکہ سائیکلیں، ٹیکسٹائل ملوں کے کرگھے اور متعدد اقسام کی دیگر مشینیں بھی ساخت کرنے لگے تھے۔ ان کی فرم کو سب سے پہلی زک ایوب خاں کے دور میں پہنچی۔ کرگھے فروخت کرنے میں جاپانیوں کو پاکستان میں تقریباً اجارہ داری حاصل تھی۔ انھوں نے جب دیکھا کہ خود پاکستان میں ان کا حریف پیدا ہو گیا ہے، وہ اس کے توڑ کی تدبیریں کرنے لگے۔ اتفاق سے انھی دنوں پاکستان کے سیکرٹری تجارت جاپان کے دورے پر تھے۔ جاپانیوں نے انھیں منہ مانگی رشوت پیش کی اور پیشکش کی کہ وہ اپنے کرگھے پاکستان فرم کے نرخوں پر بیچنے پر تیار ہیں اور وہ بھی deferred payment پر یعنی مال پہلے مہیا کریں گے اور قیمت گاہک کی سہولت کے مطابق بعد میں وصول کریں گے۔ سیکرٹری

ایوب خاں سے ملے اور انھیں یہ بتائے بغیر کہ کر گے پاکستان میں بننے لگے ہیں، انھیں مطلع کیا کہ "میں جاپانیوں سے یہ پرکشش پیشکش منوانے میں کامیاب رہا ہوں۔" ایوب خان اکثر کہا کرتے تھے کہ پاکستان کے اصل حکمران سی ایس پی حضرات ہیں، پھر وہ بھلا اپنے سیکرٹری کی بات کیوں نہ مانتے۔ جاپانیوں کے بہتر اور زیادہ سستے مال کے سامنے پاکستانی مال کیسے ٹھہر سکتا تھا، چنانچہ پیکو کا یہ شعبہ بند ہو گیا۔[1]

انگریزی زبان کی ایک مشہور ضرب المثل ہے:

The road to hell is paved with good intentions.[2]

اس کا مفہوم یہ بیان جاتا ہے: جب آپ کسی کام کا بیڑا اٹھاتے ہیں، ممکن ہے آپ کی نیت بالکل صاف اور نیک ہو، لیکن اگر آپ اپنے اقدام سے پہلے یہ نہیں سوچتے یا اس امر کی پروا نہیں کرتے کہ اس کا اثر دوسروں پر کیا پڑے گا، پھر آپ کی نیک نیتی دھری کی دھری رہ جاتی ہے یا الٹا ضرر کا باعث بنتی ہے۔

ممکن ہے پیپلز پارٹی نے اپنی دانست میں قومیانے کی پالیسی نیک نیتی سے نافذ کی ہو مگر عملاً اس کا نتیجہ تباہ کن ثابت ہوا۔ ملک کی معیشت take-off سٹیج[3] پر پہنچ چکی تھی، اس کی حالت دگرگوں ہو گئی اور آج تک سنبھل نہیں سکی۔ جو جائز ناجائز سرمایہ صنعت کاری پر صرف ہوتا تھا، اس کا رخ real estate[4] کی جانب مڑ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمینوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ اس صورت حال میں سیٹھ عابد جیسے لوگوں نے خوب ہاتھ رنگے مگر کسی شریف آدمی کے لیے پانچ مرلے کا مکان بنانا بھی خواب بن گیا۔

اسی طرح طالبان نے بھی شاید اپنے تئیں اسامہ بن لادن کو پناہ نیک نیتی سے ہی دی ہو مگر اس کے بھیانک نتائج ہم آج بھی بھگت رہے ہیں اور ان سے پیچھا چھڑانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

---

1- یہ ساری داستان اپنی جزئیات سمیت 1960 کی دہائی کے آخری سالوں (صحیح سن مجھے یاد نہیں رہا) میں لاہور کے ماہنامے "حکایت" میں شائع ہوئی تھی اور کسی نے اس کی تردید نہیں کی تھی۔

2- اس ضرب المثل کا ماخذ بارہویں صدی کے متعدد خانقاہوں کے بانی Saint Bemard of Clairvaux کے ایک الہامی جملے کو قرار دیا جاتا ہے جس کا انگریزی میں مفہوم یہ ہے: Hell is full of good wishes and desires۔ جن لوگوں نے اس ضرب المثل کو اپنی تحریروں میں استعمال کیا ہے، ان میں ڈاکٹر سیموئیل جونسن، ایس ٹی کولرج، سر والٹر سکاٹ، کیرکے گارڈ، کارل مارکس اور ہیڈز (گلوکار) بھی شامل ہیں۔

3- امریکی ماہر معاشیات والٹ وٹ مین رستوف (Walt Whitman Rostow) کے نظریے کے مطابق کسی ملک کی معیشت take off stage پر تب پہنچتی ہے جب اس کا انحصار غیروں پر کم ہونے لگتا ہے اور وہ تیزی سے خود انحصاری (rapid, self-sustained growth) کی طرف قدم بڑھانے لگتی ہے۔

4- غیر منقولہ املاک بشمول زرعی، رہائشی، تجارتی اور صنعتی زمینوں اور ان پر بنی ہوئی تعمیرات کی خرید و فروخت اور انھیں کرائے یا پٹے پر چڑھانے کا کاروبار۔ انگریزی اسے real property بھی کہتے ہیں۔

# 24

میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ بیت کے لوگ صغرسنی کی شادیاں کرتے تھے یا نہیں، تاہم تقسیم ہند سے قبل مجھے اپنے رشتے داروں، احباب یا ملنے جلنے والے اشخاص کی جن شادیوں میں شریک ہونے کے مواقع ملے، ان میں سے کوئی بھی شادی ایسی نہیں تھی جس میں دلہا دلہن کی عمر پندرہ سولہ سال سے کم ہو مگر اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں بھی نابالغ لڑکے لڑکیوں کی شادیاں کرنے کا رواج رہا ہے اور پاکستان میں قانونی طور پر ممانعت ہونے کے باوجود اب بھی اکا دکا ایسے واقعات ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ اس قسم کی شادیوں کے حق میں ہیں، وہ اپنے موقف کی تائید میں حضرت عائشہؓ کی مثال پیش کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ حضرت عائشہؓ کا نکاح سات سال کی عمر میں ہوا تھا اور رخصتی نو سال کی عمر میں ہو گئی تھی۔ یہ روایت اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ سب لوگ آنکھیں بند کر کے اسے قبول کر لیتے ہیں۔ میرے مرحوم دوست اور گورنمنٹ کالج لاہور میں میرے رفیق کار پروفیسر رفیع اللہ شہاب اپنے انگریزی مضامین میں، جو روزنامہ پاکستان ٹائمز میں چھپتے رہتے تھے، اس موقف کی پرزور تردید کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے مختلف تاریخی حوالوں سے ثابت کیا تھا کہ یہ قصہ آنحضرتؐ کے وصال کے کوئی دو سو سال بعد تراشا گیا تھا تا کہ عربوں کو صغرسنی کی شادیوں کا جواز مل سکے جن کا ان میں خاصا رواج تھا حالانکہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر کم از کم سولہ سال اور بوقت رخصتی کم از کم اٹھارہ سال تھی۔

روزنامہ ''ڈان'' کے 3۔اگست 2012 کے شمارے میں اپنے مضمون بعنوان Child Marriage and Islam میں بمبئی کے ممتاز عالم دین (scholar) اصغر علی انجینئر مرحوم نے انکشاف کیا تھا کہ اس مسئلے کے متعلق جو جدید تحقیق ہوئی ہے اس کے مطابق نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر 17 یا 18 سال اور بوقت رخصتی 19 یا 20 سال تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اس تحقیق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ اور پڑھ چکے ہیں اور معقول وجوہ کی بنا پر اسے قابل قبول سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا بھی ہے کہ اس قسم کی شادیاں قرآن مجید کی روح اور منشا کے بھی خلاف ہیں کیونکہ سورۃ النسا کی آیت نمبر 21 میں شادی کو میاں بیوی کے مابین ''میثاقاً غلیظا''[1] کہا گیا ہے۔ اسلام

---

1۔ میثاقاً غلیظا کا ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی نے ''گاڑھا اقرار'' جبکہ علامہ محمد اسد اور پروفیسر احمد علی دونوں نے solemn pledge کیا ہے۔ خود اصغر علی انجینئر نے اسے strong covenant کہا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے پوری آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے ''اور تم ''اس'' کو کیسے لیتے ہو حالانکہ تم باہم ایک دوسرے سے بے تکلفانہ مل چکے ہو اور وہ عورتیں تم سے ایک گاڑھا اقرار لے چکی ہیں۔'' اس سے تھانوی کے ترجمے کے مطابق وہ ''انبار کا انبار مال'' ہے جو شوہر اپنی بیوی یا بیویوں کو دے چکا ہو اور جن کا ذکر آیت نمبر 20 میں ہو چکا ہے۔

میں شادی ایک قسم کا معاہدہ ہے جسے صرف بالغ اشخاص ہی سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں، نابالغ بچے بچیاں نہیں۔ جب قرآن خود اسے معاہدہ قرار دیتا ہے، پھر ان شادیوں کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہم نہ قرآنی تعلیمات پر پورا عمل کرتے ہیں اور نہ رسم و رواج کی کامل پیروی۔ اپنی سہولت دیکھتے ہیں، جو چیز ہمارے مفاد میں ہو اسے اپنا لیتے ہیں۔

یوں تو اسلام نے عورتوں کو متعدد حقوق دیے ہیں مگر عملاً ہندوؤں کی طرح مسلمان بھی عموماً عورتوں کو دوسرے درجے کی مخلوق ہی سمجھتے چلے آ رہے ہیں۔ ہندی فلموں میں اب بھی شوہر کو پرمیشر جی کہا جاتا ہے یعنی شوہر کا درجہ دیوتا کے برابر ہے اور وہ اسے پوجتی ہے۔ بعض گھرانوں میں تو انھیں معمولی معمولی باتوں پر پیٹنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ ہیت میں بھی صورت حال مختلف نہیں تھی۔ باپ، بھائی اور خاوند ذرا ذرا سی بات پر ان کی اچھی خاصی دھنائی کر دیتے اور وہ بے چاریاں اف تک نہ کرتیں۔ پھر عورت کو ناقص العقل بھی تصور کیا جاتا تھا۔ میرے بچا یوں تو پڑھے لکھے تھے۔ ان کے پاس مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی اور متعدد دیگر کتابیں تھیں مگر اپنے سارے علم کے باوجود وہ ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ عورت کی عقل اس کی گت میں ہوتی ہے۔ معلوم نہیں انھوں نے یہ فلسفہ کسی کتاب میں پڑھا تھا یا خود گھڑا تھا لیکن اس پر اصرار بہت کرتے تھے۔ عقل گت میں کیسے چلی گئی اور اگر غلطی سے چلی بھی گئی، پھر ناقص کیسے ہوئی، میری سمجھ میں کبھی نہ آیا۔

برصغیر میں عورت پر جو ظلم ہوتا ہے، اس میں خود عورت کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ عورت دبو تب تک رہتی ہے جب تک اس کی اولاد نرینہ جوان نہیں ہو جاتی۔ جب بیٹے بڑے ہو جاتے ہیں، باپ کی حیثیت کمزور ہونے لگتی ہے۔ اب دبو وہ بن جاتا ہے اور عورت شیر کیونکہ بیٹے زیادہ تر باپ کی بجائے ماں کا ساتھ دیتے ہیں۔ پھر جب کسی بیٹے کی شادی ہو جاتی ہے تو ساس بہو سے وہی سلوک کرنے لگتی ہے جو خود کبھی اس کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ برصغیر میں بہو اور ساس کی کشمکش ہمیشہ سے چلی آ رہی ہے اور شاید مدتوں چلتی رہے گی۔ سندھی کی نامور شاعرہ عطیہ داؤد نے اپنے ایک کتابچے میں سندھی عورت کی مظلومیت کا رونا رویا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے جو متعدد دل خراش واقعات تحریر کیے ہیں، ان میں ایک یہ ہے: ایک نوجوان نے اپنے کسی مخالف کو قتل کر دیا۔ جب اسے اپنے اس فعل کی سنگینی کا احساس ہوا، وہ بھاگم بھاگ گھر آیا اور ماں کو ساری واردات سے آگاہ کر دیا۔ جب وہ اس بھیانک واقعے کی تفصیل بیان کر رہا تھا، اس کی نوجوان خوبصورت بیوی آٹا گوندھ رہی تھی۔ ماں بہت چالاک اور زیرک عورت تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ بہو کا کیا ہے، اور مل جائے گی مگر بیٹا دوسرا نہیں ملے گا۔ چنانچہ بیٹے کو بچانے کی ترکیب فوراً اس کے ذہن میں

آ گئی۔ اس نے بہو کی طرف اشارہ کیا، بیٹا اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے جس بندوق سے اپنے مخالف پر گولی چلائی تھی، اس سے اپنی بیوی کو بھون ڈالا اور یوں یہ واردات قتل کی بجائے غیرت کا معاملہ بن گئی۔

## 25

جب میں مڈل سکول میں پڑھتا تھا، ہمارے گاؤں کا ایک نوجوان دین محمد ڈابھیل[2] کے دارالعلوم سے فارغ ہو کر واپس آیا تھا۔ وہ اس دور افتادہ مدرسے میں کیسے پہنچا، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ممکن ہے وہ گیا تو دیو بند ہی ہو مگر جب علامہ شبیر احمد عثمانی اکابرین دیو بند سے اختلافات کے باعث کچھ عرصے کے لیے ڈابھیل چلے گئے، وہ بھی اپنے استاد کے ہمراہ ہو گیا ہو۔ وہ عبدالعزیز خالد کا رشتے دار تھا۔ عزیز نے اس سے عربی پڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ وہ ہم دونوں کو پڑھانے پر راضی ہو گیا۔ ہم روزانہ اس کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اس سے عربی کے ابتدائی اسباق کا درس لیتے رہتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے عربی کی ابتدائی کتاب ختم ہو گئی اور دوسری شروع ہو گئی۔ پھر جانے کیا افتاد آ پڑی کہ مجھے یہ سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ [جس کا مجھے اب بھی افسوس ہوتا ہے کہ اچھی بھلی سہولت دستیاب ہوئی تھی، اس سے بھی فائدہ نہ اٹھا سکا]۔ مگر عزیز ڈٹا رہا اور مسلسل ڈیڑھ دو سال پڑھتا رہا اور اسے عربی زبان میں خاصا درک حاصل ہو گیا۔ اس سے اسے بعض مزید زبانیں سیکھنے کی تحریک ملی اور وہ ہفت زبان بن گیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے کلام نظم و نثر میں چن چن کر ایسے ایسے دقیق اور اجنبی الفاظ استعمال کرنے لگا جنہیں سمجھنے کے لیے بعض اوقات اردو لغت بھی کوئی مدد نہیں کرتی۔ چنانچہ بعض لوگ اس کے اشعار سن کر اس سے مزاحاً کہتے تھے: ''یار، اب ان کا اردو میں ترجمہ بھی کر دو''۔ بہر حال اس نے جس طرح مہابھارت کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے وہ خاصا بڑا کارنامہ ہے۔ اس نے سنسکرت کے بے شمار اصل الفاظ استعمال کیے ہیں مگر ہم جیسے عامیوں کی سہولت کے لیے ان کا اردو ترجمہ بھی ساتھ ساتھ لکھ دیا ہے۔

ایک لحاظ سے ہمارا خاندان مولویوں کا خاندان تھا۔ میرے نانا اپنے گاؤں لوکھوحہ اور تایا جان محمد ہمارے گاؤں کی مسجد کے خطیب تھے، لیکن دونوں سے بڑھ کر مولانا عبدالرحمٰن تھے۔ وہ اسلامیہ ہائی سکول ننگل انبیا کے بانی مولوی پیر محمد کے داماد تھے کہ ان کی بڑی بیٹی زینب اُن سے بیاہی ہوئی تھی۔ ان کا نکودر میں خاصا بڑا دینی مدرسہ تھا جہاں تجوید کے علاوہ قرآن مجید اور حدیث کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان کے

---

2- گجرات کی بحری بندرگاہ سورت کے قریب ایک قصبہ۔

مدرسے میں دور دور سے طلبا تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ ہمارے گاؤں کی مسجد کے مؤذن قاری یار محمد نے، جو ضلع خوشاب کے کسی گاؤں کے رہنے والے تھی، قرات انھیں سے سیکھی تھی۔ قاری یار محمد کو قدرت نے اتنی خوبصورت اور سریلی آواز سے نوازا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ وہ تلاوت کرتے رہیں اور ہم ہمہ تن گوش ہو کر سنتے رہیں۔ جب وہ فجر کی اذان دیتے تھے، اس کی آواز ایک میل سے بھی زیادہ دور تک سنی جا سکتی تھی۔ [عبدالعزیز خالد کا منجھلا بھائی بھی بہت سریلی آواز میں اذان دیتا تھا۔ اس میں بس یہی ایک گن پایا جاتا تھا۔] ہمارے ایک دوست تقی الدین پال، جن کا اصلاً شاعر اور نقاد صفدر میر اور زاہد ڈار کے بڑے بھائی آفتاب ڈار کے ساتھ گہرا یارانہ تھا اور جنھوں نے موسیقی کا بہت اعلیٰ ذوق پایا تھا [انھوں نے شادی ایک کلاسیکی گانے گانے والی گلوکارہ سے کی تھی]، اکثر کہا کرتے تھے کہ ان کے پڑوس کی مسجد کا مؤذن صبح کی اذان بھیرویں میں دیتا ہے۔ اگر مجھ میں موسیقی کی باریکیوں کی سمجھ بوجھ ہوتی تو میں بھی یہی کہتا کہ قاری یار محمد فجر کی اذان بھیرویں میں دیتے تھے۔ یہی نہیں، انھیں یہ بھی علم تھا کہ کون سی اذان لمبی کھینچنا ہے اور کون سی مختصر کرنا ہے، مثلاً فجر کی اذان جو نور پیر[1] کے وقت دی جاتی ہے، اس کے لیے آدمی کے پاس وقت ہی وقت ہوتا ہے (بشرطیکہ وہ ذرا جلدی اٹھ جائے) اور وہ ہوتا بھی تازہ دم ہے، اس لیے وہ اسے خاصا طویل کر دیتے تھے لیکن مغرب کی اذان نسبتاً چھوٹی کر دیتے تھے کیونکہ مغرب کی نماز کے لیے نسبتاً کم وقت ہوتا ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن مدرسہ ہی نہیں چلاتے تھے بلکہ سیاست میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ وہ مجلس احرار کے فعال کارکن تھے اور ان کا اس کے صف دوم کے رہنماؤں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان کی بڑی بیٹی آپا امۃ اللہ کی شادی مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی[2] کے خاندان میں ہوئی تھی۔ یہ کسی وجہ سے ناکام ہو گئی تھی مگر دونوں خاندانوں کے تعلقات میں کوئی دراڑ نہیں پڑی تھی۔ ان کے افراد آج تک ایک دوسرے سے ملتے ملاتے رہتے ہیں۔

---

1- صبح صادق۔ اردو میں نور کا تڑکا مستعمل ہے۔

2- مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا شمار مجلس احرار کے بانیوں اور صف اول کے رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ وہ مجلس کے امیر بھی رہ چکے تھے۔ مجلس کے دیگر رہنماؤں کی طرح وہ بھی ایک طرح کے شعلہ بیان مقرر تھے۔ وہ پکے قوم پرست، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے سخت مخالف اور مزدوروں اور کسانوں کے مفادات کے زبردست حامی تھے۔ معروف کمیونسٹ ادیب عبداللہ ملک نے اپنی کتاب "داستان خانوادہ مولانا احمد علی لاہوری" میں لکھا ہے کہ وہ بائیں بازو کے مفکرین کے افکار سے ہی متاثر ہو کر کمیونسٹ نہیں ہوئے تھے بلکہ آئمہ اور علمائے حق کی تحریروں، تقریروں اور صحبتوں نے بھی مہمیز کا کام دیا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی ایک تقریر سے یہ اقتباس نقل کیا ہے۔ (بقیہ اگلے صفحے پر)

مولانا عبدالرحمٰن تقسیم ہند کے بعد لائل پور میں آباد ہو گئے تھے لیکن وہ یہاں کوئی مدرسہ قائم نہ کر سکے۔ ایک تو مالی وسائل کی کمی ان کے راستے کی رکاوٹ بنی [انھیں اپنے عظیم الشان مدرسے کے عوض یہاں کوئی مدرسہ الاٹ نہیں ہو سکتا تھا] دوسرے ان کی صحت بھی اچھی نہیں رہی تھی۔ وہ بہت جلد انتقال کر گئے۔ ان کا کنبہ آج بھی فیصل آباد میں پولیس چوکی جھنگ بازار کے بالکل سامنے ایک سہ منزلہ مکان میں آباد ہے۔ ان کے تین بڑے صاحب زادے کاروبار میں پڑ گئے مگر سب سے چھوٹا محمود ایم اے کرنے کے بعد لندن چلا گیا۔ وہاں اس نے چارٹرڈ اکاؤنٹنسی کا امتحان پاس کیا، پہلے ایک نجی فرم میں ملازمت اختیار کی اور پھر اپنی فرم کھول لی۔ اس نے ایک آئرش لڑکی سے شادی کی جس کے بطن سے اس کے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ یہ لڑکی اتنی اچھی تھی کہ اس نے مولانا عبدالرحمٰن لدھیانوی کے قدامت پسند گھرانے کے افراد کے بھی دل موہ لیے۔ وہ دو تین مرتبہ پاکستان آئی تھی اور خالہ زینب بھی اس سے مل کر بہت خوش ہوتی تھیں۔ میں جب بھی لندن جاتا تھا، میں بھی ان سے ملنے چلا جایا کرتا تھا۔ محمود عالم شباب میں انتقال کر گیا، پتا نہیں اب اس کے بیوی بچے کس حال میں رہتے ہیں۔

خالہ زینب کٹر مسلمان تھیں۔ آخر عمر تک سفید شٹل کاک برقع پہنتی رہیں۔ میں 54-1953 میں ایک سال اسلامیہ کالج لائل پور میں پڑھتا رہا تھا۔ اگر مجھے لاہور یا اپنے گاؤں نہ جانا ہوتا، میں ہر اتوار کو ان کے ہاں چلا جاتا۔ کئی کئی گھنٹے وہاں بیٹھا رہتا کہ خالہ اٹھنے ہی نہیں دیتی تھیں۔ میں انھیں چھیڑنے کے

(بقیہ پچھلے صفحے سے) "میرے نزدیک ہندوستان کی مشکلات کا حل صرف ایک ہے کہ ہندوستان کے تمام قوم پرست کسانوں اور مزدوروں کی تنظیم کریں اور ہندوستان میں بجائے ایک سرمایہ دار حکومت کے غربا کی حکومت قائم کریں۔ میں اگرچہ کانگرسی ہوں اور میں نے ہمیشہ کانگریس کے جھنڈے تلے کام کیا ہے (اس زمانے میں اکثر احراری کانگرس کے ہم نوا تھے) مگر مجھے اس کے کہنے میں کچھ پس و پیش نہیں ہے کہ کانگریس کی محنت اور قربانی کا نتیجہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان کی حکومت انگریز سرمایہ داروں کے ہاتھ سے لے کر ہندوستان کے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں دے دی جائے گی بلکہ ڈومینین سٹیٹس کی شکل میں حکومت قائم ہوگی اس میں ہندو اور انگریز سرمایہ دار مل کر یہاں کے غربا کو کچلنے کی کوشش کریں گے۔" (اس وقت تک کانگرس نے مکمل آزادی کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔)
مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی تقسیم کے بعد پاکستان آ گئے تھے مگر لاہور میں صرف ایک رات قیام کرنے کے بعد وہ اپنے بال بچوں سمیت واپس چلے گئے تھے کہ "مشرقی پنجاب میں ابھی ہزاروں مسلمان موجود ہیں، انھیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑا جا سکتا، انھیں میری رہنمائی کی ضرورت ہے۔" تاہم ان کے خاندان کے باقی افراد گوجرہ میں آباد ہو گئے تھے۔ ان میں مشہور ترین حمزہ ہیں جو مسلم لیگ (ن) کی ٹکٹ پر کئی بار قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو چکے تھے۔ 2012 میں سینیٹ کے رکن بھی رہے۔ ان کی ہمشیرہ کی شادی میرے ایک عزیز اور شاگرد بیرسٹر رشید احمد سے، جو ملتان کے معروف وکیل ہیں، ہوئی۔ وہ ملتان گورنمنٹ کالج فار ویمن میں جغرافیہ پڑھاتی رہی ہیں۔

لیے کبھی کبھار کوئی اتنی سیدھی بات کہہ دیتا اور وہ چڑ کر مجھ سے پوچھنے لگتیں: "حمید، تم وہابیے تو نہیں ہو گئے؟" پھر خود ہی جواب دیتیں: "نہیں، عائشہ (میری والدہ کا نام) کا بیٹا وہابیہ نہیں ہو سکتا۔"

افسوس، خالہ بھی کئی سال قبل انتقال کر گئیں۔ ان کے چاروں بیٹے بھی ایک ایک کر کے راہیِ ملک عدم ہو چکے ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔

## 26

بیٹ کے بیشتر لوگوں کا رجحان مذہب کی طرف تھا۔ نمازوں کی ادائیگی میں ان میں سے کئی ایک بے شک جھاتی[1] مار جاتے ہوں گے لیکن روزے تقریباً سبھی رکھتے تھے۔ ہمارے خاندان کے تمام افراد، بچے بوڑے، بلا استثنا باقاعدگی سے روزہ رکھتے تھے، اس میں کسی رورعایت کی گنجائش نہیں تھی۔ بچپن ہی سے یہ عادت اتنی راسخ ہوئی کہ گرمیاں ہوں یا سردیاں، میں نے روزہ ہمیشہ رکھا۔

اس زمانے میں دیہاتوں میں گھگو نہیں بجتے تھے۔ سحری کے وقت روزہ داروں کو جگانے کے لیے نوجوان لڑکوں کی ٹولیاں نعتیں پڑھتے گاؤں کی گلی گلی میں پھرتی تھیں۔ میں بھی کبھی کبھی ان میں شامل ہو جاتا تھا۔ [شہروں میں یہ کام عموماً پیشہ ور ٹولیاں کرتی تھیں۔]

افطاری کے وقت گاؤں کے اکثر لوگ، جن میں بچے اور بوڑھے بھی شامل ہوتے تھے، مسجد میں جمع ہو جاتے تھے۔ تایا جان محمد جالندھر سے سحری اور افطاری کے اوقات کے مطبوعہ چارٹ لے آتے اور مسجد کے برآمدے میں لٹکا دیتے تھے۔ روزہ انھیں اوقات کے مطابق رکھا اور افطار کیا جاتا تھا۔ گاؤں والوں کو مطلع کرنے کے لیے نگارہ (نقارہ) بجایا جاتا تھا۔ ایک نوجوان کو، جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا، نقارہ بجانے کا بہت شوق تھا۔ وہ دوسروں سے بہت پہلے مسجد میں پہنچ جاتا، نقارے کی جھاڑ پونچھ کرتا اور اسے اپنے قریب رکھ لیتا تا کہ اس کا استحقاق کوئی دوسرا نہ چھین سکے۔ جب حافظ جان محمد گھڑی دیکھ کر اشارہ کرتے، یہ نوجوان پہلے اپنے منہ میں کھجور ڈالتا اور پھر پوری قوت سے نقارہ پیٹنے لگتا۔ کھجوریں اور کھانے پینے کی چھوٹی موٹی اشیا لوگ گھروں سے لے آتے تھے اور بعض اوقات خواتین مسجد میں تقسیم کرنے کے لیے بھیج دیتی تھیں۔

یوں تو رمضان کے دوران میں ہر روز کوئی نہ کوئی خصوصی چیز پکتی رہتی تھی لیکن ہماری اماں چودھویں

---

1- ناغہ کرنا۔

اور پندرھویں روزے کی درمیانی رات کو اس کا خاص طور پر اہتمام کرتی تھی۔ اس رات کو وہ دونجلی (تلفظ: دونِ جلی) کہا کرتی تھی۔ صوتی اعتبار سے بہت خوبصورت لفظ ہے مگر پاکستان میں یہ لفظ میں نے کبھی کسی کی بھی زبان سے نہیں سنا۔

عید کے اعلان کا کوئی مرکزی نظام نہیں تھا۔ ٹیلی ویژن (یہ اس زمانے کی پوری دنیا میں صرف لندن تک محدود تھا اور وہاں بھی یہ محض دس بارہ میل کے دائرے میں نظر آتا تھا) تو بہت دور کی بات ہے، ہمارے ہندوستان میں ریڈیو بھی ابھی پالنے میں تھا۔ لاہور سٹیشن تو قائم ہی 1937 میں ہوا تھا لیکن کیا ریڈیو سٹیشن تھا، کیسے کیسے پروگرام نشر کرتا تھا! (اس زمانے کے لاہور سٹیشن کے بارے میں نامور صحافی اور ادیب خالد حسن مرحوم نے "Those Lahore Radio Days" کے نام سے بہت خوبصورت مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون انٹرنیٹ پر پڑھا جا سکتا ہے۔) پھر یہ سٹیشن تھا بھی صرف دس کلوواٹ کا اور یوں اس کی پہنچ بھی سو سوا سو میل سے زیادہ نہیں تھی۔ چنانچہ کوئی رویت ہلال کمیٹی نہیں تھی جو آج کی طرح پورے ملک کو انتظار کی سولی پر لٹکائے رکھتی۔ ہر جگہ لوگوں کو ماہِ صیام اور شوال کا چاند دیکھنے کے لیے اپنی ہی آنکھوں کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ جہاں چاند نظر آ جاتا لوگ روزے رکھنا شروع کر دیتے یا عید منا لیتے۔ کوئی اختلاف، جھگڑا یا فساد نہیں ہوتا تھا۔ ہم لوگ عید کا چاند مسجد کی چھت پر چڑھ کر دیکھا کرتے تھے۔ اگر انتیسویں تاریخ کو نظر آ جاتا تو جو خوشی ہوتی، بیان سے باہر ہے۔ چونکہ لڑکپن کا زمانہ تھا، ہلال عید بھی "ہماری ہنسی" اڑاتے محسوس نہ ہوا۔

عید رات گھروں میں خوب چہل پہل ہوتی تھی۔ لڑکیاں اور لڑکے بھی اس رات ہاتھوں پر مہندی لگواتے تھے۔ مہندی بازار سے نہیں خریدی جاتی تھی۔ جن لوگوں کی اپنی زمینیں تھیں، وہ اپنے کھیتوں میں ایک دو مہندی کے بوٹے بھی اُگاتے تھے۔ مہندی ایک قسم کی سدابہار جھاڑی ہوتی ہے۔ گلاب کی طرح سردیوں میں بعض اوقات اس کی شاخوں کی بھی تراش خراش کر دی جاتی ہے اور موسم بہار میں اس کے پتے دوبارہ پھوٹ آتے ہیں۔ ان ہرے ہرے پتوں سے بھینی بھینی خوشبو آتی ہے۔ ان پتوں کو توڑ کر سکھا لیا جاتا اور خشک ہونے پر چکی میں پیس لیا جاتا تھا۔ چونکہ مہندی رات کو لگائی جاتی تھی، ہماری اماں ہمارے ہاتھوں پر کپڑے کی دھجیاں باندھ دیتی تھی تاکہ رات کو سوتے میں بستر خراب نہ ہو۔ کتنا شوق تھا ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کا اس زمانے میں!

ہمارے گاؤں میں عید کی نماز عیدگاہ میں پڑھی جاتی تھی۔ یہ عیدگاہ مڈل سکول سے ملحق تھی۔ اس میں ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس میں کبھی کبھار کوئی اکیلا دوکیلا شخص نماز پڑھ لیتا تھا۔ عید کی نماز اس کمرے سے باہر

کھلے میدان میں پڑھی جاتی تھی جو خاصا لمبا چوڑا تھا۔ نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے جمعۃ الوداع کی نماز کا اہتمام بھی یہیں کیا جاتا تھا۔ اس موقع پر خطبہ دینے کے لیے اکثر جالندھر سے خیر المدارس کے بانی اور مہتمم مولانا خیر محمد تایا جان محمد کی دعوت پر تشریف لایا کرتے تھے۔ جس سال ان کی آمد ہوتی، ہمارے گاؤں ہی میں نہیں، بلکہ ارد گرد کے دیہاتوں میں بھی بڑے بڑے پوسٹر چسپاں ہو جاتے اور یوں خلقت کا ایک اژدحام اکٹھا ہو جاتا مگر عید گاہ میں اتنی گنجائش تھی کہ سب اس میں سما جاتے۔

اب کی طرح اس زمانے میں بھی عید الفطر یا چھوٹی عید کا خاص کھانا سویاں ہوتی تھیں۔ سویاں بھی بازار سے نہیں خریدی جاتی تھیں اور نہ کسی دکان پر بکتی تھیں۔ انھیں گھروں میں ایک چھوٹی سی مشین میں بنایا جاتا تھا جسے چارپائی پر رکھ کر اس کے بازو کے ساتھ باندھ دیا جاتا تھا۔ اس کے دو خاصے فراخ منہ ہوتے تھے۔ مشین چلانے والی ایک منہ میں مسلسل گندھا ہوا آٹا دھکیلتی رہتی تھی اور دوسرے ہاتھ سے چرخی چلاتی رہتی تھی۔ دوسرے منہ سے، جس کے آگے چھاننی لگی ہوتی تھی، موٹی موٹی سویاں باہر نکلتی رہتی تھیں۔ جب یہ سویاں کافی لمبی ہو جاتی تھیں، عموماً کوئی دوسری عورت انھیں بڑی مہارت سے توڑ کر قریب دھوپ میں معلق رسی پر لٹکا دیتی تھی۔ خشک ہونے پر انھیں کڑاہی میں بھون لیا جاتا تھا۔

آج کل بازاروں میں جو برقی مشینوں پر بنی ہوئی سویاں ملتی ہیں، وہ خاص باریک ہوتی ہیں مگر اس زمانے کی گھروں میں بنائی ہوئی آج کل کے noodles اور spaghetti کی طرح خاصی موٹی ہوتی تھیں اور دودھ میں ڈال کر ان کے کھانے کا لطف ہی اور ہوتا تھا۔ بعض اوقات عام دنوں میں نمکین سویاں بھی پکا لی جاتی تھیں۔

## 27

ساتویں جماعت میں ہمیں دبلے پتلے، دراز قامت، خوش وضع، خوش اخلاق، خوش زبان اور خردآشنا منشی نعمت علی پڑھاتے تھے۔ جب وہ کلاس روم میں داخل ہوتے تھے، مطلق خاموشی چھا جاتی تھی، اس لیے نہیں کہ طلبا ان سے خوف کھاتے تھے بلکہ اس لیے کہ وہ صدق دل سے ان کا عزت و احترام کرتے تھے۔ جن اساتذہ سے میں صحیح معنوں میں متاثر ہوا، ان میں وہ بھی شامل تھے۔ وہ ہمیں حساب اور اردو پڑھاتے تھے۔ حساب کے نئے قاعدے اتنے آسان اور دل نشیں انداز سے سکھاتے تھے کہ فوراً ہی ذہن پر نقش ہو جاتے تھے اور جب اردو پڑھاتے، بالکل سماں باندھ دیتے تھے۔ منشی علی محمد اور منشی غلام حیدر کی

طرح وہ بھی وانے وال ہی کے رہنے والے تھے۔ منشی علی محمد تو گھر پر پڑھائی کرنے کے لیے خود چار چار طالب علموں کی ٹولیاں بنا دیتے تھے۔ منشی نعمت علی خود تو تشکیل نہیں دیتے تھے مگر ہماری حوصلہ افزائی ضرور کرتے تھے کہ دو دو چار چار مل کر ٹولیاں بنائیں اور اکٹھے بیٹھ کر پڑھا کریں۔ اس سے ایک دوسرے کو اپنی مشکلات بتائی اور سمجھی جا سکتی ہیں۔ جب انھیں معلوم ہوتا کہ دو کمزور طلبا ایک ساتھ بیٹھ کر پڑھائی کرتے ہیں: تو وہ اکثر از رو تفنن کہا کرتے تھے: "کھسرے نال کھسرا اٹھا، نہ کجھ وٹا نہ کجھ بٹا۔" اس وقت اس پنجابی کہاوت کی پوری معنویت تو ہمارے پلے نہیں پڑتی تھی مگر بعد میں جب بھی یاد آئی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی ہے۔

ساتویں جماعت کی اردو کی کتاب میں میر انیس کا ایک مرثیہ بھی شامل تھا۔ اس میں اہل بیت کی نیک بیبیوں کے دل فگار مصائب کا ذکر تھا۔ جب منشی نعمت علی اپنے خوبصورت انداز سے یہ مرثیہ پڑھ رہے تھے اور اس کے مفاہیم کی تشریح کر رہے تھے تو ایک لڑکے نے، جس کا نام غلام عباس تھا، بَیاں مار[1] کر رونا شروع کر دیا۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی اور وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ متاثر تو ہم بھی ہوئے تھے اور شاید آنکھیں بھی ڈبڈبا آئی ہوں گی مگر جو حال غلام عباس کا ہوا، اس نے ہم سب کو پریشان کر دیا۔ معلوم ہوا کہ غلام عباس کا تعلق اہل تشیع مسلک سے ہے۔ اس وقت تک اہل تشیع مسلک کے متعلق میرا علم نہ ہونے کے برابر تھا۔ ہمارے گاؤں سمیت ان دیہاتوں میں جہاں ہماری رشتے داریاں تھیں اور جہاں ہمارا آنا جانا رہتا تھا شاید ہی کوئی اہل تشیع خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔ میں کہہ نہیں سکتا، اگر ہوں گے بھی تو ان کی تعداد اتنی کم ہو گی کہ پتا بھی نہ ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں متعدد اہل تشیع احباب سے میرے دیرپا تعلقات اور عمر بھر کی دوستیاں استوار ہوئیں جن میں ناصر کاظمی، انتظار حسین، مظفر علی سید، شہرت بخاری، سجاد رضوی اور نصیر الحسنین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خیر بات غلام عباس کی ہو رہی تھی جو ہمارے مڈل سکول سے کوئی ایک میل دور اکبر پورے (اکبر پور) کا رہنے والا تھا۔ اس گاؤں میں بھی کُل کے صرف چند خاندان اہل تشیع خاندان تھے رہتے اور وہ بھی آپس میں قرابت دار بھی تھے۔ وہ ہر سال باقاعدگی سے یوم عاشورہ پر جلوس نکالتے اور ماتم کرتے تھے۔ چنانچہ ان کا تعزیہ بھی بہت چھوٹا سا ہوتا تھا، مگر آس پاس کے دیہات سے لوگوں کو بلانے کا انھوں نے انتظام کر رکھا ہوتا تھا۔ کچھ لوگ اپنے طور پر بھی چلے جاتے تھے۔ ہمارے گاؤں کے پانچ چھ آدمی ماتمی جلوس میں شامل ہونے کے لیے جاتے تھے جن کا تعلق اہل تشیع مسلک سے نہیں تھا۔ ایک سال میں بھی یہ جلوس دیکھنے چلا گیا تھا۔ لاہور میں بھی موچی

---

1۔ اونچی آواز میں زار و قطار رونا۔

دروازے سے نکلنے والے تعزیتی جلوس میں بہت سے لوگ شامل ہوتے ہیں جن کا اہلِ تشیع مسلک سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں ہوتا۔

محرم کے سلسلے میں ہمارے گاؤں میں کوئی تقریب تو منعقد نہیں ہوتی تھی مگر ہماری اماں موٹے اناج کا نمکین دلیا بنا کر پڑوسیوں اور غریب غربا میں لازماً تقسیم کیا کرتی تھیں۔ جانے یہ رسم کہیں اور بھی پائی جاتی تھی یا نہیں، یا یہ ان کی اپنی اختراع تھی۔ ہمارے ہاں عاشورہ کو دسواں یا دسویں کہا جاتا تھا۔ اب بھی بہت سے اہلِ سنت حضرات دسویں کی نیاز دیتے ہیں۔ اب محمد سلیم الرحمٰن کی زبانی معلوم ہوا کہ یوپی میں بھی اس قسم کا دلیا پکایا جاتا تھا۔

بکر عید (عیدالاضحیٰ) پر قربانی عموماً بکروں کی دی جاتی تھی۔ ان بکروں کے منہ کھول کر خاص طور پر دیکھا جاتا تھا کہ وہ دوندا ہو گیا ہے یا نہیں۔ بعض اوقات چوگے[1] کی قربانی بھی دے دی جاتی تھی۔ کچھ لوگ مل کر وچھی (ویہڑی) بھی ذبح کر لیتے تھے۔

## 28

بیٹ کے لوگ افزائشِ مویشیاں کا کام نہیں کرتے تھے۔ اتنی زمین ہی نہیں تھی کہ مویشیوں کے فارم بنائے جا سکتے۔ دودھ کے لیے بھینسیں ادھر ادھر سے مل جاتی تھیں یا کٹیاں (بھینسوں کی بچھیریا) پال پوس لی جاتی تھیں۔ گائے بہت کم لوگوں کے پاس ہوتی تھی، اس لیے جن لوگوں کو گوکا (گائے کا گھی) کی ضرورت پیش آتی تھی، انھیں عموماً سخت مشکل پیش آتی تھی۔ [چچا کے کان میں کسی نے ڈال دیا کہ اگر گوکا ڈال کر گاجر کا حلوہ تیار کیا جائے، تو کھانے سے جسم اور ذہن دونوں کو بڑی تقویت حاصل ہوتی ہے۔ بس گوکا کی تلاش شروع ہوگئی اور کئی دیہاتوں کی خاک چھاننے کے بعد کہیں ہاتھ آیا۔] ایک دو بکریاں ہر گھر میں پالی جاتی تھیں مگر بیل خریدنے کے لیے رہتک اور حصار کے اضلاع میں جانا پڑتا تھا۔ وہاں بیلوں کی افزائش کا کام بہت وسیع پیمانے پر ہوتا تھا اور ان کی فروخت کے لیے ہر سال عموماً موسمِ بہار میں رہتک، حصار، ہانسی، بھوانی اور متعدد دیگر مقامات پر منڈیاں لگتی تھیں۔ بیٹ کے لوگ بیل خریدنے کے لیے ان منڈیوں کا طواف کیا کرتے تھے۔ بعض لوگ ٹولیاں بنا کر پیدل ہی چل پڑتے تھے مگر بیشتر لوگ گروہوں کی صورت میں پہلے شاہ کوٹ۔ ملسیاں سٹیشن پہنچتے، گاڑی پکڑتے، فیروز پور پہنچتے اور وہاں سے کسی دوسری

1- چوگا: تقریباً چوگان کے چوگا جیسا ہے۔

ریل گاڑی میں بیٹھتے اور براستہ بٹھنڈا اپنی منزل مقصود پر پہنچتے۔ 1930 کی دہائی تک ابھی کاغذی نوٹوں کا رواج عام نہیں ہوا تھا، بس چاندی کا روپیہ چلتا تھا۔ ایک روپے کا وزن ایک تولے کے برابر ہوتا تھا اور اسی روپے ایک سیر کے مساوی ہو جاتے تھے۔ جو لوگ بیل خریدنے ہریانہ جاتے تھے، وہ اپنی ضرورت کے مطابق روپے اکٹھے کرتے، ایک خاص قسم کی تھیلی سلواتے، اس میں یہ روپے رکھتے اور اپنی کمر کے گرد باندھ لیتے۔ اگر پہلی منڈی میں ہی اپنی پسند کا بیل مل جاتا تو فبہا، ورنہ یکے بعد دیگرے دوسری منڈیوں کے چکر لگانا پڑتے تھے۔ اس بات کا خاص خیال رکھنا پڑتا تھا کہ بیل خاصا پلا ہوا ہو مگر مکلانہ ہو، چارو (خوب چارہ کھانے والا) ہو، مگر مر چڑا (ضدی)، کرکھنا (سینگ مارنے والا)، ماٹھا (سست رو) یا کم چور نہ ہو۔ ان باتوں کا اندازہ بیل کی شکل صورت سے ہی لگایا جاتا تھا۔ بعض اوقات یہ اندازہ غلط بھی ثابت ہو جاتا تھا اور اس سے جان چھڑانا خاصا مشکل ہو جاتا تھا۔ واپسی کا سفر عموماً خاصا مشقت طلب ہوتا تھا کیونکہ یہ پیدل طے کیا جاتا تھا۔

## 29

1930 ہی کی دہائی میں پنجابی کی ایک لوک صنف ماہیا کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔ ہوا یوں کہ گجرات کا ایک تانگہ بان، جس کا نام محمد علی اور عرف ماہیا تھا، کسی کھاتے پیتے گھرانے کی ایک خوبصورت دوشیزہ کو، جس کا نام یا عرف بالو تھا [یہ اس کا اصل نام تھا یا محض عرف، کبھی معلوم نہ ہو سکا]، سکول لاتا لے جاتا تھا۔ محمد علی خود بھی کڑیل گبھرو، خوش شکل اور خوش اندام گورا چٹا نوجوان تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں میں بقول فلمی گیت نگار مدھوک "کچھ یوں یوں ہو گئی"[1] اور وہ جی جان سے ایک دوسرے پر فریفتہ ہو گئے۔ مگر کہاں ایک کنگال، نادار، مفلس تانگے بان، جو محض لنگوٹی میں پھاگ کھیل سکتا تھا، اور کہاں ایک خوشحال گھرانے کی ایک نرم و نازک، گل حسین و جمیل دوشیزہ، جو شاید اپنی نظروں کے تیروں سے ہر کسی کو گھائل کر دیتی ہوگی، چنانچہ دونوں کی شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

جب انھیں ملاپ کی کوئی صورت نظر نہ آئی، انھوں نے چپکے سے نکاح کر لیا اور شہر سے فرار ہو گئے

1. قیام پاکستان سے پہلے مدھوک لاہور میں بننے والی فلموں کا خاصا معروف گیت نگار تھا۔ اس زمانے میں اس کے ایک گیت کا یہ شعر بہت مشہور ہوا تھا: ایک تھی لیلیٰ، ایک تھا مجنوں۔ دونوں میں کچھ ہو گئی یوں یوں۔ (کالجوں کے لڑکے اسے طنزیہ گاتے پھرتے تھے۔)

مگر پکڑے گئے۔ محمد علی اسیر زندان ہو گیا مگر تنویر بخاری کے بقول "بالو عشق دے معاملے وچ بے دھڑک سی، اوہ اپنے عاشق نال جیل وچ مل دی تاں بڑی بی داری سے سوال جواب کر دی۔" افضل پرویز کے مطابق "دو ویں چاہون والے جدوں کچہری وچ آتے سوالات وچ ماہیا دی ذہن تے سوال جواب کر دے تاں سارے پنجاب وچ ایس گانے اتے سر دھنیا جاندا......"

ماہیا پنجاب کا کافی پرانا لوک گیت ہے۔ اس کا اصل ماخذ "ماہی" بتایا جاتا ہے جس کے معنی "بھینس یا بھینس چارنے والا یعنی بھینسیں چرانے والا" کیے جاتے ہیں۔ وسیع تر معنوں میں اس میں دیگر ڈھور ڈنگر بھی شامل کیے جا سکتے ہیں:

الف آ ماہی، کیوں چہ لائی، گھر آ نہ شاں نلیاں نیں
وچھڑ گیوں جھولی امڑی والی، پردیس دی واٹاں ملیاں نیں
محمد بوٹا گجراتی (1851 تا 1930)

اور یہ بھینس رانجھا نے ہیر اور گجرات کے عزت بیگ نے، جس نے مہینوال کا لقب پایا تھا، سوہنی کے باپ کی چرائی تھیں اور یوں ماہی حقیقی اور مجازی دونوں مفاہیم میں محبوب کے لیے استعمال ہونے لگا اور اکثر شعرا نے اسے دونوں طرح باندھا ہے۔ ان دونوں معنوں میں یہ زبان زد خاص و عام مصرع مادھو لال شاہ حسین (1539 تا 1599) بہت پہلے کہہ چکے تھے [ویسے اسے بعض دیگر شعرا سے بھی منسوب کیا جاتا ہے]:

ماہی ماہی کوک دی میں آپے رانجھن ہوئی

یہ صنف خواہ کتنی ہی پرانی کیوں نہ ہو، اصل بات یہی ہے کہ اسے فروغ ماہیا اور بالو کے عشق کے بعد حاصل ہوا تھا اور اس کی صدا پورے پنجاب میں گھر گھر سنائی دیتی تھی۔ گھریلو عورتیں اور مرد مختلف تقریبات میں اسے خود بھی فی البدیہہ گھڑتے اور گاتے تھے۔ ہمارا علاقہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا لیکن ماہیا صرف شادی بیاہ اور دیگر خوشی کی تقریبات میں ہی گایا نہیں جاتا تھا، ڈھور ڈنگر چراتے، فصلیں کاٹتے، چرخہ کاتتے، اکیلے بیٹھے، اداسی و غمگینی میں گھرے وقت اس کے بول خود بخود زبان پر رواں ہو جاتے تھے۔

ایک زمانے میں پنجاب کے لوک گیت چند ورقی کتابچوں کی صورت میں میلوں ٹھیلوں اور بعض دوسری تقریبات میں عام بکا کرتے تھے۔ جب ماہیا کا چلن عام ہونے لگا، اس کے کتابچے بھی دستیاب ہونے لگے۔ پھر فلموں والے اور ریکارڈ (توے) تیار کرنے والی کمپنیاں بھی میدان میں کود پڑیں اور موسیقی کی

دیگر اصناف کی طرح ماہیا کے گیتوں کے ریکارڈ بھرے جانے اور عام بکنے لگے۔

نفیس خلیلی تھے تو یو پی کے مگر اوائل عمری میں امرتسر میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ معروف فکشن نگار اکرام اللہ نے مجھے بتایا ہے کہ "وہ دھان پان سے آدمی تھے، سفید شلوار، سفید کرتہ اور سفید شیروانی پہنتے تھے۔ پان بہت کھاتے تھے اور ہر جگہ تھوکتے پھرتے تھے۔" وہ اوسط سے بھی کم درجے کے شاعر تھے مگر انھوں نے ایک تھیٹر کمپنی بنا رکھی تھی۔ وہ عام قسم کے ڈرامے تیار کرتے اور اس زمانے کے رواج کے مطابق جگہ جگہ گھوم پھر کر انھیں تنبوؤں میں دکھاتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد امرتسر کے اکثر لوگوں کی طرح وہ بھی لاہور آ گئے اور جو کام انھیں آتا تھا، اسے کرنے لگے۔ 1948 کے اوائل میں جب میں اسلامیہ کالج لاہور کا طالب علم تھا، ایک روز شہر کے در و دیوار ایک خاصے بڑے اشتہار سے بج گئے۔ یہ اشتہار نفیس خلیلی کی کمپنی کا تھا اور اس میں کسی ڈرامے کے انعقاد کی نوید دی گئی تھی۔ ڈرامے کے اداکاروں میں ایک نام "صبیحہ ایم اے" تھا۔ نام پڑھ کر ہم چونکے، واہ، اب ڈراموں میں ایم اے پاس لڑکیاں بھی کام کرنے لگی ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ موصوفہ ایم اے وی ایم اے نہیں تھی۔ اصل میں نام کا لاحقہ "ایم اے" محمد علی کی تخلیص تھا، وہی محمد علی جس نے ماہیا کی حیثیت سے صوبہ گیر شہرت حاصل کی تھی۔ صبیحہ اسی محمد علی اور اس کی شریک حیات بالو کی دختر تھی۔ بعد میں صبیحہ نے پاکستان کی فلموں میں مقبول اداکارہ کے طور پر بڑا نام کمایا۔

## 30

یکم ستمبر 1939 کو ہٹلر کی فوجوں نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ برطانیہ کے ہر قیمت پر امن کے دلدادہ (pacifist) وزیر اعظم نیول چیمبرلین کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور تین ستمبر کو اس نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ جنگ عظیم دوم شروع ہو گئی اور اس نے ساری دنیا زیر و زبر کر دی۔

اس جنگ کے بیج دراصل اس معاہدے میں بو دیے گئے تھے جسے عام طور پر معاہدہ ورسائی کہا جاتا ہے۔ جب دو فریقین کے مابین کوئی معاہدہ ہوتا ہے، وہ آپس میں مذاکرات کرتے ہیں اور جب کسی نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں تو معاہدے کا متن تیار کیا جاتا ہے اور اس پر دستخط کیے جاتے ہیں مگر یہ عجیب معاہدہ تھا جسے جرمنی کے نمائندوں کی شمولیت کے بغیر اس کے مخالفین نے جنگ عظیم اول کے اختتام پر پیرس کے قریب ورسائی (versailles) کے قدیم شاہی محل میں تیار کرنے میں کئی مہینے صرف کر دیے اور جب اپنی تسلی کے

مطابق اسے تیار کر لیا تو جرمنی کو حکم دیا گیا کہ وہ اس پر 48 گھنٹوں کے اندر اندر دستخط کر دے ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے دوبارہ جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ جرمنی میں اتنی سکت نہیں رہ گئی تھی کہ وہ دوبارہ جنگ کا خطرہ مول سکتا۔ چنانچہ اس کے لیے اتحادیوں کے ٹھونسے ہوئے معاہدے کو قبول کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ تاہم جرمنوں نے اسے کبھی دل سے قبول نہ کیا۔ وہ ہمیشہ اسے dictat (نادر شاہی حکم) کہتے رہے۔

اس معاہدے کی رو سے جرمنی کے متعدد علاقے فرانس، بلجیم، ڈنمارک، چیکوسلواکیا اور پولینڈ کے حوالے کر دیے گئے، کچھ علاقے نئی قائم شدہ بین الاقوامی تنظیم جمعیت اقوام (League of Nations) کی تحویل میں دے دیا گیا۔ [اس تنظیم کے متعلق اقبال نے کہا تھا: بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند[1]۔] بعد میں اس کے حصے بخرے کر کے بیشتر علاقہ تو روس کو دے دیا گیا اور باقی نئے قائم شدہ ممالک اسٹونیا، لتھوانیا، اور لٹوانیا میں بانٹ دیا گیا۔

افریقہ میں جرمن مقبوضات کی بھی بندر بانٹ ہوئی۔ کچھ علاقے فرانس اور بلجیم کے حصے میں آئے مگر سب سے زیادہ فائدہ انگریزوں کو حاصل ہوا جس کی وجہ سے ان کی سلطنت مصر سے جنوبی افریقہ تک بلا انقطاع پھیل گئی۔

جنگ عظیم اول میں ترکوں نے جرمنوں کا ساتھ دیا تھا اور اس کا نتیجہ انھیں بھی بھگتنا پڑا۔ وہ نہ صرف مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقی ممالک پر مشتمل اپنی سلطنت سے محروم ہو گئے بلکہ خود ترکی کی بقا کے بھی لالے پڑ گئے۔ اگر مصطفیٰ کمال خم ٹھونک کر میدان میں نہ اترتے تو کم از کم ملک کا یورپی حصہ بشمول استنبول لازماً یونانیوں کے قبضے میں چلا جاتا۔

اس زمانے میں ایک اور بڑی سلطنت (empire) ہوا کرتی تھی، اس کا نام آسٹرو ہنگرین (Austro Hungarian) ایمپائر تھا، اس کا تو نام و نشان تک مٹ گیا۔

معاہدے کی دیگر شرائط کے تحت جرمنی پر ایک لاکھ سے زیادہ فوج رکھنے پر پابندی لگا دی گئی، لازمی بھرتی اور لڑاکا اور بم بار طیاروں، ٹینکوں، بکتر بند گاڑیوں، بڑی مشین گنوں/ توپوں (Maxim machine guns) اور بعض اقسام کی رائفلوں کی تیاری ممنوع قرار دے دی گئی۔ جرمنی پر بھاری اور ناقابل برداشت تاوان نافذ کر دیا گیا۔ ابتداء میں یہ رقم تقریباً سوا دو کھرب مارک بنتی تھی۔ جو 1921 میں گھٹا کر ایک کھرب بتیس ارب مارک یا اس زمانے کے حساب کے مطابق اکتیس ارب چالیس کروڑ ڈالر/ چھ ارب ساٹھ کروڑ پاؤنڈ

---

1۔ علامہ اقبال کی یہ نظم "پیام مشرق" میں شامل ہے۔ پوری نظم یہ ہے: برفتد تا روش رزم درین بزم کہن درمندان جہاں طرح نو انداختہ اند من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند۔

(2012 کے حساب سے تقریباً چار کھرب بیس ارب ڈالر/ دو کھرب چوراسی ارب پاؤنڈ) بنتی تھی۔ یہ رقم کاغذی نوٹوں میں نہیں بلکہ سونے کے سکوں اور مختلف اشیاء کی، جن میں کوئلہ، خام لوہا، زرعی اجناس وغیرہ شامل تھیں، کی شکل میں وصول کی جانا تھی۔ اس لوٹ مار میں بعض اشیاء کے ٹریڈ مارکوں (trademarks) پر بھی ہاتھ صاف کر لیا گیا۔ اسپرین بنانے میں جرمن فرم بائر (Bayer) کو اجارہ داری حاصل تھی لیکن اب فرانس، برطانیہ، امریکا اور روس کو اسے بنانے کی کھلی چھٹی مل گئی۔

لیکن معاہدے کی اہم ترین اور انتہائی اختلافی شق کے تحت جنگ کا سارا الزام جرمنی پر ڈال دیا گیا۔ یہ انتہائی کڑوی گولی تھی جسے جرمنوں کو نگلنے پر تو مجبور کر دیا گیا مگر وہ اسے کبھی ہضم نہ کر سکے۔ اس معاہدے کا ایک بھیانک نتیجہ یہ نکلا کہ جرمنی میں افراطِ زر (inflation) برق رفتاری سے بڑھنے لگا اور ایک وقت تو ایسا بھی آ گیا کہ ایک ڈالر تقریباً ایک کھرب (one trillion) مارک کے برابر ہو گیا۔ Ken Follett کے مطابق لوگ گھر سے نوٹوں کا سوٹ کیس بھر کر نکلتے تھے اور ہاتھ کیا آتا تھا؟ ایک ڈبل روٹی جس کی قیمت ایک کھرب ستائیس ارب مارک تک پہنچ گئی تھی۔

اس انتہائی سخت اور توہین آمیز معاہدے کو بعض برطانوی اور امریکی مفکرین نے بھی تنقید کا نشانہ بنایا جن میں اپنے زمانے کے نامور ماہر معاشیات جے ایم کینز (Keynes) بھی شامل تھے۔ رہے جرمن، انھوں نے اسے کبھی دل سے قبول نہ کیا۔ اس معاہدے سے پیدا ہونے والی صورت حال سے بعد میں ہٹلر نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ وہ صرف اقتدار کی منزل تک ہی نہ پہنچا بلکہ جرمنی کا بلاشرکت غیرے حکمران بھی بن گیا۔

ہٹلر پیدا تو آسٹریا میں ہوا تھا مگر وہ ابھی تین سال کا ہی تھا کہ اس کے والدین ترک وطن کر کے جرمنی میں آباد ہو گئے۔ ہٹلر اپنے آپ کو آریائی (Aryan) کہتا تھا اور آریوں کو انسانوں کی بہترین نسل قرار دیتا تھا، تاہم بیس نومبر 2008 کو بلجیم کے ایک اخبار کے پھرتیلے نمائندوں نے آسٹریا میں آباد اس کے رشتے داروں کے لعاب کے 39 نمونے اکٹھے کیے۔ ان کا ڈی این اے (DNA) ٹیسٹ کرایا گیا تو ان میں ایک کروموسوم (Chromosome) بنام haplogroup E, b, b, پایا گیا جس کی مثالیں یورپی گوروں میں نہ ہونے کے برابر ہیں مگر یہ شمالی افریقہ کے بربروں اور AshKenazi Sephardic (جرمنی یہودی) میں عام پایا جاتا ہے۔ ایران کے ایک سابق صدر محمود احمدی نژاد کے متعلق بھی کچھ اسی قسم کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور ستم ظریفی دیکھیں کہ ہٹلر اور احمدی نژاد دونوں ہی یہودیوں کے کٹر دشمن ہیں۔

ہٹلر کے ایک معاون (aide) ہرمن راؤشننگ (Herman Rauchning) نے، جو منحرف ہو کر امریکا چلا گیا تھا، اپنی کتاب "Hitler speaks" میں دعویٰ کیا ہے کہ جب ہٹلر سیاسی جلسوں میں تقریریں

کرتا تھا، کچھ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ trance[1] میں چلا گیا ہو۔ وہ کہتا ہے کہ ہٹلر روحوں کے قبضے میں تھا اور ان کا معمول تھا۔ معمول عام طور پر بہت معمولی اور بے حیثیت لوگ ہوتے ہیں۔ اچانک انھیں ایسی صلاحیتوں سے نواز دیا جاتا ہے جو مافوق الفطرت معلوم ہوتی ہیں اور جو انھیں وقتی طور پر عام لوگوں سے set apart (ممتاز/الگ) کر دیتی ہیں۔ جب یہ کیفیت گزر جاتی ہے، وہ ایک بار پھر وہی نرے گھسیارے بن جاتے ہیں۔

راؤشن نگ مزید کہتا ہے کہ اس میں مطلق شک نہیں کہ ہٹلر ان لمحات میں اپنے سے ماورا طاقتوں کے قبضے میں ہوتا تھا، تقریباً شیطانی طاقتیں جن کا ایک فرد کی حیثیت سے وہ محض عارضی معمول تھا۔ اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر ان طاقتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ destructive and dark violence[2] کا دلدادہ ہو گیا تھا۔

اس کتاب کی صحت (authenticity) پر بعض لوگوں نے شکوک کا اظہار کیا ہے مگر اس کے انگریزی ترجمے کے دیباچہ نویس ممتاز مورخ Hugh Trevor-Roper نے اسے مستند اور معتبر (authentic) قرار دیا ہے۔

ہٹلر 20 اپریل 1889 کو جرمن سرحد کے قریب آسٹریا کے چھوٹے سے قصبے براؤنو (Braunau) میں ایک غریب کسان کے ہاں پیدا ہوا تھا۔ اس نے مصور بننے کے ارادے سے 1916 میں سکول چھوڑ دیا مگر جب ویانا کی اکیڈمی آف فائن آرٹس نے اسے داخلہ دینے سے انکار کر دیا، وہ تھرڈ کلاس تصویریں بناتا اور ان کی فروخت سے چند پیسے کماتا رہا۔ جنگ عظیم اول میں وہ ایک عام سپاہی کی حیثیت سے جرمن فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اگرچہ اس نے اپنے آپ کو قابل اور دلیر فوجی ثابت کیا اور اسے ایک تمغہ بھی ملا مگر وہ Lance Corporal (دفعدار) سے بھی اوپر نہ اٹھ سکا۔ جب جنگ کے اختتام پر اتحادیوں نے جرمنی پر ذلت آمیز معاہدہ ٹھونس دیا، تو فوج کے اندر ایک طاقت ور گروہ نے Reichswehr (نیشنل ڈیفنس) کے نام سے ایک تنظیم بنائی۔ آہستہ آہستہ اس تنظیم نے پر پرزے نکالنا شروع کر دیے۔ اس نے جمہوری حکومت

---

1- اس کا اردو میں ترجمہ سمات کیا جاتا ہے۔ صوفیوں کے عقیدے میں یہ وہ حالت ہوتی ہے جس میں روح جسم سے جدا ہو کر عالم ملکوت کی سیر کرتی ہے اور روحانی حقائق منکشف ہوتے ہیں۔

2- تباہ کن اور ظلماتی تشدد۔ اس قسم کے تشدد میں بندوق کو روحانی رنگ دے دیا جاتا ہے اور قاتل اپنے تئیں دنیا کو سدھارنے کے لیے لوگوں کا بلا تفریق بے دریغ قتل شروع کر دیتا ہے۔ امریکا میں اس قسم کے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ 2011 میں ناروے کے ایک شخص نے ہوش و حواس کھو کر حکمران جماعت کے جلسے میں گولیاں چلا کر 77 آدمیوں کو قتل اور بے شمار کو زخمی کر دیا تھا۔ ہمارے طالبان بھی یہی کام کرتے ہیں۔

کو جائز سرکار ماننے سے انکار کر دیا اور ''مملکت کے اندر مملکت'' قائم کر لی۔ اس تنظیم نے 1919 کی گرمیوں میں ہٹلر کو ''تعلیمی'' فرائض سرانجام دینے پر مامور کیا جس کا بڑا مقصد سیاسی جماعتوں کی جاسوسی کرنا تھا۔ اسے عینیت پسندوں (idealists) کے ایک چھوٹے سے گروہ کا، جس کا نام جرمن ورکرز پارٹی تھا اور جس کے ارکان کی کل تعداد بمشکل چالیس بنتی تھی اور چھوڑ کا پتا لگانے پر مامور کیا گیا۔ ہٹلر اس پارٹی میں گھس گیا اور کچھ ایسا جادو چلایا کہ سب ارکان اس کے غلام بے دام بن گئے۔ اس نے اس کا نام تبدیل کرا کر Nationalsozialistische Dentshe Arbeiterpartei یا مختصراً NSDAP رکھ دیا۔ انگریزی اور اردو میں اسی کے اختصار کو نازی (Nazi)[1] پارٹی کہا جاتا ہے اور جولائی 1921 میں وہ خود بھی پارٹی کا صدر بن گیا۔

ہٹلر کے دل میں یہودیوں، مارکسسٹوں، روشن خیال لوگوں اور جرمنی کے شاہی خاندان کے خلاف نفرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ عظیم جرمنی کے خواب دیکھتا رہتا تھا۔ سیاسی پارٹی میں شمولیت کرنے کے بعد اس نے سستے ہوٹلوں میں تقاریر کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بہت جلد اسے احساس ہو گیا کہ وہ بہت ڈرامائی انداز سے لفاظی اور رنگین بیانی سے بھرپور تیکھے دار تقریریں کر سکتا اور اپنے سامعین کو مسحور کر سکتا ہے۔ بہت جلد اس کی پارٹی کو مقبولیت حاصل ہونا اور اس کے ارکان کی تعداد تیزی سے بڑھنا شروع ہو گئی۔ اس نے اپنے جلسوں (rallies)[2] میں نظم و نسق برقرار رکھنے اور حریفوں کے جلسوں کو اکھاڑنے کے لیے مسلح دستے بھی منظم کیے۔

ہٹلر کی تقریروں کا ہدف معاہدۂ ورسائی، مارکسسٹ اور یہودی ہوتے تھے۔ وہ جرمنی کے تمام داخلی مصائب کا ذمے دار یہودیوں کو ٹھہراتا تھا۔ آریائی نسل کو سب سے برتر اور باقی تمام کو فروتر قرار دیتا تھا۔ 1924 میں اسے بغاوت کے الزام میں پانچ سال قید کی سزا ہو گئی لیکن نو ماہ بعد ہی رہا کر دیا گیا۔ اس قید کے دوران میں اس نے اپنے وفادار پیروکار روڈلف ہیس (Rudolf Hess) کو اپنی مشہور ترین کتاب Mein Kamph (میری جدوجہد) لکھوائی۔ یہ بعد میں نازی پارٹی کی بائبل بن گئی۔ [اس کتاب کا اردو ترجمہ قیام پاکستان سے پہلے ایک صحافی ابراہیم چشتی نے ''تزک ہٹلر'' کے نام کیا تھا۔]

جیل نے اسے shrewd political tactician [زیرک اور پرکار انداز سے سیاسی چالیں چلنے والا، بالکل آصف زرداری کی طرح] بنا دیا۔ اسے یہ سبق ملا کہ جرمنی میں اقتدار محض ہتھیاروں کے بل بوتے

1- چونکہ جرمن زبان میں z کا تلفظ ts ہے، چنانچہ تقسیم ہند سے قبل متعدد اخبار نویس اور مصنفین اسے ناتسی پارٹی لکھتے تھے اور بالکل صحیح لکھتے تھے۔

2- اردو والے rally کو جلوس کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔

پر نہیں مل سکتا بلکہ اس کے لیے اسے قانونی ذرائع سے ملک کے آئین کو سبوتاژ کرنا ہوگا۔ اس نے پارٹی کی تنظیم نو کی اور اس میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اگرچہ 1928 کے الیکشن میں اس کی پارٹی صرف بارہ نشستیں جیت سکی مگر 1930 کی عظیم عالمی کساد بازاری[1] (great depression) سے، جس نے جرمنی کا بالکل ہی بھرکس نکال دیا تھا، جو لوگ شدید متاثر ہوئے تھے، وہ انہیں جیتنے میں کامیاب ہو گیا۔ کسان، کاریگر، دستکار، تاجر، چھوٹے دکاندار، سابق فوجی اور سول افسر، طالب علم اور سماجی حیثیت سے محروم ہونے والے (declasse) دانش ور جوق در جوق اس پارٹی میں شامل ہونے یا کھلم کھلا اس کی حمایت کرنے لگے۔ یہی نہیں وہ بڑے بڑے صنعت کاروں، قوم پسند قدامت پسندوں اور فوجی حلقوں کا بھی چہیتا بن گیا۔ سب سے بڑھ کر اخبارات کے سب سے بڑے مالک البرٹ Hugenberg کے اخباروں کے پراپیگنڈے نے اسے سارے جرمنی میں معروف کر دیا۔

1930 کے انتخابات میں اس کی پارٹی نے بہت بڑی جست لگائی اور 107 نشستیں (18.3% ووٹ) حاصل کر لیے۔ فروری 1932 میں اس نے باقاعدہ جرمن شہریت حاصل کر لی اور صدارتی انتخاب میں کھڑا ہو گیا۔ وہ خود تو انتخاب ہار گیا مگر اس کی پارٹی 230 نشستیں (37.3 فیصد ووٹ) ووٹ لے کر سب سے بڑی جماعت بن کر ابھری۔ چونکہ کوئی پارٹی حکومت نہیں بنا سکی تھی اس لیے نومبر 1932 میں دوبارہ انتخابات منعقد کرنا پڑے۔ اگرچہ نازی پارٹی کی نشستیں کم ہو کر 196 رہ گئی تھیں مگر بعض قدامت پسند سیاسی رہنماؤں نے صدر ہنڈن برگ کو مجبور کر دیا کہ وہ "کارپورل" ہٹلر کو چانسلر (وزیر اعظم) مقرر کر دیں اور یوں اس نے 30 جنوری 1933 کو اپنے عہدے کا حلف اٹھا لیا۔

ایک مرتبہ ہٹلر اقتدار کی کاٹھی پر سوار ہو گیا، اس نے ایک ایک کر کے اپنے حریفوں کو چاروں شانے چت گرانا شروع کر دیا۔ جولائی 1933 تک اس نے قدامت پسندوں کو عملاً حکومت سے بے دخل کر دیا۔ آزاد مزدور انجمنوں پر پابندی لگا دی اور کمیونسٹوں، سوشل ڈیموکریٹوں اور یہودیوں کا سیاست سے پتا کاٹ دیا۔ دریں اثنا جرمن پارلیمنٹ کی عمارت میں آگ لگ گئی اور یوں اسے جرمن پارلیمنٹ (reichstag) سے قوانین منظور کرا کر ملک میں ایک جماعتی آمریت قائم کرنے کا کامل (perfect) بہانہ مل گیا۔ جب مخالفت بڑھی، اس نے 5 مارچ 1933 کو آخری "جمہوری" انتخابات کرا دیے مگر جائز و ناجائز حربوں اور

---

1۔ اس عظیم کساد بازاری کا آغاز 29 اکتوبر 1929 کو وال سٹریٹ ایکسچینج پر اچانک حصص کی قیمتیں، جو پچھلے پانچ چھ سالوں میں بڑھ کر پانچ گنا ہو چکی تھیں، گرنے سے ہوا۔ راتوں رات بے شمار بڑے بڑے سرمایہ دار بالکل کنگال ہو گئے۔ اس کے جھٹکے اگلے سال تک پوری طرح محسوس ہوتے رہے۔ دوسری باتوں کے علاوہ ہندوستان میں سرکاری ملازمین کی تنخواہیں کم کرنا پڑی تھیں۔

جتھکنڈوں نے نازی پارٹی کو مطلق اکثریت دلا دی۔ 1934 میں صدر ہنڈن برگ کے انتقال پر اس نے صدارت اور وزارت عظمٰی کے عہدوں کو یکجا کر دیا اور یوں جرمنی کا مطلق العنان حکمران بن گیا۔

یہ ہٹلر کی شخصیت اور پالیسیوں کا کمال تھا یا جرمن قوم کی تخت جانی، سخت کوشی اور شبانہ روز محنت کا نتیجہ، کچھ بھی ہو کہ اس قوم کا، جس کے اکثر افراد دو وقت کی روٹی کو ترستے تھے، اگلے چند سالوں میں دوبارہ احیا ہوا اور وہ ایک عظیم طاقت بن کر ابھری۔

اپنے اقتدار کے ابتدائی چار برسوں میں ہٹلر کو داخلی اور خارجی دونوں محاذوں پر کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ اس نے نہ صرف اپنے ملکی مخالفین کی تحیں بلا دی بلکہ غیر ملکی سیاسی حریفوں کے بھی چھکے چھڑا دیے۔ 1935 میں اس نے اتحادیوں کو ٹھینگا دکھاتے ہوے معاہدہ ورسائی سے دست برداری اختیار کر لی اور ان کی طے کردہ تعداد سے پانچ گنا فوج بھرتی کر لی۔ جرمنی میں اسلحہ ساز فیکٹریاں شبانہ روز کام کرنے لگیں جس کے نتیجے میں بیکاری کی شرح صفر ہو گئی۔ ملک میں خوشحالی نے قدم رکھ دیے تھے اور لوگ مطمئن ہو چلے تھے۔ جرمن اشیا کی اپنی پائیداری کی وجہ سے دنیا میں تب بھی بڑی مانگ رہتی تھی اور اب بھی رہتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ہٹلر کو غیر ملکوں میں بھی پذیرائی ملنے لگی۔

1930 کی دہائی میں ہسپانیہ میں جمہوریت کے دلدادگان اور جنرل فرانکو کے دستوں کے مابین خانہ جنگی چھڑ گئی۔ ہٹلر نے جنرل فرانکو کو فوجی مدد مہیا کر کے وہاں 1939 میں فسطائیوں (fascists) کی حکومت کی راہ ہموار کر دی۔

1936 میں ہٹلر کا اطالیہ کے فاشی آمر مسولینی کے ساتھ سمجھوتا ہوا۔ 1938 میں ایک معاہدے کے تحت آسٹریا کو جرمنی میں ضم کر لیا گیا اور اسی سال اس نے وہ علاقے، جو معاہدۂ ورسائی کے تحت چیکوسلوکیا کو بخشے گئے تھے، دوبارہ چھین لیے اور ہٹلر اپنی مقبولیت کی معراج پر پہنچ گیا۔ اتحادی ناچتے رہ گئے، وہ کچھ بھی نہ کر سکے بلکہ ایک معاہدے کی رو سے برطانیہ، فرانس اور اطالیہ کو اسے جرمن علاقہ تسلیم کرنا پڑا۔

نہ جانے ہٹلر کی شخصیت میں کیا سحر تھا کہ اقتدار سے پہلے بھی اور اقتدار کے بعد بھی بڑی بڑی خوبصورت اور عالی نسب خاندانوں کی نوجوان خواتین اور دوشیزائیں بھی اس کی جانب جوق در جوق کھنچی چلی آتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے چھ اس کی lovers تھیں (یعنی ان کے ساتھ اس کے جسمانی تعلقات تھے)۔ ان میں سے دو نے خودکشی کر لی تھی اور مزید دو نے کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایوا براؤن (Eva Braun) کے ساتھ اس کی ملاقات 1929 میں ہوئی اور صرف وہی مستقلاً اس کے ساتھ جڑی اور زندگی گزارتی رہی۔ دونوں نے 29 اپریل 1945 کو خودکشی کرنے سے ایک دن پہلے شادی کر لی تھی۔

جو عورتیں اس کے سحر میں گرفتار ہوئیں، ان میں دو بہنیں بھی تھیں جن کا ایک انگریز اشرافی خاندان سے تعلق تھا۔ ان کے نام ڈیانا مٹفرڈ (Diana Mitford) اور یونٹی مٹفرڈ (Unity Mitford) تھے۔ ان کا ایک بھائی اور چار دیگر بہنیں تھیں۔ باپ کا نام ڈیوڈ فری مین مٹفرڈ تھا اور وہ سیکنڈ بیرن ریڈز ڈیل (Redesdale) تھا۔ چھیوں بہنوں کو مشترکہ طور پر Mitford Sisters (مٹفرڈ بہنیں) کہا جاتا ہے۔ وہ ایک سے بڑھ کر ایک حسین ہی نہیں تھیں بلکہ بے انتہا ذہین بھی تھیں۔ انھوں نے تعلیم درسگاہوں میں نہیں بلکہ گھر پر ٹیوٹروں سے پائی تھی مگر ان کا اکلوتا بھائی ٹامس مٹفرڈ، جو ان کی رہائش گاہ کے قریب ہی آکسفرڈ یونیورسٹی کا طالب علم تھا، چھٹی کے روز اپنے تیز طرار اور زیرک و فہیم دوستوں کو لے آتا تھا جن کے ساتھ مختلف موضوعات پر ان کی تند و تیز بحثیں ہوتی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اوائل عمری میں اپنے اپنے خیالات اور عقائد میں پختہ ہو گئی تھیں۔ وہ کیا تھیں، اس کا خلاصہ لندن کے سنڈے ٹائمز کے کالم نویس بین میکنٹائر (Ben Macintyre) نے بدیں الفاظ کھینچا ہے۔

"Diana the Fascist; Jessica the Communist, Unity the Hitler-lover; Nancy the Novelist; Deborah the Duchess and Pamela the Unobtrusive poultry Connoisseur."

ان سب کی مختلف عرفیتیں تھیں اور ایک اپنی نجی زبان، جسے وہ ایک دوسرے کے نام خطوط میں فراوانی سے استعمال کرتی تھیں۔ ان کے معاشقوں اور ایک دوسرے سے متضاد موقفوں کی وجہ سے ان کے سیکنڈل پر سیکنڈل بنتے چلے گئے جن کی گونج آج بھی سنائی دیتی رہتی ہے۔

ان میں سے جو دو بہنیں ہٹلر کی شیدائی تھیں۔ ان میں ڈیانا نے شادی برطانیہ کے اس زمانے کے فاشسٹ رہنما موزلی سے کی تھی۔ یہ شادی جرمنی میں ہوئی تھی اور خود ہٹلر بھی اس میں شریک ہوا تھا۔ یونٹی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے کسی نہ کسی طرح ہٹلر کے ساتھ جسمانی تعلقات استوار کر لیے تھے۔ وہ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی مگر ہٹلر راضی نہ ہوا۔ اس پر اس نے اپنی کنپٹی پر پستول رکھ کر گولی چلا دی جس کے نتیجے میں اس کا بھیجا متاثر ہوا اور وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ وہ دوبارہ کبھی ہوش میں نہ آئی۔ دریں اثنا جنگ عظیم دوم شروع ہو چکی تھی۔ ہٹلر نے ایک سپیشل ٹرین کے ذریعے اسے غیر جانبدار ملک سوئٹزرلینڈ کے صدر مقام برن (Bern) پہنچانے کا اہتمام کیا۔ اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم چرچل کی کوششوں سے اسے انگلستان پہنچایا گیا اور "ڈیلی میل" کے دعوے کے مطابق اس نے بے ہوشی ہی کے عالم میں ہٹلر کے بیٹے کو جنم دیا تھا جو اب ستر سال سے اوپر کا ہو چکا ہوگا۔

# 31

جنگ عظیم دوم شروع تو یورپ میں ہوئی تھی مگر بہت جلد اس کے اثرات پوری دنیا میں نمودار ہونے لگے۔

پنجاب کے بڑے شہروں میں گندم اور چینی راشن کارڈوں پر ملنے لگی۔
دیہاتوں میں گندم تو آسانی سے مل جاتی تھی مگر سفید (ولایتی) چینی یوں غائب ہوگئی جیسے اس کا کبھی
وجود ہی نہ رہا ہو تاہم اس سے عام لوگوں کی زندگیوں پر کوئی خاص اثر نہ پڑا۔ وہ پہلے ہی چینی خاص خاص
مواقع پر ہی استعمال کرتے تھے۔ وہ گڑ اور شکر کے عادی تھے اور یہ چیزیں اب بھی آسانی اور فراوانی سے
دستیاب ہو رہی تھیں۔ البتہ جن لوگوں کو ولایتی چینی کا چسکا پڑ چکا تھا، ان کے لیے قدرے مشکل پیدا ہوگئی
تھی، تاہم دیسی چینی سے، جسے میاں نور محمد کوگی اور بعض دوسرے اشخاص کی دستی مشینیں بناتی تھی، ان کی مشکل
کچھ کم ہوگئی تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ جس سے دیہاتوں کے باشندوں کو واسطہ پڑا، وہ یہ تھا کہ ملوں کا کپڑا
بالکل ناپید ہوگیا اور اس کا حصول جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ عدم دستیابی کی وجہ سے مختلف دیہاتوں میں
جو چند ایک دکانیں تھیں، وہ بند ہوگئیں۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ہندوستان جن اشیا کے لیے زیادہ تر غیر ممالک
پر انحصار کرتا تھا، ان کی درآمدات تقریباً بند ہو چکی تھیں کیونکہ جہاز رانی بہت مخدوش ہوگئی تھی۔ اس کی زد
زیادہ تر چینی، جو جاوا سے منگوائی جاتی تھی اور ملوں کے کپڑے پر پڑی جو عموماً مانچسٹر کی ملوں سے آتا تھا۔
ملک میں چینی بھی بنتی تھی اور کپڑا بھی، مگر اتنا نہیں کہ سب کی ضروریات پوری ہو سکتیں۔ اس پر مستزاد فوج
کی ضروریات روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں اور یوں ملک میں جو مال بنتا تھا، اس کی کھپت بھی زیادہ تر وہیں
ہو جاتی تھی۔ شہروں میں کپڑے کی فراہمی کا کیا انتظام تھا، مجھے اس کا کچھ علم نہیں، تاہم ہمارے اور اردگرد
کے بعض گاؤنوں کی ضروریات محدود مقدار میں پورا کرنے کے لیے حکام وقتاً فوقتاً اس کے متعدد تھان بھجوانے
کا انتظام کر دیا کرتے تھے۔ یہ تھان ہماری حویلی میں رکھے جاتے تھے جہاں کافی گنجائش تھی اور سرکاری اساتذہ
کی نگرانی میں قیمتاً تقسیم کیے جاتے تھے۔ اس سے کھاتے پیتے لوگوں، خاص طور پر نوجوان لڑکوں کے شوق
کی کسی حد تک تکمیل ہو جاتی تھی، ورنہ عام لوگ دوبارہ کھدر کی طرف پلٹ پڑے تھے۔

جس روز برطانوی وزیراعظم نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا، اسی روز وائسرائے نے اپنے مقامی مشیروں
اور سیاست دانوں سے مشورہ کیے بغیر ہندوستان کی طرف سے طبل جنگ بجا دیا اور اس کے ساتھ ہی فوج

میں زور شور سے بھرتی شروع ہوگئی۔ اردو کے مشہور شاعر حفیظ جالندھری ہندوستانی فوج کے محکمۂ پبلسٹی میں ملازم ہو گئے اور شاہنامہ بھول کر ''میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی رے'' جیسے گیت نہ صرف لکھنے بلکہ ان کا پرچار کرنے کے لیے اپنی ٹولی کے ہمراہ جگہ جگہ دورے کرنے لگے۔ سر سکندر حیات کی، جو ازلی انگریزوں کے وفادار تھے، حکومت بھی جی جان سے اس ''نیک کام'' میں شریک ہوگئی۔ خود ان کا اپنا بیٹا سردار شوکت حیات فوج میں شامل ہو کر مصر پہنچ گیا۔ ہماری پڑوسن بنتو کا بڑا بیٹا عبدالکریم، گاؤں کے poet laureate منشی احمد بخش ریاض کا ایک بیٹا محمد افضل اور چند دیگر نوجوان بھی فوج میں بھرتی ہو گئے اور مختلف محاذوں پر پہنچ گئے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جنگ کے اختتام پر سبھی زندہ سلامت واپس آ گئے تھے، کسی کو خراش تک نہیں آئی تھی۔ جب عبدالکریم واپس آیا، وہ غالباً صوبے دار بن چکا تھا اور باتیں یوں کرتا تھا جیسے کری آپا بھارت کا پہلا دیسی کمانڈر انچیف اور ایوب خاں اس کے گہرے یار ہوں۔ پھر جب ہندوستان کی تقسیم ہوئی اور پنجاب کی فرقہ وارانہ فضا خاصی کشیدہ ہوگئی، اس نے گندھک اور گاؤں میں دیگر دستیاب اشیا کی مدد سے گاؤں کے نوجوانوں کو کام چلاؤ (crude) بم بنانے کی تربیت دینے کی کوشش کی مگر اسے کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

## 32

ہمارے گاؤں کے نزدیک جنوب مغرب کی جانب ایک دیہہ تھا۔ اسے لکھا تو بھدم جاتا تھا مگر بولنے میں بھدماں آتا تھا۔ وہاں چند پٹھان گھرانے بھی آباد تھے۔ ان میں سب سے معروف شخصیت مرتضیٰ احمد میکش کی تھی۔ میکش قیام پاکستان سے قبل خاصے جانے پہچانے صحافی تھے۔ وہ اردو اخبار ''شہباز'' کے ایڈیٹر تھے۔ مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک کے ''انقلاب'' کی طرح ان کا اخبار بھی یونینسٹ پارٹی کی پالیسیوں کا مؤید اور تحریک پاکستان کا مخالف تھا، چنانچہ ''انقلاب'' کی طرح ''شہباز'' کو بھی سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ آج کا تو پتا نہیں لیکن اس زمانے میں اور پاکستان کے قیام کے بعد کچھ عرصے تک حکومت اپنے حامی اخبارات کی اس طرح مالی امداد کرتی تھی کہ ان کے پرچے خرید کر مختلف سرکاری اور تعلیمی اداروں میں مفت تقسیم کر دیے جاتے تھے اور جو اکا دکا سرکاری اشتہارات ہوتے تھے، وہ بھی زیادہ تر انھیں ہی فراہم کر دیے جاتے تھے۔ پرائیویٹ اشتہارات نہ ہونے کے برابر ہوتے تھے اور جو ہوتے بھی تھے، وہ بھی عموماً ہندو اخبارات کو ملتے تھے۔ البتہ ''زمیندار'' اور ایک آدھ دوسرے اخبار میں ''اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا'' کے عنوان سے ایک جنسی اشتہار باقاعدگی سے شائع ہوتا تھا۔ کبھی کبھار نامور ماہر امراض قلب

ڈاکٹر شہریار کے والد محترم کی ''ڈیروز فارمیسی'' کا اشتہار بھی چھپ جاتا تھا۔ یوں ''انقلاب'' اور ''شہباز'' جیسے اخبارات عمومی مخالف فضا میں بھی چلتے رہتے تھے مگر قیام پاکستان کے بعد جب ان اخباروں کو سرکاری سرپرستی میسر نہ رہی، مالی مشکلات کی وجہ سے دونوں اخبارات یکے بعد دیگرے بند ہو گئے کیونکہ ان کے اصل خریدار نہ ہونے کے برابر تھے اور رہے اشتہارات، سرکاری اور غیر سرکاری دونوں ہی، ان کے ملنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہ گیا تھا۔ مولانا غلام رسول مہر تصنیف و تالیف میں جت گئے اور مولانا عبدالمجید سالک مختلف فرضی ناموں سے پاکستان کی مرکزی حکومت کے حق میں مضامین لکھنے لگے جو اردو اخبارات میں چھپوائے جاتے تھے۔ اس زمانے کے دوسرے ایڈیٹروں کی طرح مرتضیٰ احمد میکش اچھے خاصے ادیب اور شاعر بھی تھے۔ محمد صالح طاہر نے ان کی ادبی خدمات پر ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ شورش کاشمیری نے اپنی کتاب ''نورتن: لاہور کے نو صحافیوں کا اجمالی تذکرہ'' میں انھیں بھی شامل کیا ہے۔

23 اور 24 مارچ کو لاہور کے منٹو پارک (موجودہ اقبال پارک) میں آل انڈیا مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس منعقد ہوا جس میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی مگر اس اجلاس کے انعقاد سے چار روز قبل 19 مارچ کو خاکساروں نے اپنے بعض مطالبات منوانے کے لیے ایک جلوس نکالا جس پر پولیس نے گولی چلا دی جس سے متعدد اشخاص ہلاک ہو گئے۔ سب سے پہلا شخص جو گولی کھا کر زمین پر گرا، وہ مرتضیٰ احمد میکش کا بھتیجا ضیغم خاں تھا۔ اس نے سینے پر گولی کھائی تھی اور پیٹھ نہیں دکھائی تھی۔ بعد میں میری اس خاندان سے یاد اللہ ہو گئی کہ میٹرک میں اس کا چھوٹا بھائی ممتاز میرا ہم جماعت اور دوست تھا۔ جب بھی اس کے بھائی کا ذکر آتا، اس کی آنکھیں ڈبڈبا آتی تھیں۔

## 33

دریں اثنا جنگ عظیم دوم زور و شور سے جاری تھی۔ ہٹلر نے پولینڈ پر قبضہ کرنے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ 10 مئی 1940 کو اس کی فوجوں نے ہالینڈ اور بیلجیم کو بھی روند ڈالا۔ وزیر اعظم چیمبرلین مستعفی ہو گیا۔ اس کی جگہ ونسٹن چرچل وزیر اعظم مقرر ہو گیا۔ چرچل اپنے آپ کو اس عہدے کا سب سے زیادہ اہل سمجھتا تھا اور اس کو حاصل کرنے کے لیے بے حد بے قرار تھا۔ اس نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ شاہ جارج ششم نے اسے اور لارڈ ہیلی فیکس کو انٹرویو کے لیے بلایا تھا۔ چرچل انتہائی بے چین تھا مگر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ لارڈ ہیلی فیکس نے خود ہی اپنا نام واپس لے لیا اور یوں چرچل کے من کی مراد پوری ہو گئی۔

چرچل بہت اچھا لکھاری تھا۔ [اسے 1953 میں ادب کا نوبل پرائز ملا تھا۔ وہ اس کا مستحق تھا یا نہیں، یہ الگ بحث ہے۔] اس کے ساتھ ہی وہ بلا کا مقرر تھا۔ اس نے اپنی سوانح حیات میں تحریر کیا ہے کہ جب اپریل 1888 میں اس نے انگلستان کے مشہور پبلک سکول ہیرو (Harrow) میں داخلے کا امتحان دیا تو اس نے لاطینی [اس زمانے کے پبلک سکولوں میں یونانی اور لاطینی کی تعلیم لازمی تھی] کے پرچے میں ایک لفظ بھی نہ لکھا بلکہ سارا وقت اس کے اندر گول دائرے بناتا رہا۔ پتا نہیں ہیڈ ماسٹر کو اس کی کیا ادا پسند آئی کہ اس نے اسے اپنے سکول میں داخلہ دے دیا مگر پڑھائی کے لیے کمزور طلبا کے سیکشن میں بھیج دیا۔ چرچل نے مزید لکھا ہے کہ "اس کا فائدہ مجھے یہ ہوا کہ ذہین طلبا تو یونانی اور لاطینی پر سر کھپاتے اور اپنا وقت ضائع کرتے رہے مگر مجھے اپنی انگریزی بہتر بنانے کا موقع مل گیا۔" اس پر مستزاد یہ کہ وہ رٹا لگانے میں بڑا ماہر تھا۔ اس نے ایک مقابلے میں (لارڈ) میکالے کی طویل نظم "Lays of Ancient Rome" کے بارہ سو مصرعے زبانی سنا کر انعام بھی جیت لیا اور سب کو ہکا بکا بھی کر دیا۔

چرچل نے تمام پارٹیوں پر مشتمل مخلوط حکومت بنائی اور 13 مئی 1940 کو اس نے دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا، "میرے پاس آپ لوگوں کو دینے کے لیے خون، محنت شاقہ، آنسوؤں اور پسینے (blood, toil, tears and sweat) کے سوا کچھ بھی نہیں۔" تاہم اس نے یقین دلایا کہ "برطانیہ کبھی ہار نہیں مانے گا" اور اس نے واقعی ہار نہیں مانی مگر اس کی کامیابی میں انگریزوں سے بھی زیادہ 25 لاکھ

---

1- چرچل 23 سال کی عمر میں 1897 میں ہندوستان آیا تھا۔ وہ سر بنڈن بلڈ [Bindon Blood] کیا نام ہے؟] کی زیر کمان قبائلی علاقوں کے پٹھانوں کے خلاف برسر پیکار ملاکنڈ فیلڈ فورس میں شامل ہو گیا اور ساتھ ہی نامہ نگاری بھی کرتا رہا۔ [اس کی رپورٹیں بعد ازاں "دی سٹوری آف دی ملاکنڈ فورس" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئیں۔] قبائلی علاقوں کے متعلق اس نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھا "یہاں کا ہر شخص soldier (فوجی) ہے۔" وہ وہاں رہا تو صرف چند ہفتے ہی مگر اکثر اخبار نویسوں کی طرح وہ بھی اپنے آپ کو پٹھانوں کا ماہر تصور کرنے لگا۔ عجیب بات یہ ہے کہ انگریز پٹھانوں کے خلاف لڑتے بھی رہتے تھے مگر شریف النفس (noble) جنگجو نسل کے طور پر ان کا احترام بھی بہت کرتے تھے۔ چرچل کا بھی یہی حال تھا۔ اس کے خیال میں پٹھانوں میں "جنوبی افریقہ کے زولوؤں (Zulus) کی خونخواری (ferocity) Redskins (امریکا کے مقامی باشندے) کی عیاری اور بوئروں [جنوبی افریقہ کے ولندیزی نژاد باشندے جنھوں نے انیسویں صدی کے اواخر میں انگریزوں کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے] کی نشانہ بازی یکجا ہو گئی ہیں۔" اس نے یہ بھی لکھا کہ "یہاں کا ہر شخص ہر دوسرے شخص کے خلاف ہوتا ہے مگر اجنبیوں کے خلاف سب متحد ہو جاتے ہیں۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ یہاں ہر وقت شورش بپا رہتی ہے اور ایک ایسا ذہنی رویہ وجود میں آ گیا ہے جو زندگی کو پرکاہ کے برابر اہمیت نہیں دیتا اور جو جنگ کو بچوں کا کھیل سمجھ کر ہر وقت اس کے لیے تیار رہتا ہے۔" موجودہ طالبان کے پیش رو مدارس کے طالب علموں سے وہ گھن کھاتا تھا۔ ان کے متعلق اس نے لکھا کہ "وہ دوسرے لوگوں کے خرچ پر پلتے اور مفت کی روٹیاں توڑتے ہیں۔" افغانستان میں مقیم امریکی جرنیل اس کی کتاب کو حرز جان بنا کر رکھتے ہیں۔

ہندوستانی فوجیوں کے خون پسینے اور بے مثال شجاعت کا دخل تھا۔ پھر انگریزوں نے ہندوستان کے سارے مالی، صنعتی اور فوجی وسائل جنگ میں جھونک دیے اور ان سب چیزوں نے جنگ کا پانسا پلٹنے میں اہم کردار ادا کیا۔

جرمن فوجوں نے ہالینڈ اور بلجیم پر قبضہ کرنے کے بعد فرانس بھی تسخیر کر لیا۔ انھوں نے فرانسیسی جرمن سرحد پر واقع انتہائی مضبوط اور ناقابل تسخیر سمجھی جانے والی حد بندیاں میوی نو (Maginot) تہس نہس کر دیں۔ سرحد پار جو فرانسیسی فوجیں تھیں، وہ مقابلہ نہ کر سکیں۔ دریں اثنا بہترین فرانسیسی اور برطانوی دستے ابھی تک شمال میں تھے، وہ فرانسیسی بندرگاہ ڈنکرک[1] (Dunkirk) کی طرف بھاگے۔ آگے سمندر اور پیچھے جرمن فوجیں۔ جائیں تو کہاں جائیں۔ انھیں وہاں سے نکالنے کا فوری منصوبہ بنایا گیا۔ بحریہ کے تو تباہ کن جہاز، 200 نجی تجارتی جہاز اور لاتعداد کشتیاں، جو سمندر میں سفر کر سکتی تھیں، اس کام پر لگا دی گئیں۔ 26 مئی سے 4 جون تک کی مدت کے دوران میں دو لاکھ برطانوی اور ایک لاکھ چالیس ہزار فرانسیسی فوجیوں کا انخلا مکمل ہو گیا۔ جب یہ انخلا جاری تھا، ہٹلر نے اپنی فوجوں کو ڈنکرک کی طرف بڑھنے سے روک دیا۔ پتا نہیں کیوں؟ ورنہ جنگ شاید وہیں ختم ہو جاتی اور فرانس کے ساتھ برطانیہ کا بھی بولو رام ہو جاتا۔ انگریزوں نے اس کامیاب انخلا کو ایک معجزہ بنا کر پیش کیا۔[2] مولانا ظفر علی خاں نے شاید جنگ عظیم اول کے دوران میں ایک نظم لکھی تھی جس کا ایک مصرع زبان زد خاص و عام ہو گیا تھا: قدم جرمن کے بڑھتے ہیں، فتح انگلش کی ہوتی ہے۔ اس مصرع کا اطلاق ڈنکرک پر زیادہ ہوتا ہے۔

## 34

مولانا ظفر علی خاں کمال کے آدمی تھے۔ وہ بیک وقت شاعر بھی تھے، صحافی، ترجمہ نگار، مقرر اور سیاسی رہنما

1۔ خود فرانسیسی اسے Dunkerque لکھتے اور اس کا تلفظ "دان کرک" کرتے ہیں۔

2۔ ان مواقع پر قدرت بھی اکثر انگریزوں کا ساتھ دیتی رہی ہے۔ ملکہ الزبتھ اول کے عہد حکومت میں اس زمانے کے یورپ کی عظیم ترین قوت ہسپانیہ نے 1588 میں بہت بڑے بحری بیڑے کے ساتھ، جسے Armada کہا جاتا تھا، انگلستان پر چڑھائی کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اگر یہ حملہ ہو جاتا، انگلستان کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی اور وہ شاید ایک چھوٹے سے جزیرے سے زیادہ کچھ نہ رہتا مگر حملے سے پہلے ہی ایک انتہائی زبردست طوفان آیا جس میں یہ بیڑا مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ انگلستان کی واہ واہ ہو گئی، وہ عظیم ترین بحری طاقت بن کر ابھرا اور ملکہ الزبتھ اپنے ملک کی عظیم ترین شاہی حکمران کہلائی۔ 1745 میں جب فرانسیسی بیڑا برطانیہ پر حملے کے لیے روانہ ہوا تو ساحل پر پہنچنے پر اسے بھی خوفناک طوفان نے گھیر لیا اور تمام جہاز ساحل سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئے۔

بھی۔ ان کے چھوٹے بھائی مولانا حامد علی خاں کے بقول انھیں "انگریزی، اردو، فارسی اور عربی ادب پر کامل دسترس حاصل تھی۔ نظم و نثر اور تحریر و تقریر میں ان کی روانی بڑے بڑوں کے لیے قابلِ رشک تھی۔"

ان کا کلام اکثر ان کے اپنے اخبار "زمیندار" میں باقاعدگی کے ساتھ چھپتا رہتا تھا۔ جب اخبار پر کوئی افتاد پڑتی اور اس کی مالی حالت سقیم ہونے لگتی، وہ جھٹ پٹ قلم اٹھاتے اور آن کی آن کوئی باغیانہ نظم لکھ دیتے۔ یہ نظم اگلے روز "زمیندار" میں جلی حروف میں حاشیے کے اندر پہلے صفحے پر شائع ہو جاتی۔ حکومت بھنا اٹھتی اور طیش میں آ کر اخبار بند کر دیتی۔ یہی مولانا چاہتے تھے۔ اخبار پر چندے کی بارش ہونے لگتی اور مولانا کے وارے نیارے ہو جاتے۔

مولانا ظفر علی خاں کو سیاست کا بھی شوق تھا۔ انھوں نے 1930 کی دہائی میں اپنی ایک جماعت بھی بنائی تھی۔ اس کے ارکان نیلی وردی پہنتے تھے، اس لیے نیلی پوش کہلاتے تھے۔ نیلی پوشوں نے مسجد شہید گنج کی واگزاری کے لیے ایک تحریک بھی چلائی تھی مگر اس تحریک کو دوسرے لوگوں نے ہائی جیک کر لیا اور مولانا منہ دیکھتے رہ گئے۔ بعد میں وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور تن من سے حصول پاکستان کی جدوجہد میں شریک ہو گئے۔

مولانا اکثر جلسوں میں تقریریں کرتے رہتے تھے۔ ان کی ان تمام تقریروں کا موضوع تقریباً یکساں ہوتا تھا۔ اس زمانے کے اخبارات میں اتنی سکت تو تھی نہیں کہ خبروں کے حصول کے لیے اپنے نامہ نگار رکھ لیتے۔ ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا (API) سارے ہندوستان کی واحد دیسی نیوز ایجنسی تھا۔ وہ گاندھی جی، نہرو اور قائداعظم جیسے رہنماؤں کے جلسوں کی روداد کی تو ضرور تشہیر کرتا تھا لیکن مولانا ظفر علی خاں جیسے کم تر رہنماؤں کو کوئی گھاس نہیں ڈالتا تھا۔ مولانا کے جلسوں کی روداد قلم بند کرنے کے لیے زمیندار کا کوئی سب ایڈیٹر پہنچ جاتا مگر اکثر اوقات وہ اس کا بھی تکلف نہ کرتا، دفتر میں بیٹھ کر اخبار کا کوئی پرانا شمارہ اٹھاتا اور کچھ ترمیم و تنسیخ کے ساتھ مولانا کی مطبوعہ تقریر کو نئی بنا کر نئی گرج کی شہ سرخیوں کے ساتھ دوبارہ چھاپ دیتا۔ ایک مرتبہ زور کا مینہ برسا اور مولانا کو اپنا جلسہ منسوخ کرنا پڑا لیکن اگلے روز تقریر پھر بھی چھپ گئی۔

## 35

1941 کا سال مجھ پر بہت بھاری گزرا۔ اپریل میں میری دادی اور جولائی میں میری اماں دونوں یکے بعد دیگرے

انتقال کر گئیں۔ دونوں خواتین مجھے بے حد عزیز تھیں۔ میری کوئی بہن نہیں تھی، دونوں پھوپھیاں میری پیدائش سے بہت پہلے 1903 میں طاعون کی وبا میں فوت ہو گئی تھیں۔ ایک خالہ ضرور تھی، وہ متیر (سوتیلی) تھی اور ہمارا اس کے ہاں کوئی خاص آنا جانا نہیں تھا۔ زندگی میں میری اس سے صرف ایک ملاقات ہوئی تھی اور وہ بھی قیام پاکستان کے بعد۔ چنانچہ دادی اور اماں کی وفات سے میری زندگی میں جو خلا پیدا ہوا، وہ مدتوں پورا نہ ہو سکا۔ دادی تو پھر بھی بڑھاپے کی منزل میں قدم رکھ چکی تھیں مگر اماں تو ابھی چالیس کو بھی نہیں پہنچی تھیں۔ یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا! کئی مہینے تو مجھے یقین ہی نہ آیا کہ وہ روٹھ کر وہاں چلی گئی ہیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا۔ جب وہ بقید حیات تھیں، وہ بعض اوقات ابا سے روٹھ کر اپنے ماموں مولوی پیر محمد کے ہاں ڈنگل انجیا چلی جاتی تھیں اور چند دن بعد ابا انھیں واپس لے آتے تھے۔ اب بھی میں یہی سوچتا رہتا کہ وہ روٹھ کر ڈنگل انجیا چلی گئی ہیں اور چند روز بعد واپس آ جائیں گی۔

اماں سخت مذہبی خاتون تھیں۔ نماز کبھی قضا نہیں ہونے دیتی تھیں۔ گرمی خواہ قیامت کی پڑ رہی ہو، اس زمانے میں بھی جب بجلی کی سہولت میسر تھی نہ برف کہیں ملتی تھی، وہ پورے روزے رکھتی تھیں اور ہمیں بھی رکھواتی تھیں۔ پکے مذہبی اور وہ بھی دیوبندی گھرانے سے تعلق رکھنے اور پڑھی لکھی (اگرچہ معمولی۔ ان کے پاس دو قلمی نسخے بھی تھے جنھیں وہ سینت کر اپنی الماری میں رکھتی تھیں۔ وہ کیا تھے، مجھے کچھ معلوم نہیں کیونکہ ان کے انتقال کے بعد بھی میں نے انھیں کبھی کھول کر نہیں دیکھا تھا جس کا مجھے بعد میں بہت افسوس ہوا) ہونے کے باوجود وہ بے حد وہمی تھیں۔ انھوں نے ایک پیر بھی سیپ رکھا تھا جو ہمارے گاؤں سے مشرق کی جانب ایک اور گاؤں ڈھگڑ اں کے عین درمیان میں ایک چھوٹے سے کچے حجرے میں اکیلا رہتا تھا۔ اماں اپنی مختصر زندگی کے آخری سالوں میں اکثر بیمار رہنے لگی تھیں اور تعویذ لانے کے لیے مجھے اس کے پاس بھیجتی رہتی تھیں مگر انھیں افاقہ نہ ان تعویذوں سے ہوا اور نہ دواؤں سے۔

## 36

اسی سال ہٹلر نے زبردست پینگا لیا اور سوویت یونین پر حملہ کر دیا۔ اس نے اپنے وقتوں کے عظیم ترین جرنیل نپولین بونا پارٹ کی ہزیمت سے بھی کوئی سبق نہ سیکھا۔ روس اقتصادی طور پر اتنا وسیع و عریض (اور اوپر سے اتنا سرد) ملک ہے کہ اس میں داخل ہونا تو آسان ہے مگر واپسی تقریباً ناممکن ہے۔ نپولین مار دھاڑ کرتا ماسکو پر قابض ہو گیا تھا مگر وہاں کی خوف ناک سردی سے گھبرا کر اس نے واپسی کی ٹھان لی۔ راستے میں

اس کا واسطہ زار کے گوریلوں سے پڑا جنھوں نے اس کی فوج کا حشر نشر کر دیا اور اسے گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ نپولین بمشکل اپنی جان بچا کر اکیلا ہی واپس فرانس پہنچنے میں کامیاب ہوا۔

ہٹلر کی فوجوں کو بھی ابتدا میں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ محاذ اتنا لمبا چوڑا تھا کہ تاریخ میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ یہ لینن گراڈ (موجودہ سینٹ پیٹرز برگ سے بحیرہ اسود (Black Sea) تک اور کیف [یوکرین کا صدر مقام] سے سٹالن گراڈ [موجودہ والگوگراڈ: Volgograd] تک پھیلا ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں ہلاک ہونے والے صرف روسیوں کی تعداد اڑھائی کروڑ (25 ملین) تھی۔ جرمنی کے ہاتھ کیا آیا؟ جنگ عظیم میں ناقابل فراموش شکست، ہٹلر کی خودکشی اور ملک کی تقسیم۔

## 37

جب تک جرمنی اور سوویت یونین اتحادی رہے، ہندوستان کے کمیونسٹ، بائیں بازو کے لوگ اور ان کے ہم نوالہ و ہم پیالہ انگریزوں اور ان کے اتحادیوں کی پالیسیوں کی شدومد سے مخالفت کرتے رہے مگر جونہی جرمنی نے روس پر حملہ کیا، انھوں نے راتوں رات پینترا بدلا اور جوق در جوق ہندوستانی فوج میں بھرتی ہونے لگے۔ اگرچہ کمیونسٹ پارٹی کے بڑوں — ایم این رائے، ایس اے ڈانگے، مظفر احمد [ادبی دنیا کے مالک اور مدیر مولانا صلاح الدین کے بھائی]، شوکت عثمانی، غلام حسین، سجاد ظہیر وغیرہ نے براہ راست فوج میں شمولیت اختیار کرنے سے گریز کیا، وہ اور ملکی پیمانہ پر ہی باہر سے جنگ کی زبردست حمایت کرتے رہے [وائسرائے کے ایما پر ہندوستان کی حکومت نے بھی کمیونسٹ پارٹی پر پابندی اٹھالی]، دوسروں لوگ، جن میں فیض احمد فیض جیسے جغادری ادیب بھی شامل تھے، فوجی خدمات سرانجام دینے لگے۔ وہی جنگ جو پہلے حرام تھی، اب مباح ہو گئی۔ مجید ملک، چراغ حسن حسرت اور ضمیر جعفری اگرچہ کمیونسٹ نہیں تھے تاہم وہ بھی فوج کے شعبۂ تعلقات عامہ میں چلے گئے۔ اسلامیہ کالج لاہور کے انگریزی کے استاد اور بھولے بسرے افسانہ نگار سید فیاض محمود انڈین ایئر فورس (فضائیہ) کے شعبۂ تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔

## 38

1942 میں میرا مڈل سکول کا امتحان تھا۔ حکومت پنجاب کے محکمہ تعلیم نے ہمارا امتحانی مرکز شاہ کوٹ بنایا تھا۔

شاہ کوٹ منڈی انحیا سے تقریباً دو میل اور ہمارے گاؤں سے کوئی چھ ساڑھے چھ میل دور جانب جنوب مغرب میں اونچائی (یعنی ڈھاہے) پر واقع تھا اور وہاں ایک خاصی اونچی گھاٹی چڑھ کر جانا پڑتا تھا۔ وہاں سے ہر روز آنا جانا مشکل تھا، ناچار قریبی گاؤں میں اپنے رشتے داروں کے ہاں پناہ لینا پڑی۔

شاہ کوٹ اچھا خاصا قصبہ تھا۔ اب اسے تحصیل کا درجہ مل چکا ہے۔ چونکہ یہ علاقے کا تجارتی مرکز (market town) تھا، اس لیے وہاں ہندو اچھی خاصی تعداد میں آباد تھے۔ پنجاب کے دیگر علاقوں کی طرح یہاں بھی کاروبار پر انھی کا قبضہ تھا تاہم ہندو دکانداروں کی اس اعتبار سے تعریف کرنا پڑتی ہے کہ انھیں کاروبار کرنا آتا تھا۔ وہ پاکستان کے دکانداروں کی طرح گاہکوں کا ایک ہی دفعہ مونڈن نہیں کرتے تھے کہ جب تک چار پانچ گنا منافع نہ مل جائے، ان کی تسلی ہی نہیں ہوتی۔ وہ مال زیادہ بیچتے اور منافع کم کماتے تھے۔ عام طور پر وہ ایک روپے پر صرف ایک آنا زیادہ پر اشیا فروخت کرتے تھے یعنی سوا چھ فیصد منافع پر۔

جن دنوں ہمارا امتحان ہو رہا تھا، پورے صوبے میں بکری محصول (sales tax) کے خلاف ہڑتال ہو رہی تھی۔ میں نے اتنی مکمل اور پرامن ہڑتال کبھی نہیں دیکھی۔ ہمارا امتحان کوئی دس بارہ روز جاری رہا، اس عرصے کے دوران میں میں نے دودھ دہی کی دکانوں کے ماسوا ایک دکان بھی کھلی نہیں دیکھی۔

شاہ کوٹ نکودر فیروز پور ریلوے لائن پر واقع سٹیشن تھا مگر یہ سٹیشن سانجھا تھا۔ ریلوے لائن کی دوسری جانب ملسیاں کا قصبہ تھا اور دونوں کے نام پر ملسیاں۔ شاہ کوٹ سٹیشن کہلاتا تھا۔ ملسیاں کی اردو ادب میں بھی اہمیت ہے۔ تحصیل نکودر نے اردو کے تین اچھے ہندو شاعر پیدا کیے تھے۔ ان میں سے ایک شاد نکودری تھے۔ وہ دوسرے دونوں سے بہتر شاعر تھے۔ تقسیم ہند کے بعد بھارت میں ان کی شاعری کا خاصا چرچا رہا۔ ان کے مداحین میں اردو کے ممتاز نقاد شمیم حنفی بھی شامل ہیں مگر انھیں کثرت شراب نوشی لے ڈوبی اور وہ جوانی میں ہی فوت ہو گئے۔

دوسرے دونوں شاعروں کا تعلق ملسیاں سے تھا اور اس رعایت سے وہ اپنے آپ کو ملسیانی لکھتے تھے۔ دونوں باپ بیٹا تھے۔ باپ لبھو رام کا تخلص جوش تھا اور ان کے صاحب زادے بال مکند کا عرش۔ جوش ملیح آبادی کے زمانہ ادارت میں عرش ملسیانی حکومت ہند کے ادبی رسالے "آج کل" کے نائب مدیر تھے اور جوش ملیح آبادی کے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد 1954 میں مدیر اعلیٰ بن گئے تھے۔ ان کے کلام کے چار مجموعے شائع ہوئے۔ جگن ناتھ آزاد نے، جو خود بھی ایک شاعر تلوک چند محروم کے فرزند ارجمند تھے، "آنکھیں ترستیاں ہیں" کے عنوان سے ان کی سوانح حیات قلم بند کی تھی اور ان کے کلام کا جائزہ لیا

تھا۔ پنڈت ہری چند اختر[1] نے بھی ان پر ایک چھوٹی سی کتاب تحریر کی تھی۔
ان کے دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

شباب آیا کسی بت پر فدا ہونے کا وقت آیا
مری دنیا میں بندے کے خدا ہونے کا وقت آیا
نوید سربلندی دی منجم نے تو میں سمجھا
سگان دہر کے آگے خدا ہونے کا وقت آیا

ہمارے علاقے کے واحد ذیل دار چودھری محمد بخش تھے۔ وہ بھی ملسیانی تھے۔ ان کے بیٹے چودھری غلام ربانی ساری عمر ساہی وال میں نیشنل بینک کے خزانچی رہے، پھر ذوالفقار علی بھٹو کے عہد حکومت میں ان کی قسمت نے پانسا پلٹا۔ ڈاکٹر مبشر حسن کے مستعفی ہونے کے بعد ان کے قریبی رشتے دار رانا محمد حنیف وزیر خزانہ مقرر ہو گئے اور پلک جھپکنے میں چودھری غلام ربانی پاسکو کے پہلے مینجنگ ڈائریکٹر تعینات ہو گئے۔ عام افواہ یہی تھی کہ وہ خوب مال پانی کماتے تھے مگر رانا محمد حنیف کو نذرانہ دیتے تھے اور انھیں ایک دھیلا تک نہیں دیتے تھے۔ اردو کے ممتاز شاعر ظفر اقبال ان دنوں اکاڑہ میں وکالت کرتے اور نوائے وقت میں کالم لکھا کرتے تھے۔ وہ گاہے بگاہے چودھری غلام ربانی کی مبینہ کرپشن کا بھانڈا پھوڑتے رہتے تھے۔ ایک کالم میں انھوں نے تحریر کیا کہ پاسکو نے گندم سٹور کرنے کے لیے آٹھ کروڑ بوریاں خریدیں، چودھری غلام ربانی نے فی بوری چار آنے کمیشن لیا اور بیٹھے بٹھائے دو کروڑ کما لیے۔

## 39

اسی سال آٹھ اگست کو مہاتما گاندھی کے ایما پر آل انڈیا کانگرس نے "بھارت چھوڑ دو" اندولن (Quit India Movement) شروع کر دیا۔ کانگرس پہلے ہی جنگ کی مخالف تھی۔ اس کا استدلال تھا کہ ہندوستان صرف اسی صورت میں جنگ کی حمایت کر سکتا ہے اگر اس کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے۔

---

۱۔ خود پنڈت ہری چند اختر نغز گو شاعر تھے۔ وہ حفیظ جالندھری کے شاگرد تھے اور اس پر فخر محسوس کرتے تھے۔ وہ بے حد غیر متعصب شخص تھے، اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے حبیبہ ہال جو مشاعرے ہوتے تھے (اور یہ مشاعرے اکثر ہوتے رہتے تھے) وہ ان میں بالالتزام شرکت کرتے تھے۔

چرچل جیسا کٹر سامراج پسند (imperialist) اس مطالبے کو کیسے منظور کر سکتا تھا۔ اس نے اسے پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ اس پر کانگرس بھڑک اٹھی۔ اس کی مختلف صوبوں میں وزارتیں 1939 میں مستعفی ہو چکی تھیں (اس پر مسلم لیگ نے یوم نجات منایا تھا)۔ گاندھی جی نے ''کرو یا مرو'' (do or die) کا نعرہ بلند کر دیا۔ [یوں گاندھی جی اہنسا (عدم تشدد) کا پرچار کرتے تھے مگر اندر سے دوغلے آدمی تھے اور بوقت ضرورت اپنے پیروکاروں کی متشددانہ کارروائیوں پر آنکھیں بند کر لیتے تھے۔] کانگرس کے پیروکاروں نے اسے کھلی چھٹی سمجھ لیا اور متعدد لوگوں نے متشددانہ کارروائیاں کرتا اور دکانداروں کو ہڑتالیں کرنے پر اکسانا شروع کر دیا۔ انہوں نے ریلوے سٹیشنوں، عدالتوں اور تھانوں پر، جنہیں انگریز راج کی علامتیں سمجھا جاتا تھا، ہلے بول دیے، ریلوے لائنوں کو نقصان پہنچایا اور ٹیلی فون اور ٹیلی گراف کے تار کاٹ دیے۔ خاصا خون خرابہ ہوا اور بعض مقامات پر لوگوں نے ''آزاد'' حکومتیں قائم کر لیں۔

''بھارت چھوڑ دو'' تحریک شروع ہوتے ہی کانگرس کے صف اول کے نیتاؤں کو، بشمول مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار ولبھ بھائی پٹیل، احمد آباد کے تاریخی قلعے اور مہاتما گاندھی کو آغا خاں کے محل میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ شر میں بھی خیر کا پہلو ہوتا ہے، کانگرسی لیڈروں کی نظر بندی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ پنڈت نہرو نے فرصت کو غنیمت جان کر اپنی شہرۂ آفاق کتاب "The Discovery of India" تحریر کی اور مولانا آزاد نے اپنے احباب کو بصیرت افروز خطوط لکھے جو سپرد ڈاک تو نہ ہو سکے کیونکہ ان پر جیل سے باہر کے لوگوں سے روابط قائم رکھنے پر سخت پابندیاں عاید تھیں، مگر ان کی رہائی کے بعد ''غبار خاطر'' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ یہ کتاب اب اردو ادب کی کلاسیک تسلیم کی جاتی ہے۔

## 40

یورپ میں جنگ زور شور سے جاری تھی اور اس کے شعلے شمالی افریقہ تک پہنچ چکے تھے۔ جرمنی مختلف ممالک کو تسخیر کرتا پیرس میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کا ''یار'' سوویت یونین بھی کوئی ڈھیل نہیں دکھا رہا تھا۔ اس نے جرمنی کی رفاقت میں پولینڈ پر قبضہ کرنے کے بعد نومبر 1939 میں فن لینڈ پر حملہ کر دیا، اسے تہس نہس کیا اور وہاں اپنے ''چمچوں'' کی حکومت قائم کر دی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے 16 اپریل 1940ء کو Katyn کے جنگلوں میں سترہ ہزار یہودی فوجیوں اور عام شہریوں کا قتل عام شروع کر دیا اور یوں اس ''نیک کام'' میں بھی

ہٹلر کا شریک بن گیا۔ 18 جون 1940 کو اس نے استونیا، لتویا اور لتھوانیا جیسے ننھے منھے ممالک پر یلغار کر دی۔ امریکا ابھی تک اس جنگ سے مختلف حیلوں بہانوں سے گریز کر رہا تھا بلکہ امریکی کانگرس نے 4 نومبر 1939 کو غیر جانب داری کا قانون بھی منظور کر لیا تھا۔ 7 ستمبر 1940 کو جرمنی کے 652 طیاروں نے لندن پر بم باری کا آغاز کر دیا۔ اسے blitz کہا جاتا ہے۔ ہر روز ڈیڑھ سو سے دو سو ٹن بم گرائے جاتے تھے۔ چھ مہینوں میں تقریباً دس لاکھ بم گرائے، اور چالیس ہزار انگریز ہلاک ہو چکے تھے۔ لندن کے متعدد علاقوں کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی۔

ادھر انگریزوں کو شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں فتوحات پر فتوحات حاصل ہو رہی تھیں اور بالآخر وہ عراق اور ایران تک تقریباً تمام ممالک پر قابض ہو گئے۔ اُدھر مشرق بعید میں جاپان الگ مار دھاڑ کر رہا تھا اور مختلف ممالک پر قبضے کیے جا رہا تھا۔ جولائی 1941 میں امریکا نے جاپان کو تیل کی برآمدات پر پابندیاں عاید کر دیں۔ جاپان نے جوابی کارروائی کی اور سات دسمبر 1941 کو جزائر ہوائی کی بندرگاہ پرل ہاربر میں امریکا کے لنگر انداز جہازوں پر فضائی حملہ کر دیا۔ امریکا اسی موقع کا منتظر تھا، اس نے ''غیر جانبداری'' کا لبادہ اتار پھینکا اور اس کی فوجیں یورپ اور ایشیا دونوں کے محاذوں پر جنگ میں کود پڑیں۔

کانگرس کے سرکردہ رہنماؤں میں بنگال کے سبھاش چندر بوس بھی شامل تھے۔ انھوں نے انقلابی طبیعت پائی تھی اور وہ ہندوستان کی آزادی کے لیے ہر قسم کے طریقے اختیار کرنے پر زور دیتے تھے، اسی لیے بے شمار لوگوں کے نزدیک وہ ''نیتا جی'' یعنی اصلی تے وڈے لیڈر تھے اور آج بھی وہ ''نیتا جی'' کے لقب سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ 1939 میں گاندھی جی کی مخالفت کرنے پر انھیں کانگرس سے نکال دیا گیا۔ بعد ازاں انھیں انگریز حکومت نے جیل میں ڈال دیا مگر وہ کسی طرح 1941 کے آغاز میں فرار ہو کر محوری طاقتوں کے پاس چلے گئے۔ جاپانیوں کے تعاون سے انھوں نے ہندوستانی فوجیوں پر مشتمل، جنھیں جاپانیوں نے سنگاپور کے محاذ پر گرفتار کیا تھا، آزاد ہند فوج کی تشکیل کی جس میں ہندوستانی فوج کے ہندو، مسلم، سکھ سپاہی اور افسر بھی شامل تھے۔ انھوں نے جاپانیوں کے تعاون سے آزاد ہند کی جلاوطن عبوری حکومت بھی بنالی۔ تاہم 1945 تک جنگ کا پانسا پلٹ چکا تھا۔ یورپ میں جرمنی اتحادی اور سوویت فوجوں سے پٹنے لگا تھا، ادھر مشرق میں جاپان کا برا حال ہونے لگا۔ آزاد ہند فوج، جو جاپانیوں کے ہمراہ برما میں داخل ہو گئی تھی واپس جزیرہ نما ملایا میں دھکیل دی گئی اور اسے سنگاپور میں ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہونا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ سبھاش چندر بوس نے ایک جاپانی طیارے میں، جس میں جہاز کی استطاعت سے کہیں زیادہ لوگ سوار تھے،

فرار ہونے کی کوشش کی مگر طیارہ زیادہ بوجھ سہار نہ سکا، وہ زمین پر گر پڑا اور اسے آگ لگ گئی۔ سبھاش چندر بوس بری طرح جھلس گئے اور انتقال کر گئے۔ ان کی موت کی آج تک مصدقہ طور پر تصدیق نہیں ہو سکی اور بھارت کے بعض لوگ اب بھی سمجھتے ہیں کہ نیتا جی ابھی زندہ ہیں۔

# 41

مارچ 1942 کے اواخر میں مڈل سکول کے امتحان کا نتیجہ آ گیا اور اب ہمیں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسلامیہ ہائی سکول ننگل انبیا کا رخ کرنا پڑا۔ ننگل انبیا ہمارے گاؤں سے تین کوس (تقریباً ساڑھے چار پانچ میل) دور تھا۔ کچی سڑکوں پر سواری تو کوئی دستیاب تھی نہیں۔ اگر کسی کے پاس سائیکل ہوتی، وہ بھی اسے شاذ ہی استعمال کرتا تھا کیونکہ کچے راستے پر کہیں نہ کہیں سائیکل کے ٹائر میں عموماً ایک آدھ کانٹا چبھ جاتا اور ٹیوب میں پنکچر کر دیتا تھا۔ ہوا بھرنے کا پمپ اور پنکچر لگانے کا سامان ساتھ رکھنا پڑتا تھا۔ پنکچر خود ہی لگانا پڑتا تھا۔ بعض اوقات سائیکل دور تک گھسیٹنا پڑتی تھی تاکہ پانی کے قریب پہنچایا جا سکے۔ پنکچر لگانے سے پہلے ٹیوب باہر نکالی جاتی، اس میں پمپ سے ہوا بھری جاتی، جب یہ خوب کس جاتی، اسے پانی میں ڈال دیا جاتا اور جہاں سے شوں شوں کی آواز آتی، اس حصے کو پانی سے باہر نکالا جاتا اور غور سے دیکھا جاتا۔ جہاں چھوٹا سا سوراخ نظر آتا، وہاں نیلی پنسل سے اس کے گرد نشان لگا دیا جاتا۔ کھلی سے ربڑ کا ٹکڑا نکالا جاتا اور اسے نشان پر چسپاں کر دیا جاتا۔ اس سارے کام میں وقت بھی بہت صرف ہوتا اور کوفت بھی اٹھانا پڑتی۔ گرمیوں میں تو خاص طور پر برا حال ہوتا۔ چنانچہ تمام لڑکے، خواہ وہ پانچویں جماعت کے ہوں یا دسویں کے، عموماً پیدل ہی سکول جایا کرتے تھے۔ شروع میں یہ فاصلہ بہت طویل معلوم ہوتا تھا مگر کچھ وقت کے بعد ہم اس قدر عادی ہو جاتے تھے کہ ہمیں اس کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا، یوں کہیں کہ چینڈا اساڈے پیریں چڑھ جاندا سی۔

جب ہم گھروں سے روانہ ہوتے تھے، کبھی گھڑی دیکھنے کا تکلف نہیں کرتے تھے۔ صرف گھر کی بیرونی دیوار پر دھوپ دیکھ کر چل پڑتے تھے اور ہمیشہ وقت پر سکول پہنچ جایا کرتے تھے۔ مئی جون کی لو چل رہی ہو یا دسمبر جنوری کا ٹھکا (شمال کی جانب سے آنے والی انتہائی سرد ہوا ٹھکا کہلاتی تھی) ہمیں کسی کی پروا نہیں ہوتی تھی اور نہ ہمارے مونہوں سے شکایت کا کوئی لفظ نکلتا تھا۔

واپسی میں، خاص طور پر گرمیوں میں، ہمارے پاس وقت ہی وقت ہوتا تھا، چنانچہ راستے میں گپیں

تو بانکتے ہی تھے، طرح طرح کی شرارتیں بھی کرتے رہتے تھے۔ ایک مقام پر ایک چھوٹا سا رکھا میدان آتا تھا، اس میں کرلے کرلیاں (چھپکلیاں)، سیہہ (خارپشت) اور نیولے بکثرت پائے جاتے تھے۔ چھپکلی سے ملتا جلتا ایک اور چھوٹا سا جانور بھی ہوتا تھا، اسے ہم تو گوہ کہتے تھے مگر جب میں لاہور کے اسلامیہ کالج میں داخل ہوا اور شہر کے گلی کوچوں کے چکر لگانا شروع کیے، تو مکتبہ اردو اور نیا ادارہ کے قریب بعض لوگوں کے پاس بالکل یہی جانور دیکھے جو انھوں نے شیشے کے مرتبانوں میں بند کیے ہوتے اور ساتھ میں تیل کی شیشیاں رکھے ہوئے ہوتے تھے۔ وہ بہت اونچی آواز میں ہوکر لگاتے رہتے تھے: "سانڈے کا تیل، سانڈے کا تیل۔" معلوم ہوا کہ ان کی دانست میں یہ تیل قوت باہ بڑھانے میں بہت ممد ثابت ہوتا ہے۔ یا للعجب۔ ہم تو اس جانور کے پیچھے محض شرارتاً بھاگا کرتے تھے، بعض اوقات ایک آدھ پکڑ بھی لیتے تھے مگر فوراً ہی اسے وہیں پٹخ دیتے تھے۔ وہ ایک دو مرتبہ قلابازیاں کھاتا، پھر سیدھا ہو جاتا اور بھاگ جاتا۔

پانی کی چھوٹی سی آڈ ہو، کھال ہو، راجباہ، نہر یا دریا ہو، اگر اس کے کسی مقام پر انسان اور مویشی باقاعدگی سے گزرنے لگیں، تو اس کے کنارے بھرنے اور پاٹ چوڑا ہونے لگتا ہے۔ یوں یہ مقام ایک مستقل گزرگاہ بن جاتا ہے۔ انگریزی میں اس مقام کو ford کہا جاتا ہے جیسے Oxford۔ ہمارے راستے میں ایک آڈ آتی تھی۔ آڈ کوئی خاص چوڑی نہیں ہوتی، اسے بآسانی پھلانگا جا سکتا ہے تاہم لوگوں کے بار بار چھلانگیں لگانے کی وجہ سے ایک آڈ اس مقام پر جہاں سے پگڈنڈی گزرتی تھی، خاصی چوڑی ہو گئی تھی اور اس پر چھلانگ لگانا بہت مشکل ہو گیا تھا لیکن ہم باز نہیں آتے تھے، اکثر اوقات کامیاب ہو جاتے مگر کبھی کبھار آڈ کے اندر گر پڑتے، کیچڑ سے لت پت ہو جاتے اور گھر والوں سے خوب جھڑکیاں سنتے لیکن باز پھر بھی نہ آتے۔

جب ہم سکول کے لیے گھر سے روانہ ہوتے، گاؤں سے نکلتے ہی جو پہلا کنواں آتا، وہ ہمارے پڑوسیوں کا تھا۔ ان کی ال "قائم" تھی۔ اس کنوئیں سے کھیتوں کو پانی لے جانے والی آڈ خاصی فراخ تھی۔ اس کے دونوں کناروں پر جامن، توت اور نالی کے گھنے اور سایہ دار درخت لہلہاتے رہتے تھے۔ چونکہ کنواں گاؤں کے بالکل قریب تھا اس لیے متعدد لوگ اپنی گرمیوں کی دوپہریں گزارنے وہاں آ جاتے۔ ان میں گاؤں کا ہندو سنار رام چند اور اس کا بیٹا چمن لال بھی ہوتا۔ میں نے اتنے وجیہہ اور انتہائی گورے چٹے لوگ کم ہی دیکھے ہیں جتنا کہ چمن لال تھا۔ پتا نہیں یہ قسمت کی خرابی تھی یا اسے کسی کی نظر لگ گئی تھی، مگر حقیقت یہی ہے کہ وہ بہت ابتدائی عمر میں ہی اپنے ہوش و حواس سے محروم ہو گیا تھا۔ اس کا باپ اسے لے کر صبح سویرے "قائموں" کے کنوئیں پر پہنچ جاتا، اس کے پاؤں میں لوہے کا خاصا موٹا سنگل ڈالتا اور اسے

بہت بڑی ٹالی کے ساتھ باندھ دیتا۔ یہ سنگل خاصا لمبا ہوتا تا کہ وہ آسانی سے اِدھر اُدھر گھوم سکے۔ ہمیں اس پر ترس بھی آتا اور اس سے خوف بھی محسوس ہوتا کہ کہیں مارنے کے لیے ہمارے پیچھے ہی دوڑ نہ پڑے۔ اس کے باپ کو غالباً لاہور کے پاگل خانے کا کوئی علم نہیں تھا ورنہ وہ شاید اسے وہاں داخل کرا آتا۔ وہ گھر میں اس کے ساتھ کیسے نپٹتا تھا، مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا۔

''قاموں'' کا ایک بزرگ غلام محمد عرف گاما ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جوڑنے کا بڑا ماہر تھا۔ میرا ایک رشتے دار عبدالغفور عرف غفورا، جو فٹ بال کا بہت اچھا کھلاڑی تھا، جب ہم میٹرک کے طالب علم تھے، ایک مہمان سکول کے ساتھ میچ میں اپنی پنڈلی تڑوا بیٹھا۔ خون تو نہیں نکلا مگر اندرونی چوٹ کی وجہ سے پنڈلی کی ہڈیاں کرچی کرچی ہو چکی تھیں۔ اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ ہم نے ہوسٹل سے ایک چارپائی اُٹھائی، اسے اس پر لٹایا، چار لڑکوں نے اسے کندھوں پر اٹھایا اور پیدل پرجیاں کی طرف چل پڑے۔ راستے میں لڑکے باریاں بدلتے رہے۔ ہمارے مونڈھے شل ہو چکے تھے، پھر بھی ہم نے ہمت نہ ہاری اور اسے گاؤں پہنچا کر ہی دم لیا۔ خوش قسمتی سے تایا غلام محمد گھر پر ہی مل گئے۔ انھوں نے اپنی زوجہ سے سرسوں کا تیل منگوایا۔ وہ پنڈلی کی ہڈیاں اوپر نیچے کرتے ٹھوکتے اور ان پر تیل کی مالش کرتے رہے۔ جانے کتنا وقت صرف ہوا، پھر اچانک ان کا چہرہ کھل اٹھا اور انھوں نے خوش خبری سنائی کہ ہڈیاں اپنی اپنی جگہ فٹ ہو گئی ہیں مگر چونکہ بعض بری طرح ٹوٹ چکی تھیں، اس لیے ٹانگ قدرے چھوٹی ہو جائے گی اور غفورے کو تا حیات لنگڑا کر چلنا پڑے گا۔

قیامِ پاکستان کے بعد عبدالغفور بورے والا میں آباد ہو گیا اور غلہ منڈی میں آڑھت کا کاروبار کرنے لگا مگر اس کا لنگ اب بھی موجود ہے۔

جب ہم سنگل انجیا ہائی سکول میں داخل ہوئے، ہمیں دو سال انگریزی سیکھنے پر ضائع کرنا پڑے۔ پہلے سال کی کلاس جونیئر اور دوسرے کی سینئر کہلاتی تھی۔ ہمارے استاد شہاب الدین تھے۔ آدمی قابل تھے اور ساتھ کے گاؤں کنیاں خرد کے رہنے والے تھے۔ ان کی بیوی مر چکی تھی اور وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ رہتے تھے جس نے ابھی تک شادی نہیں کرائی تھی۔ ان کا رنگ اتنا سیاہ تھا کہ توے کی کالک بھی شرما جائے۔ ان کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی مگر صحت اتنی کمزور تھی کہ معمولی سردی میں بھی کانپتے رہتے تھے۔ چنانچہ وہ سردیوں میں کلاس روم میں کم ہی نکلتے تھے اور باہر دھوپ میں کرسی بچھوا لیتے تھے۔ وہ خود تو اس پر تشریف فرما ہو جاتے تھے اور ہمیں ٹاٹ کے بغیر روڑی زمین پر بیٹھنا پڑتا تھا۔ نیچوں سے اٹھ کر، جو ہمیں پہلی بار دورانِ تعلیم

نصیب ہوئے تھے، نیچے کچی زمین پر بیٹھنا اور اچھے بھلے کپڑے خراب کر لینا کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ چونکہ ماسٹر صاحبان کا احترام ہماری گھٹی میں پڑا ہوا تھا [ہائی سکول میں استاد کو ماسٹر کہا جاتا تھا]، ہم کبھی شکوہ شکایت نہیں کرتے تھے۔ دھوپ میں کرسی پر بیٹھتے ہی وہ اونگھنے لگتے اور کبھی کبھار کراڑے بھی مارنے لگتے (خراٹے لینے لگتے)۔ ہم زمین پر بیٹھے محاورۃً نہیں، حقیقتاً مکھیاں مارتے، پہیلے ہولے ہولے، پھر اونچے اونچے باتیں کرتے، لطیفے سناتے اور بعض اوقات آپس میں 'گھسن مکی' (گلم گلا) ہو جاتے۔ ماسٹر صاحب ہڑبڑا کر اٹھتے، ہمیں ڈانٹ پلاتے اور پڑھانا شروع کر دیتے۔ ویسے وہ انتہائی شریف النفس انسان تھے۔ اپنی جسمانی کمزوری کے باوجود انھوں نے ہمارا کورس پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا اور ہمیں انگریزی خوانی کے راستے پر ڈال دیا۔

سینئر کلاس میں ہمارے استاد شیخ فضل الٰہی تھے۔ گورے چٹے، لمبے تڑنگے اور تن و توش میں قدرے بھاری۔ وہ امرتسر کے کشمیری تھے [اس زمانے میں ہم امرتسر کو امبر سر کہا کرتے تھے]۔ دیہاتوں میں کرائے پر مکان نہیں ملتے، چنانچہ انھوں نے اپنی رہائش قریبی قصبے شاہ کوٹ میں رکھی ہوئی تھی۔ شیخ فضل الٰہی پڑھاتے تو بہت اچھا تھے مگر اس کے ساتھ ہی سخت گیر بھی بہت تھے۔ وہ معمولی سی غلطی پر بھی سزا دینے سے چوکتے نہیں تھے۔ وہ ''بگڑیوں تگڑیوں'' کو ٹھیک کرنے کے لیے ڈنڈا استعمال نہیں کرتے تھے، اس کی بجائے وہ قصوروار طالب علم کے ایک ہاتھ کی انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کے مابین اپنی پنسل پھنسا کر کچھ اس انداز سے مروڑی (بل) دیتے تھے کہ شدت درد سے بے چارے کی چیخیں نکل جاتی تھیں۔ ایک دن انھوں نے اپنے معمول کے خلاف ایک اپنے سے بھی لمبے تڑنگے لڑکے کے گال پر تھپڑ رسید کر دیا۔ معلوم نہیں اس طالب علم کو کیا ہوا، شاید اس کے ساتھ جن چمٹا ہوا تھا، اس نے جوابی وار کیا اور ماسٹر صاحب کے منہ پر پوری قوت سے گھونسا مار دیا۔ ہم سب طالب علموں پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ ماسٹر صاحب اپنا رخسار سہلانے لگے۔ وہ طالب علم چشم زدن میں کلاس روم سے فرار ہو گیا اور دوبارہ کبھی نظر نہ آیا۔

جس سال میں نے سینئر کلاس ختم کی، عبدالعزیز خالد نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ وہ پوری یونیورسٹی میں سوم آیا تھا۔ اس زمانے میں میٹرک کا امتحان پنجاب یونیورسٹی لیا کرتی تھی، کوئی للو پنجو بورڈ نہیں۔ یونیورسٹی کا دائرہ کار گوڑگاؤں سے اٹک تک اور انبالے سے ڈیرہ غازی خان تک پورے غیر منقسم پنجاب میں پھیلا ہوا تھا۔ یہی نہیں ریاست جموں و کشمیر، شمال مغربی سرحدی صوبہ (موجودہ خیبر پختونخواہ) اور بلوچستان بھی اس کی عملداری میں آتے تھے۔ پھر مقابلے میں ہندو، سکھ اور عیسائی بھی تھے۔ ایسے میں کسی دیہاتی ہائی سکول کے طالب علم کا پوری یونیورسٹی میں تیسری پوزیشن حاصل کرنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں

تھا۔ پہلی دونوں پوزیشنیں ڈی اے وی (دیانند آیورویدک) ہائی سکول لاہور کے طلبا کی تھیں۔

## 42

مولوی پیر محمد کے بعد ننگل انبیا گاؤں کی دوسری سربرآوردہ شخصیت (سابق وزیراعظم) چودھری محمد علی کی تھی۔ معلوم نہیں یہ سچ ہے یا حاسدوں کی پھیلائی ہوئی محض افواہ تھی مگر مشہور یہی تھا کہ غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر ان کی والدہ نے خودکشی کر لی تھی، اس لیے لوگ انھیں عموماً محمد علی چھاہا لینی (تلفظ: بے نی) والی دا (خودکشی کرنے والی) کا بیٹا کہا کرتے تھے۔ پتا نہیں انھیں تعلیم حاصل کرنے کے لیے کیا کیا کشٹ اٹھانا پڑے تھے مگر حقیقت یہی ہے کہ انھوں نے نہ صرف خود اعلیٰ تعلیم حاصل کی [وہ کیمسٹری میں ایم ایس سی تھے اور کچھ عرصہ اسلامیہ کالج لاہور میں لیکچرر بھی رہے تھے] بلکہ اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں ذوالفقار علی اور احمد علی کو بھی لکھایا پڑھایا اور ملازمتیں حاصل کرنے میں ان کی مدد کی۔ ذوالفقار علی تو بطور انکم ٹیکس کمشنر ریٹائر ہوئے [عبدالعزیز خالد کے مربی بھی وہی تھے]۔ احمد علی بھی کسی بڑے سرکاری عہدے پر پہنچے۔ خود چودھری صاحب نے آل انڈیا کمپیٹیشن (مقابلے کا امتحان) میں حصہ لیا اور ملٹری اکاؤنٹس کے لیے منتخب ہوئے۔ جس زمانے میں میں ہائی سکول کا طالب علم تھا، چودھری صاحب اس محکمے میں ایڈوائزر (advisor) کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔ یہ سب سے بڑا منصب تھا جس پر اس محکمے کا کوئی ملازم پہنچ سکتا تھا۔ ان سے پہلے یہ ہمیشہ کسی انگریز کے پاس ہوتا تھا۔ اس وقت کہا جاتا تھا کہ چودھری صاحب کی تنخواہ -/2700 روپے ہے۔ اتنی زیادہ تنخواہ کا سن کر لوگ دانتوں میں انگلیاں داب لیا کرتے تھے۔ [تب لیکچرر کی تنخواہ محض ساٹھ روپے ہوتی تھی۔]

چودھری صاحب بیٹ کے لوگوں پر بہت شفقت فرمایا کرتے تھے۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد جس لڑکے کو کوئی ملازمت نہیں ملتی تھی یا اس کے وسائل اسے مزید تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے، وہ دلی میں ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا اور وہ اسے اپنے محکمے میں کلرک وغیرہ بھرتی کرا دیتے لیکن قیام پاکستان کے بعد جب وہ مرکزی حکومت کے سیکرٹری جنرل (یعنی بیوروکریسی کے مدارالمہام) مقرر ہوئے، انھوں نے کسی کی بھی، خواہ وہ کتنا ہی ضرورت مند ہوتا، مدد کرنے سے صاف انکار کرنا شروع کر دیا۔ ان کا استدلال تھا کہ تقسیم ہند سے پہلے کے حالات مختلف تھے۔ مسلمان پس ماندہ تھے اور ان کا مقابلہ غیر مسلموں سے تھا جو تعلیم کے شعبے میں ان سے کہیں آگے تھے۔ اب وہ صورت حال نہیں رہی،

سب لوگ برابر ہیں اور سب کو استحقاق (merit) کی بنا پر ملازمتیں ملنا چاہئیں۔

چودھری صاحب کا مستقل ٹھکانا تو دلی تھا مگر کبھی کبھار اپنے گاؤں اور ہمارے سکول کا چکر لگا جاتے تھے۔ [میری ان کے ساتھ واحد ملاقات سکول میں ہی ہوئی تھی۔] وہ دلی سے شام کو کسی میل یا ایکسپریس ٹرین میں سوار ہوتے اور اگلے روز علی الصبح لدھیانہ پہنچ جاتے۔ وہاں سے انھیں براستہ موگا فیروزپور جانے والی گاڑی پکڑنا ہوتی۔ وہ اپنا تھری پیس سوٹ، ٹائی اور بوٹ اتارتے، سادہ قمیص، لٹھے کی چادر اور دیسی جوتی پہن لیتے۔ کھڑکی سے انٹر کلاس کی ٹکٹ خریدتے [اس زمانے میں ریل گاڑیوں کے چار قسم کے ڈبے ہوتے تھے: فرسٹ، سیکنڈ، انٹر اور تھرڈ۔ برانچ لائنوں پر چلنے والی گاڑیوں میں صرف انٹر اور تھرڈ ہوتی تھی۔ حالانکہ وہ دلی سے فرسٹ کلاس کے ڈبے میں بیٹھتے تھے مگر اس برانچ لائن پر فرسٹ کلاس ہوتی بھی، تو بھی وہ انٹر کلاس میں ہی سفر کرنے کو ترجیح دیتے۔] اور ڈھچک ڈھچک چلنے والی گاڑی میں سوار ہو جاتے۔ جب گاڑی ملسیاں شاہ کوٹ پہنچتی، وہ تانگہ پکڑتے اور کچی دھول سے اٹی ہوئی سڑک پر چلتے اپنے گاؤں پہنچ جاتے۔ ان کا آبائی مکان ابھی تک کچا تھا۔ اس میں ان کی کوئی پھوپھی وغیرہ رہتی تھی۔ بہت جلد ان کی آمد کی خبر ان کے اپنے گاؤں میں ہی نہیں بلکہ اردگرد کے دیہاتوں تک پہنچ جاتی اور ان سے ملنے والوں کا تانتا بندھ جاتا۔ زمین پر دری یا کھیس بچھا دیا جاتا اور باقی لوگوں کی طرح وہ بھی اس پر پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتے۔ لوگوں کی باتیں اور مسئلے سنتے۔ اگر کوئی مسئلہ حل کرا سکتے، اس کے حل کرانے کا وعدہ کر لیتے، البتہ جو نوجوان ملازمت کی تلاش میں ان کے پاس آتے، انھیں دلی میں اپنی کوٹھی پر پہنچنے کی ہدایت کرتے اور اپنے محکمے میں کہیں نہ کہیں کھپا دیتے۔

چودھری صاحب اپنے بیوی بچوں کو کبھی اپنے ساتھ گاؤں نہیں لاتے تھے۔ عام روایت یہ تھی کہ جب انھوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا، انھوں نے یہ شرط عاید کر دی کہ وہ صرف اس لڑکی کو اپنی رفیق حیات بنائیں گے جو کم از کم غالب کا شعر سمجھ سکتی ہو۔ صاف ظاہر ہے اس زمانے کے دیہات میں اس قسم کی دوشیزہ کا ملنا امر محال تھا۔ آخر کار انھوں نے امرتسر کے کسی کشمیری گھرانے کی خاتون سے نکاح کر لیا۔ پتا نہیں یہ رشتہ کسی واقف کار نے کرایا تھا یا دیہات کے عام لوگوں کے بقول ان کا ''آنکھ مٹکا'' ہو گیا تھا۔

چودھری صاحب قدرے دراز قامت تھے اور ان کا بدن چھریرا تھا۔ ان کا رنگ گورا تو نہیں تھا لیکن سانولا بھی نہیں تھا، بس پنجاب کے عام لوگوں کی طرح گندمی تھا۔

جب قیام پاکستان سے ایک ڈیڑھ سال پہلے آل انڈیا مسلم لیگ مرکزی حکومت میں شامل ہوئی، اس کے پانچ وزرا میں سے لیاقت علی خاں وزیر خزانہ مقرر ہوئے۔ لیاقت علی خاں کو اقتصادیات کی ابجد کا بھی

علم نہیں تھا اور آل انڈیا کانگرس نے مسلم لیگ کو بااصرار یہ محکمہ سونپا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ لیاقت علی خاں بجٹ بھی ڈھنگ کا نہیں بنا سکیں گے اور یوں مطالبۂ پاکستان کے غبارے سے ہوا نکل جائے گی۔ مرکزی کابینہ میں مختلف جماعتوں سے، جن کا آپس میں ''اِٹ کتے'' کا بیر تھا، تعلق رکھنے والے بھانت بھانت کے لوگ شامل تھے۔ وزیراعظم تھا کوئی نہیں اور یوں کابینہ کی مجموعی ذمے داری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ہر وزیر جو چاہتا، کرتا اور اپنے ساتھی وزیروں کو اس کی ہوا بھی نہ لگنے دیتا۔ معلوم نہیں لیاقت علی خاں کا تعارف چودھری محمد علی سے کیسے ہوا تھا مگر یہ تعارف ہو گیا اور لیاقت علی خاں کے ایما پر چودھری صاحب نے 1947 کا مرکزی بجٹ تیار کر دیا مگر کانگرس کے وزرا کو بجٹ پیش کیے جانے کے وقت تک اس کی بھنک تک نہ پڑنے دی۔ جب بجٹ پیش کیا جا رہا تھا، کانگری وزرا کے پسینے چھوٹنے اور ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ مہاتما گاندھی مدتوں سے اپنے صوبے گجرات میں نمک سازی پر محصول کے خلاف تحریکیں چلاتے اور ستیہ گرہ کرتے چلے آ رہے تھے، چودھری صاحب نے ان کی یہ خواہش تو پوری کر دی مگر اس کے ساتھ ہی ان لوگوں پر، جنھوں نے جنگ عظیم دوم میں ٹھیکوں وغیرہ سے بھاری کمائیاں کی تھی، ان پر اتنے بھاری ٹیکس لگا دیے کہ ان کی چیخیں نکل گئیں اور ساتھ ہی مرکزی اسمبلی کے ارکان بھی بے حد ناراض ہوئے کیونکہ کانگرس اور ان سب کا کاروبار انھیں سرمایہ داروں کے چندوں پر چلتا تھا۔ اس بجٹ کو اخباروں میں غریب آدمی کا بجٹ (poor man's budget) کہا گیا۔ کانگرس کچھ بھی نہ کر سکی، اسے کڑوی گولی نگلنا اور بجٹ پاس کرنا پڑا۔

## 43

1944 میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد عبدالعزیز خالد لاہور چلا گیا اور اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) میں داخل ہو گیا۔ وہاں وہ اپنے انگریزی کے استاد رفیق خاور کے ہتھے چڑھ گیا۔ رفیق خاور ڈاکٹر محمد صادق [جن سے بعد میں میں نے ایم اے میں انگریزی پڑھی اور جنھوں نے انگریزی میں اردو ادب کی تاریخ اور مولانا محمد حسین آزاد پر تحقیقی مقالہ لکھا تھا] اور اپنے زمانے کے نظم معریٰ کے اچھے شاعر تصدق حسین خالد کے بھائی تھے۔ خالد کا رجحان پہلے ہی مشکل پسندی کی طرف تھا، رفیق خاور کی صحبت نے اسے بالکل ہی کریلا اور نیم چڑھا بنا دیا۔ رفیق خاور نے ایک اور زیادتی یہ کی کہ انھوں نے خالد کو بائرن اور شیلی کے منظوم ڈراموں کے منظوم تراجم کے کار لاحاصل پر لگا دیا۔ بائرن اور شیلی دونوں انگریزی کے عظیم شاعروں

میں شمار ہوتے ہیں اور ادب کی رومانی تحریک میں ان کا اہم مقام ہے۔ لیکن ڈرامے اور وہ بھی منظوم، ان کی خود انگلستان میں کوئی خاص قدر نہیں ہوتی۔ اردو والوں کو شاید معلوم ہی نہ ہو کہ وہ ڈرامے بھی لکھتے تھے۔ خالد کا وقت بھی ضائع ہوا اور ٹیلنٹ بھی۔

## 44

نویں جماعت میں پہنچے، اساتذہ بھی نئے تھے اور بعض دوست بھی نئے ملے۔

ہماری کلاس کے دو سیکشن تھے۔ ہمارے سیکشن کو انگریزی پڑھانے کے لیے ماسٹر ہدایت اللہ سحر مقرر ہوئے۔ ریاضی ہیڈ ماسٹر صاحب چودھری غلام علی نے اپنے پاس رکھ لی۔ چودھری غلام علی بڑی بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا قد دراز مگر جسم قدرے بھاری تھا۔ وہ نواب آف کالا باغ کی طرح کلف لگی طرے دار پگڑی پہنتے تھے جس سے ان کی شخصیت کو چار چاند لگ جاتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ہمیشہ ڈنڈا ہوتا تھا مگر اسے استعمال کرنے کی نوبت شاذ ہی کبھی آتی تھی۔ وہ دریائے ستلج کی جنوبی جانب ضلع لدھیانہ کی تحصیل جگراؤں کے ایک خاصے بڑے گاؤں تہاڑا کے رہنے والے تھے۔ [اردو کے معروف صحافی اور افسانہ نگار حمید اختر کا تعلق بھی اسی گاؤں سے تھا۔] بظاہر وہ بہت سخت گیر تھے [ان کے زمانے میں سکول کا نظم و ضبط مثالی تھا] مگر اصلاً دل کے نرم اور رویے میں بہت شفیق اور ہمدرد تھے۔ تازہ ترین واقعات سے باخبر رہنے کے لیے سکول کے لیے ایک ریڈیو خریدا گیا تھا جو ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں پڑا رہتا تھا۔ تفریح کے گھنٹے کے دوران میں اس پر اساتذہ نہ صرف خبریں بلکہ آل انڈیا ریڈیو لاہور کا فلمی موسیقی کا پروگرام "آپ کی فرمائش" بھی سنا کرتے تھے۔ ایک روز میں کسی کام کے سلسلے میں وہاں چلا گیا۔ جب میں چک اٹھا کر کمرے میں داخل ہوا، ملکہ پکھراج کی آواز گونج رہی تھی، ان کا مشہور ترین گیت "ابھی تو میں جوان ہوں" چل رہا تھا۔ میرے قدم وہیں جکڑے گئے اور میں گانا ختم ہونے تک دروازے کے قریب ہی کھڑا رہا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب سمیت سب اساتذہ گانا سننے میں اتنے محو تھے کہ کسی کو بھی میری آمد کا علم نہ ہو سکا۔ مجھے توقع تھی کہ میں جو منہ اٹھائے بلا اجازت کمرے میں داخل ہو گیا تھا، اس پر اور کچھ نہیں تو اچھی خاصی ڈانٹ ضرور پڑے گی، مگر جب گیت کے اختتام پر ہیڈ ماسٹر صاحب کی مجھ پر نظر پڑی، انھوں نے بڑی ملائمت اور شفقت سے مجھے اپنے پاس بلایا اور آنے کی غرض پوچھی۔

قیام پاکستان کے بعد وہ کمالیہ کے قریب پیر محل میں آباد ہو گئے۔ جب میں روزنامہ "آفاق" میں

کام کرتا تھا، وہ ایک روز مجھے ملنے چلے آئے۔ ان کی آن بان شان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، ان کی پگڑی کا شملہ اب بھی اسی طرح لہرا رہا تھا۔

قد و قامت کے اعتبار سے ماسٹر ہدایت اللہ سحر چودھری غلام علی کے بالکل نقیض (anti-thesis) تھے مگر ان کی زبان کی حلاوت اور شیرینی ہمیشہ کانوں میں رس گھولتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ غضب کے استاد تھے۔ میں نے انھیں جلال میں آتے اور کسی طالب علم کو جسمانی سزا دیتے کبھی نہیں دیکھا، بس پیار اور شفقت سے سمجھا دیتے یا پھر کبھی کبھار ہلکی پھلکی سرزنش کر دیتے۔ وہ بھی خوش، ان کے فرشتے اور شاگرد بھی خوش۔ انھوں نے ادب کا بہت اچھا ذوق پایا تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے وہ شاعر بھی تھے، مگر ان کی شاعری کیسی تھی میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ شاگرد ہونے کے ناتے میں نے ان سے اپنے اشعار سنانے کی فرمائش کا حوصلہ کبھی نہیں کیا تھا۔ ایک زمانے میں وہ لاہور میں رہتے تھے۔ تب علامہ اقبال بقیدِ حیات تھے۔ چند نوجوانوں نے جن میں سحر بھی شامل تھے، لاہور کے کالجوں کے مسلم طلبا پر مشتمل ایک انجمن بنام انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ (Inter Collegiate Muslim Brotherhood) بنائی اور علامہ اقبال کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے اس کے زیرِ اہتمام ایک خاصے بڑے جلسے کا اہتمام کیا۔ اس جلسے میں اس زمانے کے بعض بڑے ادیبوں مولانا صلاح الدین احمد، مولانا عبدالمجید سالک، پروفیسر حمید احمد خاں، پنڈت ہری چند اختر وغیرہ نے مقالے پڑھے جو بعد میں "مضامینِ یومِ اقبال" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ کتاب کے آخر میں انجمن کے عہدے داروں اور ارکان کا گروپ فوٹو شامل تھا۔ کرسیوں پر جو حضرات تشریف فرما تھے، ان میں سحر بھی شامل تھے۔ وہ انجمن کے سیکرٹری تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ کتاب مجھے ایک ریڑھی پر مل گئی۔ ہندو اور سکھ اپنے گھروں میں لاتعداد کتابیں چھوڑ گئے تھے جن میں بے شمار بہت اچھی تھیں۔ بدقسمتی سے ان کے گھروں میں آباد ہونے والے اکثر مسلمانوں نے ان کی کوئی قدر نہ کی، چنانچہ ان میں سے بیشتر ریڑھیوں پر پہنچ گئیں۔ اس زمانے میں پرانی کتابوں کا دھندا زیادہ تر ریڑھیوں پر ہوتا تھا۔ ان ریڑھیوں کے مالک زیادہ تر ان پڑھ تھے، انھیں کتاب کی اہمیت کا کوئی علم نہیں تھا، یوں وہ اسے کوڑیوں کے مول فروخت کر دیتے تھے۔ مجھ میں جتنی سمجھ اور مالی سکت تھی، اس کے مطابق میں نے بھی چند ایک کتابیں خرید لیں۔ ان میں "مضامینِ یومِ اقبال"، گاندھی جی کی خود نوشت سوانحِ حیات اور پنڈت جواہر لال نہرو کی "ڈسکوری آف انڈیا" بھی شامل تھیں۔ ایک بہت ضخیم کتاب، جو جہازی سائز میں آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی تھی، ہندوستانی اداکاروں اور اداکاراؤں کی تصویروں پر مشتمل تھی۔ یہ تمام کتابیں ایک ایک کر کے

دوست یار عار دلا کے گئے اور کسی نے بھی انھیں واپس کرنے کا تکلف نہ کیا۔

ماسٹر ہدایت اللہ سحر جس گاؤں کے باسی تھے، ہمارے نائب ہیڈ ماسٹر غلام محمد بھی وہیں کے رہائشی تھے۔ وہ ہیڈ ماسٹر بننے کے بہت متمنی تھے۔ وہ اسے اپنا حق سمجھتے تھے مگر جب سکول کی انتظامیہ نے انھیں نظر انداز کر کے چودھری غلام علی کو ہیڈ ماسٹر مقرر کر دیا، انھیں سخت دھچکا پہنچا اور وہ قدرے چڑچڑے ہو گئے۔ یوں دونوں کے تعلقات میں شروع ہی میں جو دراڑ پڑی تھی، وہ کبھی ٹھیک نہ ہو سکی۔ وہ استاد تو ریاضی کے تھے مگر انگریزی میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ وہ انگریزی انتہائی روانی سے اور بے تکان بولتے تھے، پہروں بول سکتے تھے اور بولتے تھے۔ سکول میں کوئی فنکشن ہو یا باہر سے کوئی مہمان آیا ہو جسے اردو یا پنجابی میں گفتگو کرنے میں وقت پیش آتی تھی اور انگریزی میں سہولت محسوس ہوتی تھی، ایسے مواقع پر صرف ماسٹر غلام محمد کام آتے تھے۔ تحریک پاکستان زور شور سے چل رہی تھی اور 1946 کا الیکشن سر پر آ گیا تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے صرف سرکردہ رہنما ہی نہیں بلکہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے عہدے دار اور ارکان بھی بے حد فعال تھے۔ ایک مرتبہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن جالندھر کے چند عہدے دار گھومتے پھرتے ہمارے سکول آ نکلے۔ ان مسخروں کو پتا نہیں کیا سوجھی کہ انھوں نے ہم دیہاتیوں کو انگریزی میں مخاطب کرنا مناسب سمجھا۔ یہ فیشن تھا، احساس کمتری تھا، اپنی اہمیت جتانے کا احساس تھا یا تقریروں ہی کا گھونٹ لگا رکھا تھا، پتا نہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہے۔ چنانچہ ان کی تقریریں طلبا کے سر سے گزر گئیں، تاہم ماسٹر غلام محمد نے جو جوابی تقریر کی، وہ خاصی آسان زبان میں تھی، پھر ان کا لہجہ بھی جانا پہچانا تھا، چنانچہ وہ اکثر طلبا کی سمجھ میں آ گئی اور خوب تالیاں بجیں۔

ماسٹر غلام محمد نے سکول میں "بزم ادب" بھی قائم کر رکھی تھی۔ انھوں نے دسویں جماعت میں از رہِ شفقت مجھے اس کا سیکرٹری مقرر کر دیا۔ بزم ادب کے جلسوں میں مضمون وغیرہ تو عام طور پر اردو میں پڑھے جاتے تھے مگر مجھے حکم تھا کہ میں ساری کارروائی انگریزی میں لکھوں اور میں اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں لکھ بھی دیا کرتا تھا جس پر وہ عموماً صاد کر دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مرتضیٰ احمد میکش کے ایک بھتیجے نے "جھینگر کا جنازہ ہے، ذرا دھوم سے نکلے" کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا۔ یہ اتنا خوبصورت اور پر از مزاح تھا کہ ہم نہ صرف محظوظ ہوئے بلکہ متاثر بھی بہت ہوئے۔ ہمیں بہت بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے اصل مصنف تو خواجہ حسن نظامی تھے مگر ہمارے دوست نے اسے یوں پیش کیا جیسے یہ اس کے اپنے زور قلم کا نتیجہ ہو۔

ماسٹر غلام محمد اور ماسٹر ہدایت اللہ سحر دونوں کا انجام بے حد tragic (المناک) ہوا۔ وہ دونوں جس گاؤں میں رہتے تھے، وہ ضلع انبالہ سے کوئی خاص دور نہیں تھا، مگر واقع ضلع ہی میں تھا۔ چونکہ یہ بیٹ کے

مقابلے میں بہت اونچائی پر تھا، چنانچہ وہاں پانی بہت گہرائی میں ملتا تھا، اتنا زیادہ گہرائی میں کہ کنوئیں میں جھانکی مارنے پر بمشکل نظر آتا تھا۔ جب ریڈکلف ایوارڈ کا اعلان ہوا، آناً فاناً فضا یکسر تبدیل ہو گئی۔ مسلمانوں کو کسی پیشگی وارننگ کے بغیر اپنے گھروں سے نکلنا پڑا۔ میرے یہ اساتذہ کرام ہجرت کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک اطلاع ملی کہ سکھوں کا بہت بڑا جتھا ان پر حملہ کرنے آرہا ہے [اس علاقے میں سکھ اکثریت میں تھے]۔ سب کے ہوش و حواس اڑ گئے۔ ماسٹر صاحبان اپنی عزتیں بچانے کے لیے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کنوئیں میں کود گئے۔ جن لوگوں نے مقابلہ کرنے یا بھاگنے کی کوشش کی انھیں سکھوں نے گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا۔ مجھے اس بھیانک واقعے کی اطلاع نکودر کیمپ میں ملی۔ کئی دن میری آنکھیں نم ناک رہیں۔



## 45

نویں جماعت میں متعدد نئے دوست ملے۔ بشیر احمد بگو: کہ اس کا رنگ بے حد چٹا تھا، بالکل انگریز لگتا تھا، اس لیے سب دوست اسے بگو کہتے تھے۔ بہت اچھی گپ مارتا تھا۔ بی اے کرنے کے بعد پولیس میں بھرتی ہو گیا تھا۔ عبدالمجید خستہ: اس نے اپنے نام کے ساتھ خستہ کیوں لگایا حالانکہ اس میں خستگی کی کوئی بات نہیں تھی۔ بہت پیارا آدمی تھا، بہت پیاری باتیں کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ہمارے مابین کوئی غلط فہمی ہو گئی۔ اسے منانے کے لیے میں نے اسے انگریزی میں خط لکھا۔ گرامر کی کتاب کھولی، اس میں سے جتنے محاورے خط میں کھپا سکتا تھا، وہ میں نے کھپا دیے۔ بہت محظوظ ہوا، پھر ہمارے تعلقات میں کبھی دراڑ نہ آئی۔ اس نے کیمسٹری میں ایم ایس سی کیا۔ ملازمت کی تلاش میں ڈیرہ اسمٰعیل خاں چلا گیا اور ساری بقایا زندگی وہیں گزار دی۔ پہلے گورنمنٹ کالج میں اور بعد میں یونیورسٹی میں پڑھاتا رہا۔ شوکت علی: ہیر بہت اچھی پڑھتا تھا اور بعض اوقات چن چن کر فحش شعر سناتا تھا۔ اس نے مختلف اخبار میں ڈرافٹسمین کے طور پر ملازمت اختیار کی اور ریٹائرمنٹ تک ڈرافٹسمین کا ڈرافٹسمین ہی رہا۔ ساہی وال میں ہم دونوں اکٹھے ہو گئے۔ اکثر گپ شپ رہتی۔ ایک مرتبہ اس کے دفتر میں میں نے اس کے ایک رفیق کار سے پوچھا: "تم لوگ اتنی کرپشن کیوں کرتے ہو؟" جواب ملا: "سرکار دا پیسا اے۔ کھائیں آں، تہاڈا ڈھڈ کیوں دکھدا اے؟"

ست پرکاش: شاہ کوٹ کا رہنے والا تھا۔ گورا چٹا، گول مٹول۔ اس کی شہرت بہت ذہین اور قابل طالب علم کی تھی۔ وہ میرا سب سے بڑا حریف بھی تھا اور حلیف بھی مگر جب میٹرک کے امتحان کا نتیجہ آیا،

وہ مجھ سے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ جب میں اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوا ہماری آپس میں خط کتابت شروع ہوگئی جو پاکستان بننے کے بعد بھی کافی مدت جاری رہی۔ ہم ایک دوسرے کو پوسٹ کارڈ لکھتے تھے کہ سستا پڑتا تھا، دو پیسے میں آ جاتا تھا۔ اس کا باپ کسی نہری علاقے میں اوورسیر تھا۔ ہیٹ کے اکثر دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی اپنے بیوی بچوں کو ساتھ نہیں رکھتا تھا، پیچھے چھوڑ جاتا تھا کیونکہ یہاں تعلیم کا انتظام اچھا تھا۔ تقسیم کے بعد اسے بھی افراتفری میں بھاگنا پڑا اور وہ اپنے ساتھ کچھ بھی نہ لے جا سکا۔ ست پرکاش اپنے ہر خط میں پرزور شکوہ کرتا رہتا تھا کہ اس کے باپ کے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔ میں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ ظلم سب کے ساتھ ہوا ہے، مگر وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا اور نہ کبھی سمجھا۔

کرتار سنگھ: بالکل لولا لڑکا تھا۔ جماعت کے اکثر لڑکوں کی طرح اس کی بھی ابھی مسیں نہیں بھیگی تھیں۔ رنگ گندمی اور جسم دبلا پتلا۔ بے حد بھلا مانس تھا، اتنا بھلا مانس کہ مجھے اس جیسا کبھی کوئی دوسرا نہیں ملا۔ جس طرح مسلمان اپنے بچوں کو کم از کم ناظرہ قرآن پڑھانا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں، سکھ بھی اپنے بچوں کو اپنی مذہبی کتاب گروگرنتھ کی تعلیم دینا لازمی خیال کرتے ہیں۔ گروگرنتھ گورمکھی اکھروں میں لکھی ہوئی ہے۔ کرتار سنگھ گورمکھی بہت اچھی جانتا تھا۔ میں نے چند دن اس سے گورمکھی پڑھی، پھر میرا شوق پورا ہوگیا اور یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ اب مجھے چند ابتدائی حروف اُوڑا، ایڑا، ایڑی کے سوا کچھ بھی یاد نہیں۔

سکھوں کے ساتھ ہمارے خاندان کے تعلقات ہمیشہ دوستانہ رہے۔ ابا اکثر اپنے سکھ دوستوں کے ہاں آتے جاتے رہتے تھے اور وہ ہمارے ہاں۔ بعض اوقات وہ رات کو بھی ہمارے ہاں ٹھہر جاتے۔ وہ ہمارے گھر کا پکا کھانا کبھی نہیں کھاتے تھے، خشک راشن ضرور لے لیتے تھے لیکن پکاتے خود ہی تھے۔ حلال گوشت ان کے لیے ممنوع تھا، صرف جھٹکا کھاتے تھے۔ مسلمانوں کے گاؤں میں جھٹکا کہاں، چنانچہ انھیں صرف دالوں اور سبزیوں پر گزارہ کرنا پڑتا، البتہ اپنا مُرغا اپنے ساتھ لے کر آتے تھے۔

انعام الحق کوثر: وہ قریبی گاؤں کنیاں خرد سے آتا تھا۔ اسے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ تقریر بھی اچھی کر لیتا تھا۔ اس کے ساتھ بہت زبردست دوستی ہوئی جو قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رہی۔

ہمارے سکول میں ایک اردو کے استاد ہوا کرتے تھے، ان کا اسم گرامی آغا صادق تھا۔ بہت ہی بھلے آدمی تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ منظور سعید مراثی کے قریبی رشتے دار تھے لیکن منظور سعید کی طرح ان کی شاعری بس واجبی سی تھی۔ میرے نویں جماعت میں پہنچنے سے ایک آدھ سال پہلے وہ کوئٹہ کے گورنمنٹ کالج میں بطور لیکچرر تعینات ہو کر جا چکے تھے۔ ڈیڑھ دو سال بعد انھوں نے کوثر کے بڑے بھائی انور رومان کو بلا لیا جس نے نیا نیا اردو میں ایم اے کیا تھا اور اسے بھی اپنے کالج میں لیکچررشپ دلا دی۔ قیام پاکستان کے بعد

کوثر نے اپنے بھائی کی تقلید میں اردو میں ایم اے کیا اور کوئٹہ سدھار گیا۔ وہیں اس نے اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، ڈاکٹر کہلایا اور "بلوچستان میں اردو" کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی جس کا پنجاب میں بھی بہت دنوں تک چرچا رہا۔

# 46

غلام رسول فردوسی پرجیاں خرد کے تھے۔ ان کے والد صاحب چیچہ وطنی کے قریب چک نمبر 45/12L کے مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ عام روش کے مطابق انھوں نے بھی اپنے فرزند ارجمند کو میٹرک کی تعلیم دلانے کے لیے منٹگمری انبالہ سکول کو ہی مناسب خیال کیا اور یوں فردوسی میرا کلاس فیلو بن گیا۔ اگرچہ نہری علاقوں کے گاؤں جو چکوک کہلاتے ہیں، اپنے نمبروں سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں مگر ان میں سے ہر ایک کا اپنا نام بھی ہوتا ہے۔ 45/12L کا نام فردوس تھا، اس لیے غلام رسول نے اپنے آپ کو غلام رسول فردوسی کہلانا پسند کیا۔ اس کا شمار بھی بہت ہونہار طلبا میں ہوتا تھا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں بھی ہم اکٹھے پڑھتے رہے۔ ایف ایس سی کے بعد اس نے سول انجینئرنگ میں بی ایس سی کی اور محکمہ انہار میں بطور ایس ڈی او (سب ڈویژنل آفیسر) ملازم ہو گیا۔ دوران ملازمت ہی میں وہ مغربی جرمنی چلا گیا اور وہاں کی کسی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی مگر پنجاب کا محکمہ انہار سب سے انوکھا ہے، اس میں گدھوں اور گھوڑوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا ہے۔ آپ خالی خولی بی ایس سی ہوں یا ڈی ایس سی (ڈاکٹر آف سائنس)، اگلے گریڈ میں ترقی باری آنے پر ہی ملتی ہے۔ فردوسی بھی لائن میں لگ گیا اور بالآخر بطور چیف انجینئر ریٹائر ہوا۔ رشوت کے نام سے ہی اس کے پسینے چھوٹنے لگتے تھے، اس لیے فیلڈ کی بجائے ملازمت کا بیشتر عرصہ محکمے کے ریسرچ اور ڈیزائن کے شعبوں میں گزار دیا۔ فردوسی اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ اس کی دانے وال والے وہندوں کے خاندان کی جس لڑکی سے شادی ہوئی، وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ جب شادمان کی تعمیر شروع ہوئی، اس کے سسر نے جیل روڈ پر لاہور کالج فار ویمن کے سامنے ڈیڑھ کنال کا پلاٹ خریدا اور اس میں اپنا مکان بنا لیا۔ فردوسی آج کل اسی میں رہتا ہے۔ کبھی کبھی یاد اللہ ہو جاتی ہے۔

محمد شریف اور ولی محمد: دونوں ہمارے گاؤں سے ڈیڑھ دو میل دور جانب مشرق بالو کی خرد کے رہنے والے تھے۔ محمد شریف ریاضی اور سائنس کے مضامین میں بہت ماہر تھا۔ زرعی کالج لائل پور میں داخل ہوا،

وہیں سے ایم ایس سی اور پی ایچ ڈی کی اور وہیں ساری عمر پڑھاتا رہا۔ شادی میاں محمد افضل کی بیٹی سے ہوئی جو زرعی یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ میاں محمد افضل جنرل ضیا الحق کے قریبی عزیز تھے۔ ان کے دور میں میاں صاحب کا ستارہ انتہائی عروج پر پہنچ گیا۔ وہ یونیورسٹی گرانٹس کمشن کے چیئرمین اور وزیر تعلیم بنے۔ تعلیمی پالیسیاں بنانے میں ان کا بڑا عمل دخل تھا۔ ان کی دوسری بیٹی کی شادی گاؤں میں میری گلی کے رشید چڑی مر سے عرف رشید دوندی سے ہوئی تھی۔ رشید انجینئر تھا۔ امریکا میں رہتا ہے اور بہت دولت مند ہے۔ ولی محمد طالب علم تو مبارز سا تھا۔ میٹرک کرنے کے بعد وہ ریلوے میں بھرتی ہو گیا اور ساری عمر کلرکی کرتا رہا۔ اس کی بہنیں پراٹھے نہایت ہی عمدہ اور لذیذ بنایا کرتی تھیں۔ یہ تہہ در تہہ ہوتے تھے اور یہ تہیں اتنی باریک اور خستہ ہوتی تھیں کہ ہاتھ لگانے پر خود بخود ٹوٹنے لگتی تھیں۔ میں نے اس قسم کے پراٹھے پھر کبھی نہیں دیکھے۔ گرمیوں میں ہم چند دوست چھٹی کے بعد اکثر سکول میں بیٹھ کر اکٹھے پڑھا کرتے تھے۔ دوپہر کا کھانا گھر سے ساتھ لایا کرتے تھے اور وہیں یہ پراٹھے کھایا کرتے تھے۔

## 47

میٹرک میں یونیورسٹی نے نصاب میں انگریزی کی جو کتب شامل کیں، ان میں ایک انگریزی کی نسبتاً آسان آسان نظموں کا چھوٹا سا مجموعہ تھا۔ اس کا نام کیا تھا، مجھے یاد نہیں رہا، تاہم اتنا ضرور یاد ہے کہ ان میں ایک نظم آرتھر ہیوکلف (Arthur Hugh Cough) کی "Say Not The Struggle Naught Availeth" اور دوسری ولیم ورڈزورتھ کی "Daffodils" تھی۔ چونکہ دونوں ہی خاصی آسان تھیں، ہم جیسے دیہاتیوں کی سمجھ میں بھی آسانی سے آ جاتی تھیں۔ نثر کی کتابیں غالباً تین تھیں۔ ان میں سے دو نے بہت متاثر کیا۔ ایک تو کہانیوں کا مجموعہ تھا۔ کمال کا انتخاب تھا۔ اسے ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے مرتب کیا تھا۔ انھوں نے ہر کہانی کے آغاز پر مختصر اور دلکش تعارف بھی تحریر کیا تھا۔ کتاب کا آغاز برصغیر کی جاتک کہانیوں سے ہوا تھا۔ جاتک کہانیوں اور خود ڈاکٹر تاثیر سے تعارف وہیں ہوا تھا۔ ایک اور کہانی آر ایل سٹیونسن کی تھی۔ مارکھیم تھی یا "Travels with a Donkey" کا کوئی اقتباس۔

نثر کی دوسری کتاب منوسانی کی "Our India" تھی۔ منوسانی غالباً پارسی تھے۔ وہ مصنف ہی نہیں سیاست دان بھی تھے۔ آزادی کے بعد وہ بھارت کی لوک سبھا کا رکن منتخب ہوتے رہے۔ انھوں نے ہندوستان کے حالات، مسائل اور کمالات اتنے خوبصورت انداز سے بیان کیے تھے کہ آدمی کو اپنے

ہندوستانی ہونے پر فخر محسوس ہونے لگتا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں تحریک پاکستان بڑے زور شور سے چل رہی تھی اور ہم اس میں دل و جان سے شریک تھے، چنانچہ بعض اوقات ہم ردھے میں پڑ جاتے تھے، کس کی مانیں، کس کی نہ مانیں۔

انگلش گرامر پر مقبول ترین کتاب چودھری طفیل محمد، ہیڈ ماسٹر مسلم ماڈل ہائی سکول لاہور کی تھی۔ اسے مکتبہ اردو کے ذیلی ادارے پنجاب بک ڈپو نے شائع کیا تھا۔ اس کتاب میں اکثر باتیں اردو میں سمجھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ چودھری صاحب نے ترجمے کی کتاب بھی تحریر کی تھی اور تمام مشقیں خود ہی حل کردی تھیں۔ یہ ایک قسم کی spoon-feeding [کسی کو خود سوچنے کی زحمت سے بچانا] تھی اور یہی ان کتابوں کی مقبولیت کا راز تھا۔ ہمیں ماسٹر ہدایت اللہ سحر نے وی جی کیرنن (Victor Kiernen) کی گرامر کی کتاب تجویز کی۔ کیرنن اس زمانے میں ایچی سن کالج عرف چیفس کالج لاہور میں پڑھاتے اور فیض احمد فیض کی نظموں کے انگریزی میں ترجمے کیا کرتے تھے۔ 1938 میں انھوں نے معروف ہندوستانی رقاصہ تھیٹر ڈائریکٹر اور ڈراما نگار شانتا گاندھی کے ساتھ شادی کی تھی جو 1946 میں طلاق پر منتج ہوئی۔ جنگ کے بعد وہ واپس انگلستان چلے گئے اور ایڈنبرا یونیورسٹی میں 1977 تک تاریخ پڑھاتے رہے۔ وہ پکے کمیونسٹ تھے مگر 1956 میں ہنگری پر روس کے حملے کے بعد کمیونسٹ پارٹی سے علیحدہ ہو گئے۔ انھوں نے تاریخ اور ادب پر متعدد کتب تحریر کی تھیں جن میں "Eight Tragedies of Shakespeare : a Marxist Study" (1995) بھی شامل ہے۔ 1955 میں اقبال کی نظموں کا ترجمہ "Poems from Iqbal" کے نام سے چھپا۔ 17 فروری 2009 کو ان کے انتقال پر مختلف ممالک کے اخباروں میں ان پر تعزیتی مضامین شائع ہوئے ان میں طارق علی کا "Victor Kiernan : Marxist historian, writer and linguist who challenged the tenets of imperialism" بھی شامل تھا جو 20 فروری 2009 کو لندن کے اخبار Independent میں چھپا تھا۔ بائیں بازو کے مشہور مصنف Eric Hobsbawm کا مضمون گارڈین میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔

یہ میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے ان کی گرامر کی کتاب سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ میں نے اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اس کتاب کو کئی بار پڑھا اور انگریزی میں اپنا مافی الضمیر برا بھلا ادا کرنا سیکھا۔

اردو کی صرف ایک کتاب تھی اور اس کا نام "سرمایۂ اردو" تھا۔ بہت ضخیم تھی۔ اس میں اردو کے نثر اور نظم کے تقریباً سبھی نامور مصنفین کے رشحات فکر شامل تھے۔ اردو ادب سے اصل تعارف اسی کتاب کی وساطت سے ہوا۔ اسے مشہور محقق ڈاکٹر محمود شیرانی نے مرتب کیا تھا۔ کسی بھی کلاس کے لیے اس سے بہتر اور زیادہ خوبصورت انتخاب کبھی نہیں ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی یہ کئی سال شامل نصاب رہی، پھر

ایوب خاں کی تعلیمی اصلاحات کی زد میں آ گئی۔ حال ہی میں "سنگ میل" نے ڈاکٹر صدیق جاوید کے دیباچے کے ساتھ اسے عام لوگوں کے لیے دوبارہ شائع کیا ہے۔

ریاضی کی بہترین کتاب مانی تو ایک ہندو مصنف کی جاتی تھی [اس کا نام غالباً سیوک رام تھا] مگر ہمیں پڑھائی خواجہ دل محمد کی جاتی تھی۔ آخر مسلمان بھائی تھے۔ وہ اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر تھے اور 1939 تا 1942 اس کے پرنسپل بھی رہے۔ انھوں نے حساب، الجبرا اور جیومیٹری سبھی پر کتابیں تحریر کی تھیں۔ وہ نرے پرے ریاضی دان نہیں تھے، بلکہ فرصت کے لمحات میں شاعری سے بھی شغل فرماتے تھے۔ انھوں نے "بھگوت گیتا" کا غالباً منظوم ترجمہ بھی کیا تھا۔ [اس زمانے میں ایک اور سائنس دان جو اردو میں شعر کہتے تھے، وہ پنجاب یونیورسٹی کے کیمسٹری کے شعبہ کے پروفیسر ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر تھے۔ تقسیم کے بعد وہ بھارت چلے گئے، بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے اور کہا جاتا ہے کہ نوبل انعام جیتتے جیتتے رہ گئے۔] آج کے نوجوانوں نے شاید خواجہ دل محمد کا نام بھی نہ سنا ہو مگر دل محمد روڈ سے، جو دیال سنگھ کالج کی مشرقی جانب واقع ہے، اکثر لوگ واقف ہیں۔ خواجہ صاحب کا مکان اسی سڑک پر بنا ہوا تھا۔ اس زمانے کی بلدیہ لاہور نے خدا کا خوف کھا کر اس کا نام دل محمد روڈ رکھ دیا تھا۔

مجھے اور میرے دوستوں کو ریاضی کی نئی نئی مشقیں حل کرنے کا بڑا شوق تھا۔ بعض اوقات ہم جیومیٹری کے نئے کلیے دریافت کرنے کی بھی کوشش کرتے رہتے تھے۔ مثلاً جیومیٹری کا ایک کلیہ یہ تھا کہ پرکار کی مدد سے زاویہ قائمہ دو مساوی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ہم سوچتے تھے تین میں کیوں نہیں؟ مزید مشقوں کے لیے سیوک رام وغیرہ کی کتابیں تو ہماری دسترس میں نہیں تھیں مگر اس کا توڑ بھی ہم نے ڈھونڈ لیا۔ (مکتبہ) کتابستان والے "کتابستان" ہی کے نام سے میٹرک کے طلباء کے لیے ایک ماہانہ رسالہ شائع کیا کرتے تھے۔ ہم دوست چندہ بھیج کر اسے بذریعہ ڈاک منگوا لیا کرتے تھے۔ اس میں تقریباً ہر مضمون کی مشقیں اور اکثر کے جوابات بھی ہوتے تھے۔ جب اس کا جنوری 1946 کا شمارہ چھپ کر آیا ہم اس میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے [اور متاثر بھی بہت ہوئے] کہ اس میں سنٹرل ماڈل سکول لاہور کے ایک طالب علم کے ٹوماہی امتحان [یہ امتحان میٹرک کے امتحان کا داخلہ بھیجنے سے پہلے ہر سال سکول اپنے طور پر دسمبر میں لیا کرتا تھا] کے اردو اور فارسی کے پرچوں کے جوابات شامل اشاعت ہیں۔ اس طالب علم کا نام مظفر علی اثیر تھا جو بعد میں مظفر علی سید کے نام سے اردو کا نامی گرامی نقاد بن کر سامنے آیا۔ یہ میرا اس کے ساتھ، اگرچہ غائبانہ ہی، اولین تعارف تھا۔

انگلش، اردو اور ریاضی تینوں لازمی مضامین تھے، ہر ایک کے سو سو نمبر کے دو دو پرچے ہوتے تھے۔

ان کے ساتھ تاریخ اور جغرافیہ بھی لازمی مضمون تھے۔ اگرچہ یہ دونوں الگ الگ موضوعات پر بحث کرتے ہیں مگر پنجاب یونیورسٹی اسے ایک ہی مضمون شمار کرتی تھی۔ پرچے اس کے بھی دو ہی ہوتے تھے۔ تاریخ کے پرچے کے نوے جب کہ جغرافیہ کے ساٹھ نمبر ہوتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جغرافیہ کے مقابلے میں تاریخ کا نصاب بہت طویل تھا۔ اس میں آریاؤں کی آمد سے 1945 تک کے ہندوستان کی اور اس کے ساتھ ہی برطانیہ کی تاریخ پڑھنا پڑتی تھی۔ ہمارے نصاب میں برطانیہ کی جو تاریخ شامل تھی، اس کا آغاز ٹیوڈر خاندان کے ہنری ہشتم سے ہوتا تھا۔ یہ ہنری ہشتم کہاں سے آ ٹپکا اور ہشتم کیوں کہلاتا تھا، ہمارے لیے ایک راز سربستہ تھا۔ یہ تو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ٹیوڈر خاندان کے پہلے بادشاہ ہنری ہفتم کا بیٹا تھا۔ ہنری ہفتم جس زمانے میں پیدا اور جوان ہوا تب انگلستان کے تخت کے دعوے دار دو خاندان ہوتے تھے، ایک لنکاسٹر (Lancaster) اور دوسرا یارک (York) کہلاتا تھا۔ [لنکاسٹر اور یارک بالترتیب لنکا شائر اور یارک شائر کے تاریخی شہر بھی ہیں۔] دونوں ہی ایک قدیم بادشاہ ایڈورڈ سوم کے اخلاف تھے۔ 1399 سے 1461 تک لنکاسٹر برسراقتدار رہے۔ 1461 میں یارکوں کا پلہ بھاری ہو گیا۔ 1485 میں ہنری ہفتم کی [جس کا تخت پر کوئی حق نہیں بنتا تھا کیونکہ اس کا دادا یا پردادا حرامی تھا] فوجوں نے ایک مقام بوس ورتھ (Bosworth) پر یارکوں کو فیصلہ کن شکست دی۔ بادشاہ رچرڈ سوم ہلاک ہو گیا۔ بادشاہ بننے کے بعد ہنری ہفتم نے عقل مندی یہ کی کہ اس نے یارکوں کے پہلے بادشاہ ایڈورڈ چہارم کی بیٹی الزبتھ سے شادی کر لی۔ یوں دونوں خاندان، جو کئی سال آپس میں لڑتے بھڑتے رہے تھے، یک جا ہو گئے اور ٹیوڈر خاندان کی بنیاد پڑی۔ آپس کی لڑائیوں میں لنکاسٹروں کا نشان سرخ گلاب جب کہ یارکوں کا سفید گلاب ہوتا تھا۔ چنانچہ ان کی رعایت سے ان کی باہمی جنگوں کو Wars of Roses کا نام دیا جاتا ہے۔ آج بھی جب لنکا شائر اور یارک شائر کے مابین کوئی کرکٹ میچ ہوتا ہے، اس پر War of Roses کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ صدیوں پرانی رقابتیں اور عصبیتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ دونوں ٹیموں کے حمایتی تماشائی آپس میں الجھتے اور ایک دوسرے پر آوازے کستے اور نعرے بازی کرتے رہتے ہیں۔

تحریک احیائے علوم (Renaissance) اور تحریک اصلاح مذہب (Reformation)، ہنری ہشتم کی پوپ سے ٹھنی[1] اور رومن کیتھولک مسلک سے علیحدگی، ملکہ الزبتھ اول کا سنہری دور کہ اس میں علم و ادب اور سائنس نے بڑا فروغ پایا تھا [دنیا کا اولین کموڈ اسی کے لیے بنایا گیا تھا] اور تب کی منظم ترین یورپی طاقت

---

1- اس ٹھنی کی وجہ یہ تھی کہ ہنری ہشتم اپنی پہلی ملکہ کیتھرین آف ارگان، جو مسلمانوں کو غرناطہ میں شکست دینے اور انھیں ہسپانیہ سے نکالنے والے فرڈی نینڈ اور ازابیلا کی بیٹی تھی، طلاق دینا چاہتا تھا اور پوپ نے منظوری دینے سے انکار کر دیا تھا۔

ہسپانیہ کے زبردست بحری بیڑے Armada کی تباہی و بربادی، جس نے برطانیہ کو عظیم ترین بحری قوت بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا، نئی دنیا سے سر والٹر ریلے کی وساطت سے پرانی دنیا کی آلو، تمباکو اور ٹماٹر سے شناسائی، ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام جس نے برصغیر پر انگریزوں کا قبضہ کرایا، الزبتھ اول کے جانشین جیمز اول کے دور میں بائبل کا سرکاری طور پر تسلیم شدہ انگریزی ترجمہ، جس کے برطانوی معاشرے اور انگریزی ادب پر گہرے اثرات مرتب ہوئے، چارلس اول کے عہد میں شاہی اور کرام ویل کی زیرِ قیادت پارلیمنٹ کی فوجوں کے مابین خانہ جنگی[1]، چارلس کی شکست اور اس کا سر قلم کیا جانا، اس کے بیٹے چارلس[2] دوم کی تخت پر واپسی، کرام ویل کا مردہ قبر سے نکالا جانا، اسے پھانسی دیے جانا، اس کے جسم کے چار ٹکڑے کیے جانا اور اس کی کھوپڑی کا ویسٹ منسٹر محل کے سامنے کھمبے پر لٹکایا جانا، 1688[3] کا سنہری انقلاب جس کے بعد انگلستان مستقلاً کلیسائے انگلستان (Church of England) کا پیروکار بن گیا، 1714 میں جرمنی کی ایک ننھی منی ریاست ہینوور (Hanover)[4] کے حکمران کا جارج اول کا انگلستان کا تخت سنبھالنا، اس کے بیٹے جارج دوم کے زمانے میں سر روبرٹ والپول (Walpole) کا عملاً وزیرِ اعظم کے اختیارات سنبھال لینا کیونکہ باپ کی

---

1- اس خانہ جنگی کی وجہ یہ تھی کہ چارلس اول رومن کیتھولک تھا جبکہ پارلیمنٹ پر انتہا پسند پروٹسٹنٹوں کا قبضہ تھا جنھیں Puritans کہا جاتا تھا اور جنھیں اب اس وقت کے طالبان کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ وہ ہر قسم کی تفریح کے سخت مخالف تھے اور برسرِ اقتدار آتے ہی انھوں نے تھیٹروں کو زبردستی بند کرا دیا تھا۔ ان کی ایک شاخ نے امریکہ میں پہلی برطانوی نوآبادی قائم کی تھی۔ یہ لوگ اکتالیس خاندانوں اور 102 افراد پر مشتمل تھے۔ چونکہ جیمز اول کے دور میں Puritans پر بہت سختیاں ہوتی تھیں، یہ تنگ آ کر ایک جہاز Mayflower میں سوار ہو کر امریکہ بھاگ گئے تھے۔ انھیں Pilgrim Fathers کہا جاتا ہے۔ ان کے اخلاف امریکہ کے برہمن سمجھے جاتے ہیں۔

2- چارلس دوم عیاش شخص تھا۔ اس کی اپنی ملکہ بانجھ تھی۔ اس نے داشتوں سے لے کر طوائفوں تک مختلف عورتوں کے ساتھ جسمانی تعلقات قائم کر رکھے تھے جن کے نتیجے میں جو بیٹا پیدا ہوتا تھا، اسے ڈیوک بنا دیا جاتا تھا۔ چونکہ اس کی اپنی کوئی جائز اولاد نہیں تھی اس لیے اس کا بھائی جیمز دوم اس کا جانشین ٹھہرا۔ ولی عہدی کے دور میں اسے ڈیوک آف یارک کا خطاب حاصل تھا۔ ولی عہد کی حیثیت سے اس نے امریکہ کا دورہ کیا اور اس کے خطاب کی نسبت سے نیو ایمسٹرڈیم کا نام نیویارک رکھ دیا گیا۔

3- جیمز دوم کٹر رومن کیتھولک تھا جب کہ ملک کی بیشتر آبادی پروٹسٹنٹ تھی۔ اس کے مخالفوں نے اس کی بیٹی میری کے ساتھ، جو پروٹسٹنٹ تھی اور جرمنی کے پرنس آف اورنج سے بیاہی ہوئی تھی، ساز باز کی اور اسے برطانیہ پر حملہ کرنے پر اکسایا۔ جیمز دوم حملے سے پہلے ہی بھاگ گیا اور یوں سنہری انقلاب برپا ہوا۔

4- ملکہ میری بے اولاد تھی۔ اس کی اور اس کے شوہر کی موت کے بعد اس کی بہن این تخت نشین ہوئی۔ اس کے بچے پیدا ہوتے اور مرتے رہے۔ جب خود اس کا انتقال ہو گیا، اس کے دور پار کے رشتے دار پرنس آف ہینوور کی لاٹری نکل آئی اور وہ جارج اول کے نام سے بادشاہ بنا۔

طرح جارج دوم بھی انگریزی سے نابلد تھا، چنانچہ کابینہ کے اجلاسوں کی صدارت والپول کرتا تھا، جارج سوم کے عہد میں امریکا کی جنگ[1] آزادی، فرانسیسی انقلاب، اور سلطان ٹیپو کی شکست[2]، جارج چہارم کے دور میں، جو پہلے ریجنٹ تھا کیونکہ اس کا باپ پاگل ہو چکا اور حکومت کرنے سے معذور ہو چکا تھا، نپولین کی واٹرلو کے میدان میں شکست اور گرفتاری، ادب اور آرٹ میں رومانی تحریک کا فروغ، 1837 میں اس کی بھتیجی ملکہ وکٹوریا[3] کی تخت نشینی، 1857 کی ہندوستان کی جنگ آزادی میں، جسے انگریز غدر کہتے ہیں، ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا اختتام اور ملکہ کی ایمپرس (امپیراطورہ) کے طور پر تقرری [انگریز اپنے ملک میں queen کو کبھی empress اور king کو emperor نہیں کہتا مگر ہندوستان تو مفتوحہ تھا، یہاں وہ جو جی چاہتا کر سکتا تھا] اور 1897 میں اس کے عہد حکومت کی ڈائمنڈ جوبلی، اس کے بیٹے ایڈورڈ ہفتم کے عہد میں بنگال کی تقسیم مگر پوتے جارج پنجم کے زمانے میں اس کی تنسیخ اور پہلی جنگ عظیم، معلوم نہیں کیا کچھ پڑھا، کچھ پلے پڑا کچھ نہیں [تاہم جو پڑھا، ایم اے انگلش کی تعلیم کے دوران میں بہت کام آیا]۔ ہمیں صرف موہن لال روڈ (موجودہ اردو بازار) کی چھپی ہوئی کتابیں دستیاب تھیں۔ ان میں اہم سوالوں کے آگے ہاتھ کا نشان ہوتا تھا۔ ہمیں انھیں اچھی طرح پڑھ لیتے اور یاد کر لیتے تھے۔ اسے اتفاق کہیں یا کچھ اور، بیشتر سوالات انھیں میں سے پوچھے جاتے تھے جیسے ممتحنین، مصنفین اور ناشروں نے آپس میں ایکا کر لیا ہو۔

---

1. امریکا کی جنگ آزادی کے دوران میں انگریزی فوجوں کا کمانڈر ان چیف لارڈ کارنوالس تھا۔ اس کی فوجوں نے 1781 میں واشنگٹن کی فوجوں سے شکست کھائی اور ہتھیار ڈال دیے۔ اس "کارنامے" کا اسے یہ صلہ ملا کہ اسے 1786 میں ہندوستان کا گورنر جنرل بنا دیا گیا۔ یہاں اس نے تیسری جنگ میسور میں سلطان ٹیپو کو شکست دی اور اس کے بیٹوں کو یرغمال بنایا۔ اسی نے بندوبست استمراری کے نام پر ہندوستان پر بدترین جاگیرداری نظام تھوپ دیا۔
2. سلطان ٹیپو کو فیصلہ کن شکست 1799 میں اپنوں کی غداری کی وجہ سے ہوئی۔ اس جنگ میں ایک انگریز کرنل آرتھر ولزلی نام کا تھا جس نے بعد میں واٹرلو کے میدان میں نپولین کو فیصلہ کن شکست دی اور اسے گرفتار کیا۔ اسے ڈیوک آف ولنگٹن کا خطاب ملا اور فیلڈ مارشل بنایا گیا۔ وہ انیسویں صدی میں برطانیہ کا وزیر اعظم بھی رہا۔ اس کا بڑا بھائی رچرڈ ولزلی ہندوستان کا گورنر جنرل بنا اور اس نے ہندوستان کے کئی علاقے فتح کیے۔
3. ملکہ بڑی بارآور (produtive) خاتون تھی۔ اس نے پے در پے سات بچوں کو جنم دیا اور اگر اس کا شوہر البرٹ عین عالم شباب میں فوت نہ ہو جاتا، تو نہیں اور کتنے پیدا کرتی۔ وہ ساری عمر اپنے مرحوم شوہر کا سوگ مناتی رہی۔ جب اسے ہندوستان کی ایمپریس بنایا گیا اسے اردو سیکھنے کا شوق چرایا۔ اس مقصد کے لیے ایک اتالیق منگوایا گیا۔ اس کا نام منشی عبدالکریم تھا جس کے ساتھ اس کی متعدد کہتی ان کہتی داستانیں وابستہ کی جاتی ہیں۔ اس کی ایک نواسی نے جرمنی کے قیصر اور دوسری نے روس کے آخری زار کے ساتھ شادی کی۔ یوں جنگ عظیم کے بڑے کردار ملکہ وکٹوریا کے قریبی رشتے دار تھے۔ زارینہ کو اپنے شوہر اور بچوں سمیت 1917 کے انقلاب روس کے بعد کمیونسٹوں نے قتل کر دیا تھا۔ البتہ قیصر دوم کی بیوی اوگستا نے جلاوطنی میں 1921 میں ہالینڈ میں طبعی موت پائی۔

کبھی کبھی آدمی سوچتا ہے کہ اس ننھے منّے جزیرے کے باسیوں نے کیسے تقریباً چوتھائی دنیا پر قبضہ کر لیا اور اپنے زمانے کی عظیم ترین سلطنت (ایمپائر) قائم کر لی جس کی حدود میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ اصلاً انگریز ایک قوم کا نام نہیں بلکہ یہ متعدد اقوام کے اختلاط سے وجود میں آئی ہے، اسی لیے ڈوروتھی ایل سیئرز (Sayers) نے، جس نے پینگوئن کلاسیک سیریز کے لیے دانتے کی طربیہ خداوندی (Divine Comedy) کا ترجمہ کیا اور ادبی چاشنی کے حامل جاسوسی ناول تحریر کیے تھے، 1942ء میں بی بی سی پر اپنے ایک لیکچر میں کہا تھا: The English are nothing if not mongrel۔ مختلف نسلوں کے اختلاط نے ان میں ذہانت کوٹ کوٹ کر بھر دی۔ پھر وہاں کی آب و ہوا نے انھیں جفاکش بنا دیا [جہاں ہر وقت بارش ہوتی رہتی ہو، وہاں فصلیں اگانا اور مویشی پالنا کتنا مشکل کام ہوگا]۔ برطانیہ کے اصل باشندے کیلٹ (Kelt/Celt) تھے۔ پھر وہاں 1066 تک مختلف یورپی اقوام حملہ آور ہوتی رہیں۔ ان میں اہم ترین جرمنی کے قبائل اینگلز، سیکسن اور جوٹ (Jutes)، سکینڈے نیویا کے وائی کنگ اور فرانس کے علاقے نارمنڈی کے نارمن تھے [نارمنوں کے اجداد بھی اصلاً جرمنی اور سکینڈے نیویا ہی سے آئے تھے]۔ اینگلز اور سیکسن جو زبان بولتے تھے، وہی انگریزی زبان کا اولین روپ تھا۔ اسے اینگلو سیکسن اور خود انگریز قوم کو اینگلو سیکسنز (Anglo-saxons) کہا جاتا ہے۔

1066 میں نقشہ پلٹ گیا۔ نارمنوں نے اپنے سربراہ ولیم، ڈیوک آف نارمنڈی، کی زیرِ قیادت ہیسٹنگز (Hastings) کے مقام پر مقامی فوجوں کو شکست دی اور ملک پر قابض ہو گئے۔ ولیم جسے اب فاتح ولیم (William The Conqueror) مگر اپنے زمانے میں حرامی ولیم (William The Bastard) کہا جاتا تھا، انگلستان کا بادشاہ بن گیا۔ نارمنوں نے مقامی باشندوں کو ایک قسم کے غلام (serfs) بنا دیا جب کہ ان کے مالکوں کو بڑی بڑی جاگیریں عطا کر دی گئیں اور یوں یورپ کا جاگیرداری نظام نافذ کر دیا گیا۔ اینگلو سیکسن غلام ہی نہیں پینڈو بھی تھے، چنانچہ ان کی زبان ان گھڑ اور غیر شستہ ٹھہری جبکہ فرانسیسی شائستگی و نفاست، قانون، حکومت اور ماحولیات کی زبان بن گئی۔ اینگلو سیکسن shit یا shite مردود قرار پایا جب کہ فرانسیسی excrement احسن۔ اینگلو سیکسن جو جانور پالتے تھے، وہ cow، calf، swine/pig، sheep، hen یا deer کہلاتے تھے، مگر جب وہ پک کر کھانے کی میز پر پہنچتے تھے، تو فرانسیسی قالب اختیار کر کے beef، veal، pork، mutton، poultry اور venison بن جاتے تھے۔ (دائیں سے بائیں) چند مزید الفاظ ملاحظہ فرمائیں۔ فرانسیسی الفاظ واوین کے اندر ہیں:

;(fraternal)brotherly ;(royal)kingly ;(mindful)thinking;

(astound) amaze/stun, (carry) bring, (bear) blossom; (odour) smell/stench, (blond/blonde) fair/fair haired, (prudence) wisdom; (cry) weep; (purchase) buy وغیرہ

فاتح ولیم نے ایک کام یہ کیا کہ اس نے انگلستان اور ویلز کا سروے کرایا، کون کیا ہے اور کس کے پاس کیا ہے (زمین، جانور وغیرہ) کا ریکارڈ اکٹھا کرایا اور اسے کتابی شکل دی۔ اسے Domesday Book کا نام دیا۔ اس میں جو کچھ آ گیا، وہ حرف آخر بن گیا۔ اب کوئی لاکھ کوشش کرے، ٹیکس سے نہیں بچ سکتا تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے انگریز ڈپٹی کمشنروں نے پنجاب کے اضلاع کے جو gazeteers تحریر کیے تھے، وہ شاید اسی کتاب سے متاثر ہو کر لکھے گئے تھے۔

فاتح ولیم کے خاندان کے برسر اقتدار آنے کے بعد برطانیہ پر غیر ملکی حملوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور آج تک اسی خاندان کے اخلاف یا ان کے رشتے دار، بے شک وہ دور دراز ہی کے کیوں نہ ہوں، پہلے انگلستان اور پھر پورے برطانیہ کے تخت پر براجمان چلے آ رہے ہیں، تاہم خاندانوں کے نام تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ پہلے یہ نارمن تھے، پھر ترتیب وار Stuarts ،Tudors ،Plantagents، Hanovarions ،Saxe-coburg-gothas اور Windsors بنے۔ چونکہ بادشاہ یا ملکہ سے وفاداری انگریز قوم کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، اس خاندانی تسلسل نے انگریز قوم کو متحد کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

انگریز دوسری یورپی قوموں کے برعکس مستقل ادارے بنانے میں بھی کامیاب رہے۔ ولیم فاتح نے اپنے خاندان کے اقتدار کو استحکام بخشنے کے لیے جاگیرداروں پر مشتمل مشاورتی کونسل قائم بنائی جو بتدریج پارلیمنٹ کا روپ اختیار کر گئی۔ [پارلیمنٹ کا ماخذ parley (آپس میں باتیں یا گفتگو کرنا) ہے۔] پھر اس پارلیمنٹ کے ارکان نے 1215 میں بادشاہ جون کو Magna Carta (آزادی کا منشور/ پروانۂ اعظم) پر دستخط کرنے پر مجبور کر دیا اور اس کے تحت پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر ٹیکس لگانا ممکن نہ رہا۔

انگریزوں کا بڑا وصف یہ ہے کہ وہ جو قانون بناتے ہیں، سوچ سمجھ کر بناتے ہیں، اس پر خود بھی عمل کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی کراتے ہیں۔ سابق وزیر اعظم ٹونی بلیئر کی بیوی کو سٹیشن پر پہنچنے میں تاخیر ہو گئی، گاڑی نکلی جا رہی تھی اور وہ ٹکٹ خریدے بغیر اس پر سوار ہو گئی۔ راستے میں پکڑی گئی اسے نہ صرف ٹکٹ کی رقم بلکہ پورا جرمانہ بھی ادا کرنا پڑا۔

معلوم ہوتا ہے کہ قدرت بھی ان پر بہت مہربان رہی ہے۔ اپنے زمانے کی عظیم طاقتوں ہسپانیہ اور فرانس نے جب برطانیہ پر حملے کرنا چاہے، دونوں کے مضبوط بحری بیڑوں کے جہاز طوفانوں میں گھر گئے اور ساحلوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئے۔ جنگ عظیم دوم میں وقتی طور پر ہٹلر کی مت ماری گئی۔ اس نے

ڈنکرک سے برطانوی اور فرانسیسی فوجوں کے انخلا کو روکنے کے لیے کوئی اقدام نہ کیا۔

انگریزوں نے سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے لیے ذہن رسا پایا ہے۔ مشرق وسطی میں ایڈمنڈ ایلن بی (Allenby) اور ٹی ای لارنس نے کیا کیا گل نہیں کھلائے۔ بنگال اور میسور پر کیسے قبضہ ہوا۔ صرف مہاراجہ رنجیت سنگھ ان کے جال میں نہ پھنسا۔ جب انگریزوں کا ایک وفد اس سے ملنے آیا، وہ سمجھ گیا کہ اب اس کی سلطنت کی خیر نہیں۔ اس نے کمال عیاری سے کام لیا اور باتوں باتوں میں وفد کے ارکان سے پوچھا: ''برف میں لگی ہوئی بیئر کی بوتلیں کتنے دنوں میں انگریزی علاقے سے لاہور پہنچ سکتی ہیں؟'' جواب ملا، ''تین دن میں۔'' رنجیت سنگھ نے وفد کو رخصت کیا اور اپنے جرنیلوں کو حکم دیا: ''اپنی فوجوں کو اس طرح تربیت دیں کہ وہ تین دن کے نوٹس پر انگریزی حملے کے مقابلے کے لیے تیار ہو جائیں۔''

ایک اور بات جو انگریزوں کے حق میں گئی وہ یہ تھی کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اوائل میں اکثر بڑی بڑی سائنسی دریافتیں اور صنعتی ایجادات انھوں ہی نے کیں۔ نیوٹن کے سر پر سیب گرا، اس نے کشش ثقل دریافت کر لی۔ جیمز واٹ (Watt) کو کیتلی کا ڈھکنا پانی ابلنے پر اچھلتا نظر آیا، اس نے سٹیم انجن بنا ڈالا۔ سب سے بڑھ کر سابقہ ایجادات سے فائدہ اٹھا کر جارج سٹیفنسن نے ریلوے انجن تعمیر کر لیا جس نے دنیا کا نقشہ ہی پلٹ دیا۔ ان دریافتوں اور ایجادات نے برطانیہ کو دنیا کی اولین عظیم صنعتی طاقت بنا دیا۔

ہندوستان کی تاریخ آریاؤں کی آمد سے شروع ہوتی تھی اور اس کی تان انگریز راج کی برکتوں پر ٹوٹتی تھی۔ ہم آج تک یہی پڑھتے چلے آ رہے ہیں کہ شمالی پنجاب کے راجہ پورس نے، جس کا صدر مقام بھیرہ تھا، سکندر اعظم کے ہاتھوں شکست کھائی تھی مگر ڈان کے کالم نگار مجید شیخ نے 28 اپریل 2013 کے شمارے میں اپنی تحقیق کے ذریعے انکشاف کیا ہے کہ شکست پورس کو نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کا تو جنگ میں پلہ بھاری تھا۔ جب سکندر کو اندازہ ہوا کہ وہ اپنی فوجی زندگی میں پہلی بار پٹنے جا رہا ہے، اس نے صلح کا ہاتھ بڑھا دیا جسے پورس نے بکمال فراخدلی قبول کر لیا۔

مجید شیخ نے حیرت کا اظہار کیا ہے کہ لوگ اپنے بچوں کے نام سکندر کیوں رکھتے ہیں۔

## 48

ہمارے گاؤں پر جیاں کلاں کی بڑی مسجد میں ایک چھوٹی سی لائبریری تھی۔ ظاہر ہے اس میں صرف

مذہبی موضوعات پر کتابیں ہوں گی، تاہم وہاں سے چند بہت اچھی کتابیں پڑھنے کا موقع دستیاب ہو گیا۔ ان میں حفیظ جالندھری کا ''شاہنامہ اسلام''، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کی تین جلدوں میں ''رحمۃ العالمین''، خالد لطیف گابا کی ''پیغمبر صحرا''، چودھری افضل حق کی ''محبوب خدا'' اور ''زندگی''، سید محمد میاں کی ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' [ غالباً چار جلدوں میں ] اور ''صحابہ کرام کی سچی کہانیاں'' [ مصنف کا نام یاد نہیں رہا] شامل تھیں۔

قاضی سلمان منصور پوری اپنے زمانے کے جید عالم تھے۔ ان کی کتاب بہت مقبول ہوئی اور آج بازار ہی میں نہیں، انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے۔ اس کا "Muhammad:Mercy for the Worlds" کے عنوان سے انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا۔ ان کی ایک اور کتاب کا نام ''مہر نبوت'' ہے۔ ان کا ایک پوتا صدیق سلمان ایک کالج میں کچھ عرصہ میرا رفیق کار رہا اور دسمبر 1950 کی دہائی میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا لائبریرین تھا۔

چودھری افضل حق ہوشیار پور کے رہنے والے تھے۔ وہ پولیس میں سب انسپکٹر تھے لیکن ادب اور سیاست سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ پولیس سے مستعفی ہو گئے اور انھوں نے سید عطا اللہ شاہ بخاری، شیخ حسام الدین ( شیخ عامر ریاض کے دادا )، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا مظہر علی اظہر، [جنھیں تحریک پاکستان کے دوران میں لاہور کے اردو اخبارات مولانا اِدھر علی اُدھر لکھا کرتے تھے کہ خود شیعہ تھے مگر لکھنو میں شیعوں کے خلاف احتجاج میں اپنے احراری دوستوں کے ساتھ جو زیادہ تر سنّی تھے، شامل ہو جاتے تھے ]، مولانا ظفر علی خاں [ جو بہت جلد علیحدہ ہو گئے اور اپنی الگ جماعت نیلی پوش بنالی ]، مولانا داؤد غزنوی، تاج الدین انصاری اور آلومہار شریف کے سجادہ نشین سید فیض الحسن شاہ کے ہمراہ ''مجلس احرار الاسلام'' کی بنیاد رکھی۔ چند سال بعد نواب زادہ نصر اللہ خان اور آغا شورش کاشمیری بھی اس میں شامل ہو گئے۔ مجلس کے اصل دماغ چودھری افضل حق متصور ہوتے تھے اور اسی لیے انھیں ''مفکر احرار'' کہا جاتا تھا۔ سیاست میں ان کا مزاج معتدل تھا اور اگر وہ جلدی (1942 میں ) انتقال نہ کر جاتے، تو بعد میں مجلس شاید انتہا پسندانہ موقف اختیار نہ کرتی۔

چودھری افضل حق ہندوستان گیر شہرت کے مالک سیاست دان تھے۔ وہ تین مرتبہ پنجاب اور ایک بار مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ وہ ہندوستان کے عام مسلمانوں کے برعکس توہم پرست نہیں بلکہ روشن خیال تھے۔ ان کی آپ بیتی ''میرا افسانہ'' ( صفحہ 144 ) کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''مسلمانان ہند کے متعلق میری زندگی کا یہی تلخ تجربہ ہے کہ وہ یا تو نقش سلیمانی

کی تلاش میں ہیں تاکہ دفینے تک نظر آ جائیں یا ایسی مالدار بیوہ کے خوشگوار خواب دیکھتے رہتے ہیں جس کے بعد انھیں عیش و آرام کی زندگی میسر آ جائے یا وہ ہم زاد اور جن قابو کرنے کے جتن کرتے ہیں تاکہ صبح تک ان کے لیے شاہی محل تیار کر دیے جائیں اور الف لیلہ کے افسانوں کو سچا کر دکھائیں یا ایسا تعویذ دستیاب ہو کہ فتح قدم چومے مگر انھیں خود ہاتھ ہلانے کی نوبت نہ آئے۔

''جس قوم کی کشور کشائی کا عزم تعویذوں پر موقوف ہو جائے، اس کے ذوقِ عمل کو کیوں بیدار کیا جائے!''

سید محمد میاں کی ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' میں ہندوستان کے تقریباً ہر مسلک کے علما کے کارناموں کی تفصیل بیان کی گئی تھی۔ اس کا آغاز مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی سے ہوا تھا اور اختتام مولانا حسین احمد مدنی پر۔ یہ کتاب پڑھے اتنا عرصہ گزر چکا ہے کہ کچھ یاد نہیں رہا کہ اس میں کیا کچھ تھا، تاہم اتنا ضرور یاد ہے کہ اس میں مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مکی، مولانا محمود الحسن اور مولانا محمد حسین احمد مدنی جیسے اکابرین دیوبند کا ذکر بہت شرح و بسط سے کیا گیا تھا۔ مولانا نانوتوی دہلی میں سرسید احمد خاں کے ہم درس اور گہرے دوست تھے۔ حصولِ تعلیم کے بعد اگرچہ تاحیات ان کی دوستی میں کوئی رخنہ نہ آیا مگر راستے الگ الگ ہو گئے۔ سرسید احمد خاں سمجھتے تھے کہ جدید علوم اور انگریزی کی تعلیم کے بغیر مسلمانانِ ہند بالکل پس ماندہ رہ جائیں گے اور اس لیے انھوں نے اینگلو محمڈن کالج علی گڑھ کی بنیاد رکھی۔ مولانا نانوتوی کو انگریز اور انگریزی سے سخت چڑ تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمان اپنی میراث تبھی محفوظ رکھ سکتے ہیں اگر وہ دینی تعلیم حاصل کریں۔ چنانچہ انھوں نے انتظار حسین کے وطن مالوف ڈبائی کے قریب ضلع سہارن پور کے ایک گاؤں دیوبند میں مولانا رشید احمد گنگوہی کے تعاون سے دینی مدرسے کی نیو رکھی جو بعد میں ایک تناور درخت بن گیا اور ایک علیحدہ مسلک کی حیثیت اختیار کر گیا۔ مسلمانانِ ہند (و پاکستان) پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

مولانا نانوتوی نہایت نیک طینت انسان تھے اور جو کہتے تھے، اس پر عمل بھی کر کے دکھاتے تھے۔ کتاب میں ان کے متعلق لکھا گیا تھا کہ ایک مرتبہ وہ ایک جلسہ عام میں تقریر کر رہے تھے اور مسلمانوں کو تلقین کر رہے تھے کہ وہ ہندوؤں کی تقلید میں اپنی بیوہ بہنوں اور بیٹیوں کو گھر پر نہ بٹھائے رکھیں بلکہ ان کی شادیاں کریں۔ اس پر حاضرین میں سے ایک شخص اٹھا اور اس نے اعتراض کیا کہ خود آپ کی بیوہ ہمشیرہ

گھر پیٹھی ہوئی ہے۔ مولانا نانوتوی نے اس اعتراض کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ حالانکہ ان کی ہمشیرہ اس وقت تقریباً ساٹھ سال کی ہو چکی تھیں، انھوں نے ایک ہفتے کے اندر اندر ان کی شادی کر دی اور خدا کی قدرت دیکھیں کہ وہ اس عمر میں بھی صاحب اولاد ہو گئیں۔

دارالعلوم دیو بند سے بعض بڑی بڑی شخصیات وابستہ رہی ہیں۔ مولانا رشید احمد گنگوہی عالم بھی تھے اور صاحب کشف بھی۔ مولانا اشرف علی تھانوی فقہ، حدیث اور تصوف پر سند کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب مولانا رشید احمد گنگوہی صدر مدرس کی حیثیت سے دستار بندی (convocation) کے لیے تشریف لائے تو انھیں بتایا گیا کہ جن طلبا کی تعلیم مکمل ہونے پر دستار بندی ہو رہی ہے، ان میں ایک انتہائی ذہین طالب علم اشرف علی تھانوی بھی شامل ہے۔ مولانا گنگوہی نے ان کو پرکھنے کے لیے انتہائی مشکل سے مشکل سوالات پوچھے اور صحیح جوابات ملنے پر متعجب بھی ہوئے اور خوش بھی۔ مولانا تھانوی نے یوں تو قرآن مجید کی تفسیر سمیت متعدد کتب تحریر کی تھیں، تاہم ان کی مشہور ترین تصنیف ''بہشتی زیور'' تھی جسے اب بھی بعض لوگ اپنی بیٹیوں کو جہیز میں دیتے ہیں اور بعض اسے عورت دشمن گردانتے ہیں۔ ان کے شاگردوں اور مریدوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ وہ مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع اور جامعہ اشرفیہ لاہور کے بانی مفتی محمد حسن کے مرشد تھے۔ اردو کے نامور نقاد، مترجم اور افسانہ نگار محمد حسن عسکری مفتی محمد شفیع کے مرید تھے اور مفتی صاحب کے ایما پر انھوں نے مولانا کی تفسیر قرآن کے کچھ حصوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ ''بہشتی زیور'' کا انگریزی ترجمہ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا ڈیوس کے شعبہ تاریخ کی صدر باربرا مٹکاف (Metcalf) نے کیا تھا۔ امریکا کے محکمہ دفاع (پینٹاگون) نے باربرا مٹکاف سے دیو بند تحریک پر ایک خوبصورت اور غیر جانب دارانہ کتاب لکھوائی تھی، اس لیے نہیں کہ وہ اس سے پراپیگنڈے کا کام لینا چاہتا تھا بلکہ اس لیے تاکہ اسے معلوم ہو سکے کہ اصلاً یہ لوگ ہیں کون۔ باربرا مٹکاف نے ایک ملاقات میں مجھے بتایا کہ اس مقصد کے لیے اس نے اردو سیکھی، ہندوستان اور پاکستان کے متعدد چکر لگائے اور چھ ماہ دارالعلوم دیو بند کے اس وقت کے سربراہ قاری محمد طیب کے گھر قیام کیا تھا۔

مولانا اشرف علی تھانوی اور ان کے مرید مولانا شبیر احمد عثمانی دونوں تحریک پاکستان کے زبردست مؤید تھے۔ مولانا عثمانی نے کانگرس کی حمایتی جمعیت العلمائے ہند کے مقابلے میں جمعیت العلمائے اسلام بنا لی تھی۔ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ قیام پاکستان کے بعد مولانا عثمانی کے انتقال پر اس جماعت پر مولانا مفتی محمود اور ان کے صاحبزادے مولانا فضل الرحمن نے، جو اصلاً جمعیت العلمائے ہند کے حامی تھے، قبضہ کر لیا۔ تحریک پاکستان کی حمایت کرنے کا مولانا عثمانی کو صلہ یہ ملا کہ وہ پاکستان کی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو

گئے اور اپنی اس حیثیت سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے "قرارداد مقاصد" منظور کرائی جسے بے شمار لوگ پاکستان کے بیشتر مسائل کی جڑ سمجھتے ہیں۔

اکابرین دیوبند میں مولانا محمد انور کاشمیری، تبلیغی جماعت کے بانی مولانا محمد الیاس کاندھلوی اور مولانا عبیداللہ سندھی بھی شامل تھے مگر سب سے زوردار شخصیت شیخ الاسلام مولانا محمود الحسن اور ان کے شاگرد سید حسین احمد مدنی کی تھی۔ دونوں سلسلہ چشتیہ صابریہ کے پیروکار تھے۔ اگرچہ مولانا محمود الحسن کی دلچسپی کا بڑا مرکز مدرسہ دیوبند تھا، وہ ہندوستان کی مختلف سیاسی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ جنگ عظیم اول کے آغاز پر ان کی سرگرمیوں سے خائف ہو کر انگریزوں نے انھیں بحیرۂ روم کے جزیرے مالٹا میں نظر بند کر دیا، اس رعایت پر انھیں "اسیر مالٹا" کہا جاتا ہے۔ اگرچہ مولانا حسین احمد مدنی کو گرفتار نہیں کیا گیا تھا، انھیں اپنے مرشد کی مفارقت گوارا نہ ہوئی اور یوں انھیں بھی ان کی درخواست پر مالٹا بھیج دیا گیا۔ جب اسیری کے دوران میں رمضان کا مہینہ آیا، مولانا محمود الحسن نے بہت تاسف سے کہا کہ وہ ساری عمر تراویح میں مکمل قرآن مجید کی تلاوت سنتے رہے ہیں جس سے وہ اب محروم رہیں گے۔ اس پر مولانا حسین احمد مدنی نے ہر روز ایک سیپارہ حفظ کرنا اور تراویح میں سنانا شروع کر دیا۔ مولوی نذیر احمد دہلوی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ادھیڑ عمر میں پورا قرآن چھ ماہ میں حفظ کر لیا تھا مگر مولانا ان سے بازی لے گئے اور انھوں نے یہ کار عظیم ایک ماہ میں سرانجام دے دیا۔

جنگ کے اختتام پر مولانا محمود الحسن اور مولانا مدنی دونوں ہندوستان لوٹ آئے۔ اس وقت رولٹ ایکٹ (Rowlatt Act) کے خلاف تحریک چل رہی تھی۔ مولانا محمود الحسن نے فتویٰ دیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو مہاتما گاندھی اور انڈین نیشنل کانگرس کی حمایت کرنا چاہیے جو عدم تشدد کے ذریعے تحریک نافرمانی چلا رہی تھی اور علی برادران اس کا ساتھ دے رہے تھے۔

مولانا محمود الحسن نے حکیم اجمل، مختار احمد انصاری اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے قوم پرستوں کے ہمراہ جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی تاکہ مسلمانوں کے لیے مغربی علوم کی تعلیم کا کچھ اس طرح انتظام کیا جائے کہ انگریزوں کو اس میں دخل اندازی کا کوئی موقع نہ مل سکے۔

مولانا حسین احمد مدنی دارالعلوم دیوبند میں شیخ الحدیث اور 1957 میں اپنے انتقال کے وقت تک اس کے اور جمعیت العلمائے ہند کے صدر رہے۔ وہ دو قومی نظریے اور تقسیم ہند کے مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ موجودہ زمانے میں قومیں نسل یا مذہب کی نہیں بلکہ وطن کی بنیاد پر بنتی ہیں۔ اس پر علامہ محمد اقبال نے ان کے خلاف "حسین احمد" کے نام سے مندرجہ ذیل نظم لکھی جو ان کے مجموعۂ کلام "ارمغان حجاز" میں

شامل ہے:

عجم ہنوز نداند رموز دیں، ورنہ
ز دیوبند حسین احمد! ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی، تمام بولہبی است

اس نظم کو تحریک پاکستان کے دوران میں بہت اچھالا گیا۔ میں اور میرے دوست تحریک پاکستان کے بہت حامی تھے اور اسے پڑھ کر بہت حیران ہوتے تھے۔ جب ہم نے مذہب کے نام پر وطن حاصل کرلیا اور اسے متحد نہ رکھ سکے تو کیا اس سے مولانا مدنی کے موقف کی تائید ہوتی ہے، میں اس کا فیصلہ کرنے کا اہل نہیں۔

دیوبند کے بزرگوں پر طرح طرح کے الزامات عاید کیے جاتے رہے ہیں، ان کے مخالف مسلک کے بانی نے تو ان کے خلاف کفر کا فتویٰ بھی صادر کر دیا تھا۔ تاہم ان لوگوں نے ہندوستان کی آزادی کی تحریکوں میں جو قربانیاں دی تھیں، انھیں جھٹلانا ممکن نہیں۔ پھر انھوں نے تشدد کا راستہ کبھی اختیار نہیں کیا۔ چنانچہ جب آدمی طالبان اور لشکر جھنگوی کے تشدد پرستوں کو دیکھتا ہے جو اپنے آپ کو ان کے اخلاف اور نام لیوا قرار دیتے ہیں، اس کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔

## 49

پیغمبر صحرا (Prophet of the Desert) کے مصنف خالد لطیف گابا نومسلم تھے۔ وہ دراصل (متحدہ) پنجاب کے پہلے ہندو وزیر لالہ ہرکشن لال گابا کے فرزند ارجمند تھے۔ کہا جاتا ہے کہ لالہ ہرکشن لال گابا اتنے مفلس تھے کہ جب انھوں نے تلاش روزگار کے سلسلے میں اپنے آبائی وطن لیہ سے لاہور آنے کا قصد کیا، ان کی جیب میں ریل گاڑی کا کرایہ تک نہیں تھا اور وہ پیدل ہی اپنی منزل مقصود کی طرف چل پڑے۔ لاہور میں قسمت کچھ اس طور ان پر مہربان ہوئی کہ وہ دولت میں کھیلنے لگے۔ انھوں نے پنجاب نیشنل بینک اور بھارت انشورنس کمپنی جیسے بڑے کاروباری ادارے قائم کیے، بے تحاشا جائیداد بنائی جن میں ان کی

کینال بینک میں وسیع و عریض کوٹھی بھی شامل تھی۔ گلبرگ سے ملحق اس آبادی میں ان کے نام پر ایک سڑک اب بھی موجود ہے۔

خالد لطیف گابا کا اصل نام کنہیا لال گابا تھا لیکن وہ کہلاتے کے ایل گابا تھے۔ یوں وہ مسلمان بننے کے بعد بھی کے ایل گابا ہی رہے۔ کے ایل گابا نے بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد لاہور میں وکالت شروع کی۔ کہا جاتا تھا کہ وہ لاہور کے پہلے معروف اور قائداعظم کے پائے کے وکیل تھے۔ غالباً 1933 میں پنجاب اسمبلی کے تین ضمنی الیکشن ہوئے۔ اس زمانے میں پنجاب میں مجلس احرار کا طوطی بولتا تھا اور اس نے یہ تینوں نشستیں جیت لیں۔ تیسری نشست پر خالد لطیف گابا کھڑے ہوئے تھے، وہ مجلس احرار کے رکن تو نہیں تھے مگر انھیں احرار کی پشت پناہی حاصل تھی جن کی وجہ سے وہ بھی صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔

دریں اثنا اس زمانے کے لاہور ہائی کورٹ کے انگریز چیف جسٹس سر ڈگلس ینگ نے ان کے باپ کو [غالباً انکم ٹیکس کی نادہندگی کے] ایک مقدمے میں سزا سنا دی اور انھیں جیل بھیج دیا۔ اس پر بیٹے کی "غیرت" جاگ اٹھی اور معروف ناول نگار اور صحافی خشونت سنگھ کے بقول انھوں نے ڈگلس ینگ کے خلاف ایک دشنام آمیز (scurrilous) کتاب لکھ ماری جس پر چیف جسٹس جلال میں آ گیا۔ اس نے ان پر توہین عدالت کا مقدمہ درج کر دیا اور انھیں جیل بھیج دیا۔ خود گابا نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ انھیں کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ ان کے خلاف مقدمہ کیوں درج کیا گیا تھا۔ خشونت سنگھ نے اپنی تحریر میں گابا کی کتاب کا کوئی نام نہیں لکھا۔ اسے گابا سے خدا واسطے کا بیر تھا اور اس کا سارا مضمون زہر سے بجھا ہوا ہے۔ اس نے تو یہاں تک الزام لگایا کہ گابا "نام کے واسطے" اور "کام کے واسطے" مسلمان ہوئے تھے تاکہ وہ ایک مسلمان خاتون سے شادی کر سکیں [اس کے مطابق یہ مسلمان خاتون مشہور کارٹونسٹ انور علی کی ہمشیرہ تھی، پتا نہیں یہ صحیح ہے یا محض الزام تراشی]۔ خشونت سنگھ کے بقول کے ایل گابا نے انتخاب بھی لاہور کے "بازار حسن" ہیرا منڈی کی طوائفوں کی مدد سے جیتا تھا جن کے وہ "مستقل گاہک" تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 1933 میں جب ہندوستان کی چوتھائی آبادی بھی ووٹ دینے کی اہل نہیں تھی، کتنی طوائفوں نے ووٹ ڈالا اور یوں انتخاب میں فیصلہ کن کردار ادا کیا ہوگا۔ کے ایل گابا کے موقف کی تائید کرتا تک کے کہنہ مشق صحافی اراکیرے (Arakere) جے رام کے خشونت سنگھ کے مضمون پر اس تبصرے سے ہو جاتی ہے [خشونت سنگھ کا مضمون اور جے رام کا تبصرہ دونوں انٹرنیٹ پر موجود ہیں]۔

"میں کے ایل گابا کا پرجوش مداح ہوں اور ان کے متعلق مختصراً کہہ سکتا ہوں کہ اگر خشونت سنگھ اور

رام جیٹھ ملانی (بھارت کا نہایت نامور وکیل) کو یک جا کر دیا جائے تو ایک کے ایل گابا برآمد ہوں گے۔
انھوں نے لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر ڈگلس ینگ اور جسٹس منرو کا جس دلیری اور جرات سے
سامنا کیا، میں اس پر انھیں سلام عرض کرتا ہوں جس پر دونوں کو 1943 میں مستعفی ہونا پڑا۔ تاہم ہندوؤں کو
یاد رکھنا چاہیے کہ یہ وہی ینگ تھا جس نے مسجد شہید گنج کے مقدمے کا فیصلہ سکھوں کے حق میں دیا تھا۔
تقسیم سے پہلے لاہور کیسا تھا، اسے جاننے کے لیے میں ہمیشہ کے ایل گابا کی طرف رجوع کرتا ہوں۔
خشونت سنگھ اپنے طرز تحریر کے لیے دراصل گابا ہی کا احسان مند ہے۔ اگرچہ سردار خشونت سنگھ نے اس کا
کبھی اعتراف نہیں کیا مگر سمجھدار لوگ اس نقالی کا بآسانی ادراک کر سکتے ہیں۔"

اس تبصرے پر بنگلور کے ایک اور صحافی پی ایس لاتھا (Latha) راؤ نے رائے زنی کرتے ہوئے لکھا:

> "I fully endorse the views of Arakere Jayaram on K.L. Gauba and Khuswant Singh. He has clean bowled the Sardar."

سر ڈگلس ینگ نے جب اپنے حکم کے ذریعے کے ایل گابا کو گرفتار کرا اور جیل بھجوا دیا تو انھوں نے
ضمانت کے لیے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کی طرف رجوع کیا۔ جج نے رہائی کے لیے پندرہ لاکھ روپے
ضمانت طلب کی۔ اس زمانے میں جب سونا میرے گاؤں میں بھی 29 روپے فی تولہ بکتا تھا، یہ کتنی بڑی رقم
ہوگی، اس کا اندازہ کرنے پر ہی آدمی کا سر چکرانے لگتا ہے۔ روزنامہ "زمیندار" اور روزنامہ "احسان" کی
روز روز کی اپیلوں کے باوجود اتنی بھاری رقم اکٹھی نہ کی جا سکی۔ گابا کے ایک مداح کے بقول، جو اتفاق سے
ان کا ہم وطن تھا: "سیال کوٹ کے ایک ٹھیکے دار الحاج ملک سردار علی کو ایک رات بشارت ہوئی جس میں
رسول کریمؐ فرما رہے تھے: 'سردار علی فوراً اٹھو، صبح لاہور پہنچو اور پندرہ لاکھ روپے کے عوض خالد لطیف گابا کی
ضمانت کراؤ۔ اس نے میرے متعلق ایک کتاب لکھی ہے جو مجھے بہت پسند آئی ہے۔'

"ملک سردار علی کو جب خواب میں رسول کریمؐ کی زیارت ہوئی، اس نے اپنی جمع جتھا نکالی، رشتے
داروں اور دوستوں سے قرض لیا، رقم لے کر بھاگم بھاگ لاہور پہنچا اور ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں پیش
ہو گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے اسے ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی اور بڑے تحکم سے کہا: 'اگر ضمانت ہونے کے بعد
گابا فرار ہو گیا، تو تمھاری یہ ساری رقم بحق سرکار ضبط ہو جائے گی۔' ملک سردار علی اگرچہ گابا کو جانتا تک
نہیں تھا، اس نے بڑی دل جمعی سے جواب دیا: 'جناب یہ رقم تو بڑی معمولی چیز ہے، میں تو اپنا سر بھی
کٹوانے کو تیار ہوں۔' ڈپٹی کمشنر مسٹر چندر نے پھر بھی ضمانت قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ ینگ
سے خوف زدہ تھا۔ تاہم سیشن جج کو خدا کا خوف آ گیا اور اس نے ضمانت قبول کر لی۔"

چونکہ گپا ذہنا کانگرسی اور پکے نیشنلسٹ تھے، وہ قیام پاکستان کے بعد بھارت چلے گئے۔ اس پر بعض لوگوں کو الزام تراشی کا موقع مل گیا کہ وہ دل سے کبھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے محض وقتی ضرورتوں کے تحت اسلام قبول کیا تھا، چنانچہ جب انھیں موقع ملا، وہ اپنے بھائی بندوں کے پاس لوٹ گئے۔ تاہم شواہد سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ وہ بسیار نویس تھے۔ تقسیم سے پہلے بھی اور تقسیم کے بعد بھی انھوں نے متعدد کتب تحریر کی تھیں۔ 1973 میں انھوں نے بھارتی مسلمانوں کی حالت زار پر ایک کتاب شائع کرائی تھی جس کا عنوان تھا: "Passive Voices:a Penetrative Study of Muslims in India"

آپ انٹرنیٹ پر Amazon کی ویب سائٹ دیکھ لیں، ان کی تمام کتابوں کے تقسیم کے بعد شائع ہونے والے ایڈیشنوں کے سرورقوں پر عموماً ان کا پورا نام خالد لطیف گابا درج ہے، کے ایل گابا نہیں۔

راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کے متعلق ان کی کتاب His Highness کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

"Some people begin their morning with a cup of tea, some with morning paper, his Highness prefers a virgin."

اس سے آپ کو ان کے طرز تحریر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

# 50

جب 1941 میں امریکا بھی جنگ عظیم دوم میں کود پڑا تو آہستہ آہستہ جنگ کا پانسا پلٹنے لگا۔ شمالی افریقہ میں نازی جرنیل رومیل کو عبرت ناک شکست ہوئی، اٹلی نے ہتھیار ڈال دیے اور مسولینی کو اس کے اپنے ہی لوگوں نے درخت پر لٹکا کر پھانسی دے دی۔ [اٹلی کے محاذ کا ایک افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ انگریزی کے عظیم ترین امریکی شاعر اور نقاد ایذرا پاؤنڈ، جو اپنا بیشتر وقت اٹلی میں گزارا کرتے تھے، جنگ عظیم دوم کے آغاز پر وہیں مقیم تھے اور ان کے لیے وہاں سے نکلنا ممکن نہ رہا۔ اطالوی فاشسٹوں کے دباؤ پر انھوں نے فاشزم کے حق میں اور امریکا کے خلاف ریڈیو پر تقریریں شروع کر دیں۔ اٹلی کے ہتھیار ڈالنے پر امریکی فوج نے انھیں گرفتار کر لیا۔ اس وقت کے امریکی صدر ٹرومین کے حکم پر، جس کے سر جاپانی شہروں پر ایٹم بم گرانے کا سہرا بندھتا ہے، انھیں چھ فٹ لمبے اور چھ فٹ چوڑے آہنی پنجرے میں بند کر کے امریکا لے جایا گیا۔ جس کے نتیجے میں ان کا ذہنی بریک ڈاؤن ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے انھیں ذہنی مریض قرار دے دیا، یوں وہ غداری کے مقدمے سے تو بچ گئے مگر بارہ سال تک واشنگٹن کے پاگل خانے میں سڑتے رہے۔]

یورپ میں نازی افواج دوطرفہ گھیرے میں آ گئیں۔ ایک طرف سوویت فوجوں نے ان کا ناطقہ بند

کر رکھا تھا اور دوسری طرف جنرل آئزن ہاور کی زیر قیادت اتحادی فوجیں یورپ میں داخل ہو گئیں اور مارو حاڑ کرتی جرمنی پہنچ گئیں۔ان کے طیاروں نے جرمنی کے صنعتی شہر ڈریسڈن (Dresden) پر carpet bombing [اندھا دھند بم باری جس سے شہر کا کوئی بھی حصہ محفوظ نہ رہے] کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ جرمنی نے ہتھیار ڈال دیے اور ہٹلر نے اپنی مستقل داشتہ اور ایک دن کی دلہن ایوا بران سمیت خود کشی کر لی۔ جرمنی دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔مشرقی جرمنی پر سوویت یونین اور مغربی جرمنی پر اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا۔ ملک کا صدر مقام برلن اگرچہ روس کے مقبوضہ علاقے میں محصور ہو گیا تھا، پھر بھی اتحادیوں نے اپنے طیاروں کے ذریعے اس کے نصف حصے پر اپنا قبضہ جما لیا۔اسے مغربی برلن کا نام دیا گیا۔بعد میں روسیوں نے شہر کے دونوں حصوں کو بالکل ہی ایک دوسرے سے الگ تھلگ کرنے کے لیے شہر کے درمیان میں دیوار تعمیر کر دی جسے دیوار برلن کا نام دیا گیا۔

مشرقی محاذ پر جاپانی فوجیں مشرقی ایشیا کے تمام ممالک کو روندتی برما (موجودہ میانمر) پہنچ گئیں۔ انھوں نے ایک دو مرتبہ ہندوستان کے شہر کلکتہ پر بھی بم باری کی مگر انگریزوں نے امریکی اور ہندوستانی فوجوں کے تعاون سے جنگ کا پانسا پلٹ دیا۔جنگ کو جلد از جلد ختم کرنے کے لیے امریکا نے جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا دیے۔جاپان نے ہاتھ جوڑ دیے اور امریکی شرائط پر جنگ ختم کر دی۔حیران کن بات یہ ہے کہ امریکیوں نے ایٹم بم ایشیا میں استعمال کیے، یورپ میں نہیں۔کیا یہ بھی نسلی امتیاز تھا؟

جنگ کے فوراً بعد برطانیہ میں عام انتخابات ہوئے۔ووٹروں کی دانست میں چرچل جنگ کے لیے تو بہترین قائد تھا مگر کیا وہ زبوں حال معیشت کو سنبھال لے گا؟ ان کے خیال کے مطابق اس میں اس کی اہلیت نہیں تھی، چنانچہ انھوں نے اقتدار لیبر پارٹی کو بخش دیا۔

## 51

چودھری ولی محمد گوہیر اصلاً رہنے والے تو نکودر کے قریب ایک گاؤں گوہیر کے تھے مگر ان کی مستقل رہائش ہمارے گاؤں میں تھی کیونکہ یہاں بھی ان کی زرعی اراضی تھی۔وہ ہمارے علاقے کے پہلے شخص تھے جنھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیم پائی تھی۔وہ کوئی کام دام نہیں کرتے تھے کیونکہ دونوں دیہاتوں کی زمینوں سے انھیں اتنی یافت ضرور ہو جاتی تھی کہ وہ اپنا گزارہ بخوبی چلا سکتے تھے۔وہ بلا کے بذلہ سنج،

لطیفہ گو بلکہ پھکڑ باز بھی تھے۔ ایسے ایسے فحش لطیفے سناتے تھے کہ آدمی ان کا منہ دیکھتا رہ جاتا تھا۔ انھیں خیالی منصوبے بنانے کا بھی بڑا چسکا تھا۔ وہ میرے ہم نام عبدالحمید چہڑی سرے اور مجھ پر خاص طور پر بہت مہربان تھے۔ حالانکہ وہ ادیب تھے نہ ادب سے ان کا دور کا بھی واسطہ تھا، انھوں نے گاؤں سے ایک ادبی رسالہ نکالنے کا پروگرام بنایا اور کہا، "ظاہر ہے اس کا ایڈیٹر میں خود ہوں گا، البتہ تم دونوں میرے نائب ہو گے مگر تمھارے عہدے کو لکھا کیا جائے گا؟" اس زمانے میں میرے ذہن پر "ہمایوں" سوار رہتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر تو اس کے مالک میاں بشیر احمد خود ہی تھے مگر ان کے نائب کی حیثیت سے یوسف ظفر کا نام چھپتا تھا اور انھیں جائنٹ (joint) ایڈیٹر لکھا جاتا تھا۔ میں نے عرض کیا، "جائنٹ ایڈیٹر کیسا رہے گا؟" چودھری صاحب نے ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر کے بغیر کہا، "یہ جھانٹ ایڈیٹر کیا ہوا؟" اور اس کے ساتھ ہی رسالہ نکالنے کا منصوبہ بھی ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

چودھری صاحب کا ایک وصف یہ تھا کہ وہ لوگوں کے مسائل بہت توجہ سے سنتے تھے اور انھیں حل کرانے میں ان کی ہر ممکن مدد کرتے تھے۔ جب 1938 میں چودھری چھوٹو رام ہمارے گاؤں میں تشریف لائے تھے، میرے کزن محمد بشیر کے مطابق ان کو وہاں لانے کا سہرا کسی حد تک ہمارے چودھری صاحب ہی کے سر بندھتا تھا۔

دریائے ستلج ہمارا "ان داتا" بھی تھا اور ہمارا سب سے بڑا دشمن بھی۔ "ان داتا" اس لیے کیونکہ اس کی وجہ سے آبپاشی کے لیے کنوؤں کو زیادہ گہرائی میں کھودنا نہیں پڑتا تھا اور یوں بیلوں کے لیے انھیں کھینچنا آسان ہوتا تھا۔ سیلاب کے دنوں میں دریا کے قریبی کنوؤں کی سطح آب اتنی بلند ہو جاتی تھی کہ آپ رسی کے بغیر ڈول کو کنوئیں میں ڈال سکتے اور بھر کر آسانی سے باہر نکال سکتے تھے۔ ان کنوؤں میں جھانکتے ہوئے بھی ڈر آتا تھا کہ کہیں بے دھیانی میں پاؤں پھسل گیا اور آدمی کنوئیں میں گر پڑا، پھر اس کے باہر نکلنے کا امکان نہ ہونے کے برابر رہ جاتا تھا۔ سردیوں میں دریا بہت پیچھے ہٹ جاتا اور یوں ان کنوؤں کی سطح آب دوبارہ قدرے نیچے چلی جاتی۔

یہی دریا جو سردیوں میں سویا رہتا تھا، بارش کے موسم میں پورے جلال پر آ جاتا تھا۔ اس کا پاٹ اتنا چوڑا ہو جاتا تھا کہ حد نظر تک پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ اس کی سیماب پا موجیں ہاتھی کی دھاڑ کی طرح شور مچاتی اتنی قوت سے کنارے سے ٹکراتیں کہ آس پاس کی ساری دھرتی دہلنے لگتی، اس میں لمبی چوڑی دراڑیں پڑنے لگتیں، زمین کے پہاڑ آسا تودے بنتے، دریا میں گرتے اور آناً فاناً ریزہ ریزہ ہو کر آنکھوں سے اوجھل ہونے لگتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے درجنوں ایکڑ اراضی دریا برد ہو جاتی۔ یہ منظر دل فریب بھی ہوتا

اور ہیبت ناک بھی۔

1945 کی سردیوں میں دریا کا پاٹ سکڑ کر لاہور کی نہر کے برابر رہ گیا۔ ریتلی تہہ پر اس کا پانی اتنا صاف شفاف ہو چکا تھا کہ آپ اسے پی بھی سکتے تھے اور اس میں اپنی شکل بھی دیکھ سکتے تھے۔ سطح اتنی پایاب تھی کہ آپ اس میں سے اپنے پاؤں پر چل کر دوسرے کنارے پر جا سکتے تھے۔ چودھری ولی محمد گوہیر کے ذہن میں دریا کو قابو میں لانے کا منصوبہ کلبلانے لگا۔ انھوں نے اردگرد کے تمام دیہاتوں میں منادی کرا دی کہ وہ اگلے روز صبح سویرے اپنی کسیاں اور آہنی تسلے لے کر دریا کے فلاں مقام پر پہنچ جائیں، دریا کا رخ تبدیل کرنا ہے۔ پہلے تو اکثر لوگوں نے اسے مذاق سمجھا اور ٹھٹھا کرنے لگے، بھلا دریاؤں کے رخ بھی تبدیل کیے جا سکتے ہیں۔ تاہم متعدد دیہاتوں کے نچلے اپنے سامان کے ساتھ معینہ مقام پر پہنچ گئے۔ انھوں نے سوچا ہوگا کہ اور کچھ نہیں، قدرے تفریح ہی ہو جائے گی۔ چودھری صاحب بنفس نفیس موقع پر موجود تھے، اس سے انھیں حوصلہ ہوا اور انھوں نے ان کی ہدایات کے مطابق دریا کی جنوبی جانب اچھے خاصے چوڑے نالے کی کھدائی شروع کر دی۔ دریا کی مٹی اور ریت سے تسلے بھرے جاتے اور انھیں نئے کھالے کے کناروں پر انڈیل دیا جاتا تاکہ وہ مزید اونچے ہو سکیں۔ جب شام کو اس کی اطلاع دوسرے لوگوں تک پہنچی، انھیں بھی جوش آ گیا اور اگلے روز وہ بھی جوق در جوق اپنے ساز و سامان کے ساتھ موقع پر وارد ہو گئے، اور کھدائی کے عمل میں شریک ہو گئے۔

چند دنوں میں چودھری صاحب کے منشا اور تسلی کے مطابق اچھا خاصا لمبا اور گہرا نالا کھد گیا، چنانچہ دریا کے عارضی کنارے میں، جو کوئی خاص اونچا نہیں تھا، خاصا چوڑا شگاف ڈالا گیا اور دریا کا پانی نئے نالے میں نئے رخ پر چلنے لگا۔ مزید اطمینان کے لیے پایاب دریا میں چھوٹا سا بند بنا دیا گیا۔ چودھری صاحب کا بظاہر خیالی منصوبہ کامیاب رہا۔ اس سال جب موسم برشگال آیا، ہمارے جانب اس میں کوئی سیلاب نہ آیا، وہ نئے راستے پر چلتا رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ اگلے سال وہ پھر اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ آ موجود ہوا اور چودھری صاحب کا نام گھر گھر گونجنے لگا۔

## 52

تحریک پاکستان زور شور سے جاری تھی کہ 1942 میں 26,25 دسمبر کی درمیانی شب کو وزیر اعظم پنجاب سر سکندر حیات اچانک انتقال کر گئے۔ وہ دو کشتیوں کے سوار تھے۔ ایک طرف وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے ساتھ

بنائے رکھنا چاہتے تھے، دوسری طرف وہ یونینسٹ پارٹی کے ہندو اور سکھ ارکان کو ناراض کرنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے تھے اور یہ دوطرفہ دباؤ ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ ان کی جگہ خوشاب کے ازلی ٹوڈی سر خضر حیات ٹوانہ وزیر اعظم منتخب ہو گئے۔ وہ ہر قیمت پر اپنی وزارت بچائے رکھنا چاہتے تھے، چنانچہ انھوں نے مسلم لیگ کے ساتھ پینگیں بڑھانے سے احتراز کیا اور یوں یونینسٹ پارٹی اور آل انڈیا مسلم لیگ کے مابین خلیج روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ انگریزوں نے مرحوم سر سکندر حیات کے بیٹے سردار شوکت حیات کو مصر کے محاذ سے فارغ کر دیا اور پنجاب کابینہ میں وزیر بنوا دیا۔ دریں اثنا پنجاب میں مسلم لیگ روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی اور تحریک پاکستان زور پکڑتی جا رہی تھی۔ جلد ہی پنجاب کے جاگیرداروں کو، جو ہوا کا رخ پہچاننے اور اپنے مفادات کا تحفظ کرنے میں بہت ماہر ہیں [یہ صورت حال آج بھی برقرار ہے]، احساس ہونے لگا کہ قیام پاکستان کا امکان بڑھتا جا رہا ہے، یونینسٹ پارٹی اور کانگرس کو خیر باد کہنا اور مسلم لیگ میں شامل ہونا شروع کر دیا۔ یوں انھوں نے بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے اسے ہائی جیک کر لیا۔ نئے شامل ہونے والوں میں میاں ممتاز دولتانہ، سر فیروز خان نون، بیگم شاہنواز، کانگریس کے صوبائی صدر میاں افتخار الدین اور بے چیدے کا لوٹا راجا غضنفر علی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پنجاب مسلم لیگ کے صدر علامہ محمد اقبال کے انتقال کے بعد فیروز پور کے نواب سر شاہنواز خان ممدوٹ صوبائی مسلم لیگ کی صدارت پر ہاتھ صاف کر چکے تھے اور 1942 میں ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادے نواب افتخار حسین خاں ممدوٹ یوں اس پر متمکن ہو چکے تھے جیسے یہ بھی ان کی خاندانی میراث ہو۔ چنانچہ جب 1946 میں ہندوستان کی مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا اعلان ہوا، پنجاب مسلم لیگ پر قابض ان جاگیرداروں کا اگر بس چلتا تو وہ پنجاب اسمبلی کی تمام نشستوں کے لیے اپنے ہی بھائی بندوں میں ٹکٹیں بانٹ دیتے مگر اس کا کیا علاج کہ صوبے کے بعض علاقوں میں جاگیردار تھے ہی نہیں، چنانچہ انھیں مجبوراً وہاں مہاتڑ سار لوگوں کو ٹکٹیں دینا پڑ گئیں۔ ان علاقوں میں ہمارا ضلع بھی شامل تھا اور یوں چودھری ولی محمد گوہیر کو، جو گزشتہ سال دریا کا رخ موڑ کر نام پیدا کر چکے تھے، ٹکٹ مل گئی۔

اگرچہ 1940 کی دہائی میں پنجاب میں مجلس احرار کا زور ٹوٹ چکا تھا مگر دوابہ بست جالندھر میں انھیں 1946 میں بھی خاصا اثر حاصل تھا۔ چودھری ولی محمد گوہیر کے مقابلے میں احرار نے شعلہ بیان مقرر مولانا محمد علی جالندھری کو ٹکٹ دی [1946 میں دیہاتوں میں بھی جالندھری کے جلسوں میں ہزاروں لوگوں کا مجمع اکٹھا ہو جاتا تھا، اس قسم کا ایک جلسہ میں نے اپنے گاؤں میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا]۔

ہمارے سکول کے بیشتر طلبا اور اساتذہ مسلم لیگ کی حمایت میں سرگرم عمل تھے۔ ہم لوگ اپنے اپنے

گاؤں میں جلوس نکالتے، گلے پھاڑ پھاڑ کر" لے کے رہیں گے پاکستان،" پاکستان زندہ باد،" "پاکستان کا مطلب کیا" " قائداعظم زندہ باد" وغیرہ کے نعرے لگاتے۔ بعض اوقات دو دو چار چار کی ٹولیوں میں دوسرے دیہاتوں میں بھی چلے جاتے، چند لوگ اکٹھے کرتے، اور کچی پکی تقریریں کرتے۔ دیہاتی طرح طرح کے سوالات کرتے۔ ہم کچھ کے جواب دے پاتے اور کچھ کے بارے میں کچھ نہ کہہ پاتے کیونکہ ہمیں ان کے جواب معلوم ہی نہیں ہوتے تھے۔ جب الیکشن ہوا، چودھری ولی محمد گوہیر معمولی سی اکثریت سے جیت گئے۔

## 53

1946 کے انتخابات میں مسلم لیگ کے کھمبے بھی اسی طرح جیت گئے تھے جس طرح 1970 کے انتخابات میں ذوالفقار علی بھٹو کے کھمبے جیتے تھے۔ [بھٹو کے ایک کھمبے کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ اس کا نام محمد اسمٰعیل تھا۔ وہ بے چارہ انتخابات سے پہلے سائیکلوں کے ٹائروں کے پنکچر لگا کر اپنا گزارہ کرتا تھا۔ جب پیپلز پارٹی کا غلغلہ بلند ہونے لگا، وہ بھی "روٹی کپڑے اور مکان" کے نعرے سے مسحور ہو گیا اور بھٹو کی پارٹی میں شامل ہو گیا۔ وہ میلسی کے قریب کرم پور کا رہنے والا تھا۔ میلسی کے کھچیوں، بھابھوں اور خاکوانیوں جیسے جاگیرداروں نے اس نئے طوفان سے دور رہنا ہی مناسب خیال کیا۔ جب پیپلز پارٹی کو میلسی کی صوبائی نشست کے لیے کوئی موزوں امیدوار ڈھونڈنے میں دشواری پیش آئی تو وہاں کے جیالوں نے از رہ تفنن محمد اسمٰعیل کا نام پیش کر دیا۔ یہ تو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آیا تھا کہ وہ کھچیوں کے مقابلے میں الیکشن جیت سکے گا مگر وہ نئی لہر پر سوار ہو کر انتخاب جیت گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ جب بعد ازاں جاگیرداروں اور وڈیروں نے جوق در جوق پیپلز پارٹی میں شامل ہونا، بھٹو نے دیوانہ وار انھیں گلے لگانا اور 1977 میں انھیں ٹکٹیں دینا شروع کر دیا، بے چارے محمد اسمٰعیل کا پتا کٹ گیا اور وہ کس مپرسی کی بھیانک تصویر بن گیا۔ اس نے آج کل کے جیالوں کی طرح دولت سمیٹنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ چنانچہ اپنا پیٹ پالنے کے لیے وہ دوبارہ ٹائروں کے پنکچر لگانے لگا۔]

1946 کے انتخابات میں مسلم لیگ کے جن کھمبوں نے دھڑلے سے کامیابی حاصل کی تھی، ان میں "ہمایوں" کے مالک اور ایڈیٹر میاں بشیر احمد بھی تھے۔ انھیں ضلع فیروز پور کے ایک حلقے میں ٹکٹ ملی تھی۔ انھیں ٹکٹ شاید اس لیے ملی تھی کہ وہ بیگم جہاں آرا شاہنواز کے کزن اور بہنوئی تھے۔ [ان کی اہلیہ گیتی آرا بیگم شاہنواز کی سگی بہن اور میاں سر محمد شفیع کی صاحبزادی تھیں۔] اس لیے کہ وہ "ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح"

جیسی نظمیں لکھا کرتے اور انھیں پمفلٹوں کی صورت میں جلسوں میں مفت تقسیم کرایا کرتے تھے۔ میاں صاحب دھیلی ڈھالی شخصیت کے مالک اور مرنجاں ومرنج آدمی تھے۔ سیاست سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا اور اپنے حلقہ انتخاب کو تو انھوں نے شاید اپنے قدوم میمنت لزوم سے کبھی نوازا بھی نہیں ہوگا مگر جیت وہ بھی گئے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ اپنی اس نئی حیثیت اور بیگم شاہنواز کی رشتے داری کی بدولت ترکی میں پاکستان کے پہلے سفیر مقرر ہو گئے مگر کام وہاں انھوں نے دھیلے کا بھی نہ کیا۔

چودھری ولی محمد گوہیرا گرچہ دریا کا رخ تبدیل کرانے کے بعد تحصیل نکودر میں بہت شہرت حاصل کر چکے تھے مگر اصلاً انھیں غیر معروف آدمی ہی کہنا چاہیے۔ امیدوار کی حیثیت سے ان کا مولانا محمد علی جالندھری سے کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے ارائیں ہونے کا بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے جس طرح کہ 1938 کے الیکشن میں میاں عبدالرب یا 2013 کے الیکشن میں وہاڑی کے ایک حلقے کے آزاد امیدوار طاہر اقبال اور ہارون آباد کے حلقے سے جنرل ضیاءالحق کے بیٹے اعجاز الحق نے اٹھایا تھا، کیوں کہ ان کے مخالف امیدوار جالندھری بھی ارائیں تھے، چنانچہ اصلاً انھیں بھی مسلم لیگ کا کھمبا ہی تصور کیا جانا چاہیے۔

1946 کے انتخابات میں مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے لیے مختص تمیں کی تمیں اور پنجاب اسمبلی میں 86 میں سے 77 نشستیں جیت لیں۔ بقیہ نو نشستیں یونینسٹ پارٹی کے حصے میں آئیں۔ سر خضر حیات ٹوانہ نے کانگرس اور اکالی دل کے ساتھ مل کر دوبارہ حکومت بنائی اور مسلم لیگ منہ دیکھتی رہ گئی۔ نئی کابینہ میں جو مسلم وزرا تھے، ان میں ایک نواب مظفر علی قزلباش، جن کی اندرون شہر (لاہور) حویلی سے ہر سال تعزیہ کا جلوس برآمد ہوتا ہے، اور دوسرے مظفر گڑھ کے میاں محمد ابراہیم برق تھے جن کے متعلق اس زمانے کے مسلم اخبارات میں اکثر لکھا جاتا تھا: ''برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر۔''

کانگرس کے جو وزیر بنے، ان میں ایک بھیم سین سچر تھے [وہ بھارت کے مشہور صحافی کلدیپ نائر کے سسر تھے]۔ اکالی وزرا میں سردار بلدیو سنگھ شامل تھے۔ وہ اس زمانے کے مشہور انگریزی اخبار ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کو، جس میں انیسویں اور بیسویں صدی کے مشہور امپریلسٹ شاعر رڈیارڈ کپلنگ کام کر چکے تھے، خرید کر بہت زبردست مقام حاصل کر چکے تھے۔ ہماری تحصیل سے سکھوں کی نشست پر سردار سورن [تلفظ: س و رن] سنگھ صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ وہ نکودر کے قریب جڑواں دیہات سر یہ شنگر کے رہنے والے تھے۔ جب سردار بلدیو سنگھ ہندوستان کی عبوری حکومت میں وزیر دفاع مقرر ہو کر دلی چلے گئے، سردار سورن سنگھ ان کی جگہ صوبائی وزیر بن گئے۔ 1965 کی پاک بھارت جنگ کے دوران میں وہ بھارت کے وزیر خارجہ تھے۔ جنگ کے بعد جب کشمیر کے متعلق دونوں ملکوں کے وزرائے خارجہ

کے مابین مذاکرات ہوئے، انھوں نے پاکستان کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کو پانی تک نہ پکڑایا۔

## 54

مارچ 1946 میں میں نے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔

اس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کا شعبۂ امتحانات بہت سمجھدار اور قابل لوگوں کے ہاتھ میں تھا، وہ جو کچھ کہتے تھے اس پر عمل بھی کر کے دکھاتے تھے۔ یونیورسٹی کے رجسٹرار تو میاں بشیر احمد تھے مگر شعبۂ امتحانات کے ناظم پروفیسر مدن گوپال (ایم جی) سنگھ تھے۔ پروفیسر ایم جی سنگھ اصلاً گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔ بی اے کے طلبا کے لیے ان کا انگریزی شاعری کا انتخاب اپنی مثال آپ تھا۔ انھوں نے شعرا کے جو تعارف اور ہر نظم پر جو حواشی تحریر کیے تھے، بعد کا کوئی بھی مجموعہ اس کا ہم پلہ ثابت نہ ہو سکا۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد پروفیسر سراج الدین نے اپنا لچ تل دیا اور اپنی مرتب کردہ کتاب داخل نصاب کرا دی۔

یونیورسٹی امتحان سے کوئی ایک ماہ قبل مطبوعہ ڈیٹ شیٹ تمام سکولوں کو بھیج دیا کرتی تھی۔ امتحان ہمیشہ یکم مارچ سے شروع ہوتا تھا اور اگر اس روز اتوار ہوتا پھر دو مارچ سے۔ ڈیٹ شیٹ کے آخر میں تحریر ہوتا تھا کہ نتیجے کا اعلان 31 مئی کو ہوگا اور یہ 31 مئی ہی کو ہوتا تھا، اس میں ایک دن کی بھی کمی بیشی نہیں ہوتی تھی۔ اس زمانے میں اخبارات نتیجہ نہیں چھاپتے تھے۔ یونیورسٹی گزٹ شائع کرتی تھی۔ یہ بہت ضخیم ہوتا تھا مگر چھپتا عین وقت پر تھا اور دور دراز کے سکولوں میں بھی عموماً بذریعہ ڈاک 31 مئی کو پہنچ جاتا تھا۔

یوں تو یونیورسٹی کا ہر کام تقریباً ٹھیک ٹھاک ہوتا تھا مگر اس کے شعبۂ امتحانات کے عملے کے بعض ارکان خاصے ایذا پسند (Sadist) معلوم ہوتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ دیہاتی طلبا کے امتحانی مرکز ان کے گھروں سے زیادہ سے زیادہ دور کے مقامات پر رکھے جائیں۔ اصولاً ہمارا امتحانی مرکز ہمارے اپنے سکول میں بننا چاہیے تھا کیونکہ اس کے طلبا کی تعداد اچھی خاصی ہوتی تھی مگر یہ بنا کبھی نہیں۔ پہلے طلبا کو امتحان دینے کے لیے نکودر جانا پڑتا تھا مگر 1946 میں جب ہماری باری آئی مرکز کالے کوسوں دور نور محل بنا دیا گیا۔ نکودر پھر بھی جانا پہچانا تھا۔ اردگرد کے دیہاتوں میں اکثر طلبا کے رشتے دار ہوتے تھے، وہ ان کے ہاں ٹھہر جاتے یا پھر نکودر میں کسی مکان میں کوئی کمرا کرائے پر لے لیتے مگر کھانے پینے کا انتظام خود کرنا پڑتا۔ دونوں صورتوں میں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا اور امتحان کی تیاری سکون و اطمینان سے کرنا

تقریباً ناممکن ہو جاتا۔

نورمحل تحصیل پھلور میں واقع تھا۔ اگر سیدھا راستہ اختیار کیا جاتا تو ہمارے گاؤں سے دس کوس سے زیادہ کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا مگر جانا پیدل پڑتا تھا کیونکہ بیچ میں پکی سڑک تو دور کی بات، ڈھنگ کی کوئی کچی سڑک بھی نہیں تھی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ آپ پہلے پیدل مبت پور جاتے، وہاں سے تانگہ پکڑتے اور نکودر پہنچتے۔ نکودر سے فیروز پور سے لدھیانہ جانے والی ریل گاڑی میں سوار ہوتے اور نورمحل کا رخ اختیار کرتے۔ وہاں رہائش کا مسئلہ نکودر سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ نکودر تحصیل کا صدر مقام تھا، منڈی ٹاؤن تھا اور آبادی کے اعتبار سے نورمحل سے کہیں بڑا قصبہ تھا، اس لیے کرائے پر مکان یا کمرا نسبتاً آسانی سے مل جاتا تھا۔ نورمحل اس کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا، وہاں کرائے پر مکان یا کمرا حاصل کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ مجھے ابا چھوڑنے آئے تھے۔ ان کے کوئی واقف کار نورمحل میں رہتے تھے۔ ان کے گھر میں ایک تنگ و تاریک کمرا مل گیا مگر اس شرط پر کہ مجھے اس کا کرایہ اور کھانے پینے کے اخراجات ادا کرنا ہوں گے۔ اجنبی لوگ، اجنبی ماحول۔ پورے انہماک سے امتحان کی تیاری کرنا خاصا امر دشوار بن گیا۔

نورمحل کسی زمانے میں ایک معمولی سا گاؤں ہوا کرتا تھا اور اس کا نام پھلور تھا۔ پھر ایک روز بیٹھے بٹھائے اس کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہندوستان پر مغلوں کی حکومت تھی اور نورالدین محمد جہانگیر سریر آرائے تخت تھا۔ شہزادگی کے زمانے میں اس کا نام سلیم تھا۔ وہ جلال الدین محمد اکبر کی اکلوتی اولاد تھا اور بڑی منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا، چنانچہ وہ باپ کو بے حد عزیز تھا جو اس کا ہر ناز نخرہ برداشت کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ شہزادہ سلیم دل پھینک قسم کا نوجوان تھا۔ اسے پہلے ایک شاہی کنیز انارکلی سے عشق ہوا مگر شہنشاہ معظم کی غیرت کو اپنے اکلوتے لخت جگر کی بھی یہ جسارت ایک آنکھ نہ بھائی اور اس نے اس کی محبوبہ کو زندہ دیوار میں چنوا دیا تاکہ بیسویں صدی میں امتیاز علی تاج اس پر ڈراما لکھ سکے اور ایم آصف فلم بنا سکے۔ اس نے ایک اور کام یہ کیا کہ انارکلی کا مقبرہ لاہور میں بنوا دیا تاکہ جب انگریز پنجاب پر قبضہ کرلیں تو اس کے باغات میں سول سیکرٹریٹ اور کافی بڑے مقبرے کے در و دیوار کے اندر نادر دستاویزات کی ذخیرہ گاہ بنا سکیں جن کا کماحقہ مطالعہ کرنے کے بعد انہیں نا گی غالب کو اس کی اوقات یاد دلا سکے، اور لاہور یے اپنے مشہور ترین بازار کو اس کے نام سے موسوم کرسکیں۔ کتنا سیانا اور دور اندیش شہنشاہ تھا، اسی لیے تو چٹا ان پڑھ ہونے کے باوجود وہ اتنے بڑے ملک پر حکومت کر سکا اور اسے سونے کی چڑیا بنا سکا جس کا شہرہ سن کر سات سمندر پار انگلستان کی ملکہ الزبتھ اول کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے اس

میں اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے تاجروں کی ایسٹ انڈیا کمپنی بنوائی اور اسے ہندوستان روانہ کر دیا۔

انارکلی کو دیوار میں زندہ چنوانے کے بعد اکبر نے سلیم کی کے بعد دیگرے کئی شادیاں کرا دیں تا کہ اس کا دھیان بنا رہے اور وہ کسی نئی ایری غیری لڑکی کے عشق میں نہ پھنس سکے [ جہانگیر کی اہم ترین بیوی اس کی اپنی ماں اور اکبر کی محبوب ترین بیوی جودھا بائی کی بھتیجی مباوتی بائی تھی ] مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایران سے ایک انتہائی حسین و جمیل دوشیزہ مہرالنسا، جو شاید مغل شہزادے کو اپنے دام الفت میں پھانسنے اور ہندوستان کی ملکہ بننے کے خواب دیکھا کرتی تھی، اپنا مقدر آزمانے اپنے باپ غیاث الدین اور بھائی آصف جاہ کی معیت میں مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے دارالسلطنت فتح پور سیکری پہنچ گئی، شہنشاہ کے دربار تک رسائی حاصل کی اور شاہی محل کے باغات میں گھومنے پھرنے کا پروانہ۔

شہزادہ سلیم ناصر کاظمی سے بھی زیادہ کبوتر اڑانے کا شوقین تھا۔ ایک روز وہ ہاتھ میں دو کبوتر پکڑے شاہی محل کے باغات میں آ نکلا۔ وہاں مہرالنسا پہلے ہی چہل قدمی میں مصروف تھی۔ شہزادے کی سرسری نظر اس پر پڑی۔ اس نے اپنے دونوں کبوتر اسے پکڑائے کیونکہ اسے کوئی ضروری کام یاد آ گیا تھا۔ شاید اس کا پیشاب نکلا جا رہا تھا۔ جب وہ واپس آیا، مہرالنسا کے ہاتھ میں صرف ایک کبوتر تھا۔ شہزادے نے پوچھا: ''دوسرا کبوتر کہاں گیا؟'' جواب ملا: ''وہ تو اڑ گیا۔'' ''کیسے؟'' ''ایسے۔'' مہرالنسا نے جواب دیا اور کبوتر ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ شہزادہ اس کی اس ادا پر مر مٹا اور اب جو اس نے اسے غور سے دیکھا، وہ اسے کوہ قاف کی پری نظر آئی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں اور آن کی آن عشق کی آگ میں جلنے لگے۔ شہنشاہ معظم جلال الدین محمد اکبر کو جب یہ نیا شگوفہ کھلتا دکھائی دیا تو اسے اپنی تمام تدبیریں اور پیش بندیاں خاک میں ملتی نظر آئیں، اسے اس کا صرف ایک ہی اُپائے سوجھا۔ اس نے مہرالنسا کی شادی جھٹ پٹ اپنے ایک افغان جرنیل شیر افگن سے کرا دی۔ ساتھ ہی اس نے نئے نویلے دلہا کی پوسٹنگ سینکڑوں میل دور بنگال میں کر دی اور چٹکی بجاتے انھیں وہاں روانہ کر دیا۔ شہزادہ سلیم دوبارہ ہاتھ مسلتا رہ گیا۔

1605 میں دکن کی جنگوں سے بیزار ہو کر جابر و قہار [ شہزادہ سلیم کے نزدیک ] با جلال و با رعب شہنشاہ والی تبار جلال الدین محمد اکبر راہی ملک عدم ہو گیا اور اس کا اکلوتا بیٹا اس کی جگہ نور الدین محمد جہانگیر کا لبادہ پہن کر سریر آرائے تخت ہو گیا۔ وہ اپنے باپ کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے پہلے انارکلی اور پھر مہرالنسا سے محروم تو ہو چکا تھا مگر عشق کی آگ وہ آگ ہے جو بقول غالب بجھائے نہ بجھتی نہیں۔ مہرالنسا کی محبت کی چنگاریاں ابھی تک اس کے قلب حزین میں سلگ رہی تھیں۔ اس نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی پہلا کام آج کی زبان میں یہ کیا کہ اپنے حریف جرنیل شیر افگن کو eliminate (ٹھکانے لگانا) کرنے کا حکم

دے دیا۔ جب نئے شہنشاہ کے حریف کا پتا صاف ہو گیا، اس کی بیوہ شاہی محل میں پہنچا دی گئی۔ اگر چہ مہر النسا ایک بیٹے کی ماں بن چکی تھی، اس کے ملکوتی حسن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وسیع و عریض سلطنت کے مالک شہنشاہ جہانگیر نے گڑگڑا کر اس سے پوچھا: "بول، میرے دل کی رانی، مجھ ناچیز کو اپنی غلامی میں قبول کرو گی؟ تمام شاہی اختیارات کی مالک تم ہو گی، اس بندۂ بے دام کو تو نہیں چاہیے، بصرف تمھاری نگاہ التفات اور ایک پیالۂ مے ناب۔" ایجاب و قبول ہو گیا۔ جہانگیر کو محسوس ہوا کہ مہر النسا کے چکا چوند حسن سے اس کے محل کے در و دیوار جگمگا اٹھے ہیں، اس نے ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر کے بغیر اسے "نورمحل" کا خطاب بخش دیا۔ یہ تو کہیں بعد میں اس پر منکشف ہوا کہ مہر النسا کا حسن تو حسن ملکوتی ہے اور کوہ قاف کی پریوں کے حسن کو بھی شرماتا ہے، وہ مس پیلس نہیں، مس ورلڈ بلکہ مس یونیورس کہلائی جانے کی مستحق ہے اور یوں اس نے اپنے عطا کردہ خطاب میں ترمیم کی اور ترقی دے کر مہر النسا کو "نورمحل" سے "نور جہاں" بنا دیا۔

انگریز وائسرائے اور پنجاب کے گورے گورنر اپنی گرمیاں شملہ میں گزارا کرتے تھے، مغل شہنشاہوں کی ترجیح جنت نظیر کشمیر ہوا کرتا تھا۔ جب جہانگیر مہر النسا کو اپنے حبالۂ عقد میں لے اور اسے نورمحل کے خطاب سے سرفراز کر چکا، گرمیوں کے موسم کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔ اس کے من میں خیال آیا کیوں نہ اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ ہنی مون کشمیر میں منایا جائے۔ چنانچہ جونہی اس کے منہ سے حکم نکلا، اس کی فوری تعمیل ہوئی۔ چند ہی دنوں میں تیاریاں مکمل ہو گئیں اور نو بیاہتا جوڑا اپنے لاؤ لشکر سمیت عازم کشمیر ہو گیا۔ راستے میں دریائے ستلج پڑتا تھا۔ اسے عبور کرنے کے لیے اس پر جھٹ پٹ کشتیوں کا پل بنایا گیا۔ دریا کے پار کچھ فاصلے پر ایک ننھا منا گاؤں تھا۔ شاہی اختیارات سے لیس اور نورمحل کی خطاب یافتہ مہر النسا کو یہ جگہ اتنی پسند آئی کہ اس نے چند دن کے لیے وہیں پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ شہنشاہ معظم نے سر تسلیم خم کر دیا۔ ملکہ عالیہ نے گاؤں کا نام اپنے نئے نام پر نورمحل رکھا اور وہاں ایک وسیع و عریض سرائے تعمیر کرنے کا حکم دے دیا۔ نورمحل شاہی مہندس (archictects) اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ انھوں نے کوئی وقت ضائع کیے بغیر سرائے کا نقشہ نورمحل کی، جو بہت باذوق خاتون اور شاعرہ تھی، specifications (تعمیری تفصیلات) کے مطابق تیار کر دیا۔ جب تک سرائے کی تعمیر مکمل نہ ہو گئی، وہ وہیں ٹکی رہی۔ یہ سرائے اتنی لمبی چوڑی تھی کہ وہاں کے ہی نہیں بلکہ دور دراز کے لوگ بھی [احمد مشتاق نے مجھے بتایا ہے کہ امرتسر والے بھی] جب کسی چیز کی وسعت کے متعلق مبالغہ آرائی کرنا چاہتے تھے، وہ اسے نورمحل کی سرائے سے تشبیہ دیتے تھے: "اوئے تیرا اللہ ہی کا آں نورمحل دی سراں،" "واہ واہ، کیا مکاں آں، پوری نورمحل دی سراں آں،" وغیرہ۔ [نورمحل کا پنجابی تلفظ بھی قدرے مختلف ہے۔] نورمحل پھیلتے پھیلتے اچھا خاصا قصبہ بن گیا۔ اردو کے

معروف شاعر اور مزاح نگار ابن انشا کا گاؤں بھی اس کے قریب تھا۔

جب میں امتحان دینے نورمحل پہنچا، جس سکول میں ہمارا امتحانی مرکز بنایا گیا تھا، وہ اسی سرائے میں واقع تھا۔ یہی نہیں اس میں تھانہ اور بعض دیگر دفاتر بھی قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔

نورمحل ضلع جالندھر کی تحصیل پھلور میں واقع ہے۔ شمال میں پھلور اور جنوب میں لدھیانہ ہے۔ دونوں کے بیچ صرف دریائے ستلج حائل ہے۔ پھلور میں مغلوں کے زمانے کا ایک قلعہ ہے جو خاصا لمبا چوڑا ہے۔ اب کا تو پتا نہیں مگر تقسیم ہند سے قبل پنجاب پولیس کا سب سے بڑا ٹریننگ سنٹر اسی قلعے میں کام کرتا تھا۔ اس کا کمانڈنٹ (commandant) ہمیشہ پنجاب پولیس کا کوئی سینئر انگریز افسر ہوتا تھا۔ 1950 میں جب ایم اے انگریزی کرنے کے لیے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوا، ہمیں دو "بزرگ" طالب علموں کی رفاقت کا شرف بھی حاصل ہوا۔ ان میں سے ایک تو مسز ایلس فیض تھیں اور دوسرے راجا عبدالقادر۔ 1951 کے آغاز میں جب فیض احمد فیض پنڈی سازش کیس میں گرفتار ہو کر جیل پہنچ گئے، مسز فیض کو بادل ناخواستہ اپنا تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا کیونکہ ان کی دونوں بچیاں ابھی بہت چھوٹی تھیں۔ انھیں نہ صرف ان کی دیکھ بھال کرنا تھی بلکہ اپنی معاش کا بندوبست بھی کرنا تھا۔

راجا عبدالقادر راجا حسن اختر کے عزیز تھے جو بعد میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے دورِ صدارت میں قومی اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر منتخب ہوئے۔ خود راجا عبدالقادر ایم اے انگریزی میں داخلہ لینے سے قبل پولیس میں ملازم تھے۔ وہ غالباً سب انسپکٹر یا انسپکٹر تھے۔ وہ ادب شناس آدمی تھے اور پولیس کی ملازمت ان کے مزاج سے لگا نہیں کھاتی تھی، چنانچہ وہ مستعفی ہو کر ہمارے ساتھ آ ملے تھے۔ وہ بعد میں گورنمنٹ کالج ساہیوال میں کئی سال میرے رفیق کار بھی رہے۔ انھوں نے پولیس میں ملازمت کرنے کی تربیت پھلور ہی کے قلعے میں حاصل کی تھی۔ وہ ہمیں اکثر بتایا کرتے تھے کہ جس زمانے میں وہ پھلور میں پڑھتے تھے، پولیس ٹریننگ سنٹر کا کمانڈنٹ ایک انگریز افسر مسٹر ہارڈی تھا۔ وہ بڑا با اصول، نظم و ضبط کا پابند اور سخت جان افسر تھا۔ جون یا جولائی کا مہینا تھا۔ ایک روز دن کے دو بجے راجا عبدالقادر اور ان کے چند ساتھی نوٹس بورڈ پر ایک نوٹس پڑھ کر ہکّا بکّا رہ گئے جس پر یہ اطلاع درج تھی:

Mr Hardy, The Commandat of the Philour Training Centre was found napping at 1.45 p.m. in his office chair for ten minutes. As he was guilty of neglecting his duty, he is ordered to stand on the roof of the castle for ten minutes.

نوٹس کے نیچے مسٹر ہارڈی کے اپنے دستخط تھے۔

راجا عبدالقادر اور ان کے ساتھی اپنی حیرت پر قابو پائے بغیر صحن کی طرف بھاگے۔ انھوں نے نظریں اٹھا کر قلعے کی چھت کی جانب دیکھا۔ مسٹر ہارڈی اپنا سولا ہیٹ پہنے اور بازو اوپر اٹھائے چلچلاتی دھوپ میں کھڑے تھے۔ پھر بھی لوگ پوچھتے ہیں کہ انگریز محض اپنے پانچ چھ ہزار فوجیوں اور سویلین ہم وطنوں کے ساتھ اپنے ملک سے اتنی دور وسیع و عریض ہندوستان پر برما اور شری لنکا سمیت حکومت کیسے کر گیا اور اگر بیسویں صدی کی دو عظیم جنگیں اس کا کچومر نہ نکال دیتیں تو معلوم نہیں وہ کب تک ہمارے سروں پر سوار رہتا۔ اس کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ وہ جو قانون بناتا تھا، خواہ وہ کتنا ہی استبدادی کیوں نہ ہو، بہت سوچ سمجھ کر بناتا تھا، اس پر خود بھی عمل کرتا تھا اور دوسروں سے بھی کراتا تھا، ہماری طرح نہیں کہ دس منٹ میں دس قانون منظور کر لیتے ہیں اور پھر انھیں ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتے ہیں۔ قانون کی عدم تعمیل پر پکڑے صرف وہ لوگ جاتے ہیں جن کا کوئی والی وارث نہیں ہوتا، بڑے لوگ اور ان کی اولادیں ہر قانون سے مستثنیٰ ہیں۔

## 55

امتحان ختم ہونے کے بعد میں واپس اپنے گاؤں چلا گیا۔ چند روز بعد ان لوگوں نے، جن کے مکان میں میں ٹھہرا تھا، ابا سے شکایت کر دی کہ میں نے ان کے پورے پیسے ادا نہیں کیے۔ مجھے حیرت بھی بہت ہوئی اور دکھ بھی بہت پہنچا۔ ابا نے میری سنی ان سنی ایک کر دی، خوب ڈانٹ پلائی اور ساتھ ہی حکم دیا کہ میں فوراً نور محل پہنچوں اور ان لوگوں کا حساب صاف کروں۔ میں بہت دل برداشتہ ہوا اور گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے پاس جو چند کتابیں تھیں، وہ عبدالحمید چڑی مرے کو بیچ دیں۔ جو پیسے ملے جیب میں ڈالے اور اگلے روز فٹ مارچ کرتا نور محل پہنچ گیا۔ ان لوگوں کا ان کی تسلی کے مطابق حساب چکتا کیا اور تقریباً بوقت دوپہر ریلوے سٹیشن چلا گیا۔

گھر سے میں یہی تہیہ کر کے آیا تھا کہ جو ہو سو ہو، میں کبھی واپس نہیں جاؤں گا، تاہم جب میں نے ریلوے سٹیشن پر قدم رکھا، میرے ارادے متزلزل ہونے لگے۔ پلے دھیلا نہ پیسا، کر دی میلا میلا۔ میاں بھاگ کر جاؤ گے تو کہاں جاؤ گے! بھیک مانگو گے، در در کی ٹھوکریں کھاؤ گے؟ اس زمانے میں میرے بڑے بھائی عبدالمجید دلی میں محکمہ ٹیلی فون میں ملازمت کرتے تھے، معاً دل میں خیال آیا کیوں نہ ان کے پاس چلا جاؤں، گھر سے بھاگنے کا شوق پورا ہو جائے گا اور دلی کی بھی سیر ہو جائے گی۔

سچ پوچھیں تو صحیح معنوں میں یہ ریل گاڑی میں میرا پہلا سفر تھا۔ ویسے میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی

کہ دلی کہاں ہے اور وہاں پہنچنے کے لیے مجھے کون سی گاڑی پکڑنا ہوگی۔ اس موقع پر نوجوان بکنگ کلرک میرے بہت کام آیا۔ اس نے مجھے تھرڈ کلاس کی ٹکٹ دی۔ بالکل معمولی سی رقم تھی مگر اس زمانے کے حساب سے خاصی بڑی۔ میری جیب تقریباً خالی ہوگئی۔ اس کی ہدایات کے مطابق جب گاڑی آئی، میں اس میں سوار ہوگیا اور لدھیانہ پہنچ گیا۔ وہاں مجھے گاڑی تبدیل کرنا تھی۔ ادھر ادھر پوچھنے کے بعد معلوم ہوا کہ دہلی جانے والی گاڑی فلاں پلیٹ فارم سے ملے گی۔ یہ پلیٹ فارم تلاش کرنا بھی میرے لیے آزمائش سے کم نہیں تھا۔ بہر حال سیڑھیاں چڑھتے اترتے اور ایک دو پل عبور کرتے میں متعلقہ پلیٹ فارم پر پہنچ ہی گیا۔ اس زمانے میں لاہور اور پشاور سے متعدد ریل گاڑیاں براستہ دہلی بمبئی اور کلکتہ جاتی تھیں۔ سبھی تیز رفتار میل یا ایکسپریس ٹرینیں ہوتی تھیں۔ ان ٹرینوں کے ڈرائیور عموماً اینگلو انڈین ہوتے تھے۔ ان کی تنخواہیں براؤن لاٹوں کے ڈرائیوروں سے کہیں زیادہ ہوتی تھیں۔ وہ گلابی انگریزی بولتے تھے، (انگریزی کی سلینگ کی مشہور لغت Hobson Jobson انھیں لوگوں کی زبان کے الفاظ پر مشتمل ہے) ڈٹ کر پیتے تھے، ڈانس اور سلیپنگ کرتے تھے اور زندگی سے جی بھر کر لطف اندوز ہوتے تھے مگر بے حد فرض شناس ہوتے تھے، ڈیوٹی پر عین وقت پر پہنچتے تھے اور گاڑی بھی ہر سٹیشن پر عین وقت پر پہنچاتے تھے۔ بعد میں میں نے ان ریل گاڑیوں پر بار بار سفر کیے مگر مجھے یاد نہیں پڑتا کہ گاڑی کبھی لیٹ ہوئی ہو۔

لدھیانہ سے میں جس گاڑی میں سوار ہوا، وہ غالباً کلکتہ میل تھی۔ یہ لاہور سے شام پانچ یا چھ بجے روانہ ہوتی تھی۔ تھرڈ کلاس میں اگرچہ بھیڑ تھی مگر بیٹھنے کو جگہ مل گئی۔ چونکہ رات ہو چکی تھی، راستے میں کبھی کبھی اونگھ آجاتی تھی مگر آنکھ فوراً کھل جاتی۔ یاد نہیں کہ راستے میں کون کون سا سٹیشن آیا اور گزر گیا مگر سرہند شریف کا نام آج بھی ذہن پر نقش ہے جہاں مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ ابدی نیند سو رہے ہیں اور جن کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے مگر زائرین میں سکھوں اور ہندوؤں کی تعداد کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

آدھی رات کے قریب گاڑی پہلے انبالہ شہر اور پھر انبالہ چھاؤنی پہنچی۔ انبالہ اردو کے ممتاز غزل گو ناصر کاظمی کا آبائی وطن تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے کے ایک اور شاعر غلام بھیک نیرنگ، فی البدیہہ گوئی میں اپنی مثال آپ اور اپنے عہد کے معروف صحافی وقار انبالوی بھی وہیں کے تھے۔ ناصر کاظمی اکثر بتایا کرتے تھے کہ انبالہ شہر میں پنجابی مگر چھاؤنی میں خالص اردو بولی جاتی تھی۔ اس لحاظ سے انبالہ چھاؤنی کا تعلق پنجاب سے کم اور یوپی سے زیادہ بنتا تھا۔ اس صورت حال کا اثر ریل گاڑیوں پر بھی پڑا۔ بجائے اس کے وہ دلی جانے کا براستہ پانی پت اور کرنال کا سیدھا راستہ پکڑتیں، وہ دریائے جمنا کا پل پار کرتیں اور یوپی میں داخل ہو جاتیں۔ راستے میں یوپی کے مشہور شہر سہارن پور اور میرٹھ آتے۔ دیوبند بھی اسی

لائن پر واقع ہے۔ لاہور کی طرح دلی کا بھی شاہدرہ ہے۔ جب ہماری گاڑی شاہدرہ پہنچی، دن خاصا چڑھ چکا تھا۔ گاڑی نے انگڑائی لی، بیتی بھاگی اور ایک بار پھر دریائے جمنا کا پل پار کرنے لگی۔ یہ پل دو منزلہ تھا، نیچے ریلوے لائن اور اوپر سڑک تھی۔ لیجیے صاحب، ہم دلی پہنچ گئے۔

بھائی جان پہاڑ گنج میں رہا کرتے تھے۔ میرے پاس کوئی سامان تھا نہ جیب میں کوئی خاص رقم۔ میں ننگ ملنگ پیدل ہی چل پڑا۔ پیدل چلنا میرے لیے کوئی باعث عار تھا نہ باعث آزار۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ پہاڑ گنج کہاں ہے، کس طرف ہے اور کتنی دور ہے۔ بس اللہ کا نام لے کر اور لوگوں سے پوچھتا پچھاتا چل پڑا۔ راستے میں کہاں کہاں سے گزرا کچھ یاد نہیں رہا، صرف حوض قاضی کا نام حافظے میں محفوظ رہ گیا ہے۔ بہر حال بالآخر میں منزل مقصود پر پہنچ ہی گیا۔ خوش قسمتی سے اس روز اتوار تھا اور بھائی جان گھر پر ہی تھے۔ جب میں نے کنڈی کھٹکھٹائی، وہ باہر نکلے۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انھوں نے میری کتھا سنی اور جھٹ پٹ ابا کو خط لکھ دیا جو میری تلاش میں نور محل کا چکر لگا چکے اور مایوس واپس جا چکے تھے۔ بھائی دلی سے خوب واقف تھے، انھوں نے مجھے شہر کے کونے کونے کی سیر کرائی اور قلعہ معلی، جامع مسجد، قطب صاحب کی لاٹھ، ہمایوں کا مقبرہ اور معلوم نہیں کون کون سا تاریخی مقام دکھایا، اس کے ساتھ ہی حضرت نظام الدین اولیاؒ اور امیر خسروؒ کے مزاروں کی زیارت کرائی۔ ہمایوں کا مقبرہ اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ یہ پہلا مغل مقبرہ ہے جس کے گرد چار باغ بنایا گیا۔ اس انتہائی شاندار طرز تعمیر کی معراج تاج محل ہے۔ ہمایوں کے مقبرے کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کی چھت پر بھول بھلیاں بنی ہوئی ہیں۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو ان بھول بھلیوں سے باہر نکلنا میرے لیے تقریباً ناممکن ہو جاتا مگر بھائی جان بہت ماہر معلوم ہوتے تھے، وہ مجھے اندر گھما پھرا کر بآسانی باہر نکال لائے۔

دن کے وقت بھائی جان تو اپنے دفتر چلے جاتے، میں یا تو گھر پر پڑا رہتا اور عموماً ''ڈان'' اخبار پڑھتا رہتا یا پھر اکیلا ہی ادھر ادھر گھومنے پھرنے نکل جاتا۔ ایک روز نئی دہلی کے جدید ترین شاپنگ سنٹر اور تجارتی مرکز ''کناٹ پلیس'' (Connaught Place) جا پہنچا۔ وہاں ایک شخص پان کھا رہا اور ادھر ادھر پیک کے چھینٹے اڑا رہا تھا۔ وہ انتہائی اجلے سفید کرتے اور سفید پاجامے میں ملبوس تھا، شکل صورت سے بہت شریف اور مہذب معلوم ہو رہا تھا مگر وہ جس انداز سے پانی کے پیک سے ادھر ادھر بیل بوٹے بنا رہا تھا، مجھے بہت عجیب محسوس ہوا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کسی شخص کو پان کھاتے دیکھا تھا۔

قریب ہی ایک پٹھان اپنے کندھے پر کشمیری شالیں لٹکائے کھڑا تھا۔ وہ کسی انگریز کو ایک شال دکھا رہا اور اس کے قصیدے پڑھ رہا تھا۔ دونوں کے مابین شال کی قیمت کے بارے میں سودے بازی ہو رہی

تھی، پٹھان سو روپے مانگ رہا تھا اور انگریز پانچ روپے دے رہا تھا۔ میں کھڑا تماشا دیکھتا رہا، بالآخر دس روپے پر سودا ہو گیا۔

چند روز کے بعد میں واپس آ گیا۔ ابا نے مجھے کہا تو کچھ نہیں، صرف نائی کو بلا کر میرا مونڈن کرا اور سر رگڑوا دیا۔

## 56

1943 میں بنگال میں قحط پڑا جس میں ایک اندازے کے مطابق کم از کم تیس لاکھ انسان فاقہ کشی کا شکار ہو گئے۔ اس بھیانک صورت حال کا ذمے دار کون تھا، اس کے متعلق متضاد آرا پیش کی جاتی ہیں۔ ایک بنگالی مورخ مدھوشری مکرجی نے اس کا سارا الزام چرچل پر دھرا ہے جس کے حکم پر ہندوستانیوں کے منہ سے نوالہ چھین کر اناج مشرق وسطیٰ، افریقہ اور یورپ میں برسرپیکار اتحادی افواج کو پہنچایا جاتا رہا حالانکہ ان کے پاس اس کی کوئی کمی نہیں تھی۔ چرچل اس کا ذمے دار خود ہندوستانیوں کو ٹھہراتا تھا جو اس کے خیال میں خرگوشوں کی طرح بچے پیدا کرتے رہتے ہیں اور کہیں بس کرنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ بعض لوگ یہ کہتے تھے کہ گزشتہ چند سالوں سے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں خشک سالی کی وجہ سے فصلیں خراب ہوتی رہی تھیں۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو، قحط بے حد خوف ناک تھا۔ اس صورت حال سے اس زمانے کے ادیب بھی بے حد متاثر ہوئے۔ کرشن چندر کا ایک بہترین افسانہ "بھوکا ہے بنگال" اس کی بہت اچھی مثال ہے۔

1943 میں ہندوستان کا وائسرائے لارڈ لنلتھگو ریٹائر ہو گیا اور توقع کے برعکس ہندوستانی فوج کا کمانڈر انچیف لارڈ ویول وائسرائے کے عہدے پر متمکن ہو گیا حالانکہ چرچل اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ 1943 میں جنگ میں انگریزوں کا ویسے ہی برا حال تھا اور ہر دم سر پر خطرہ سوار رہتا تھا کہ کہیں جاپانی ہندوستان میں ہی نہ داخل ہو جائیں، اوپر سے قحط کا عذاب نازل ہو گیا۔ وائسرائے کا عہدہ سنبھالتے ہی ویول نے ہندوستانی فوج کو حکم دیا کہ فاقہ کش بنگالیوں کے مصائب کم کرنے کے لیے ان کے لیے چاول کی رسد بڑھا دی جائے۔ اس سے بتدریج حالات سنبھلنے لگے، قیمتیں کم ہونے لگیں اور قحط سے چھٹکارا پا لیا گیا۔

لارڈ ویول شعر و ادب کا رسیا تھا۔ وہ شاعر مزاج ہی نہیں، خود بھی شاعر تھا۔ اس نے جنگ عظیم دوم کے تاریک ایام کے دوران میں مختلف شاعروں کی نظموں پر مشتمل ایک مجموعہ ترتیب دیا تھا جو اس زمانے

میں بہت مقبول ہوا اور آج بھی برطانیہ میں بک رہا ہے۔

برطانوی وزیر اعظم چرچل کے برعکس وہ جنگ کے اختتام پر ہندوستان کو آزادی دینے کے حق میں تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک منصوبہ بھی ترتیب دیا تھا جسے Breakdown Plan کا نام دیا گیا۔ اس منصوبے کے دو مقاصد تھے: ہندوستان سے برطانوی باشندوں کا پر حفاظت انخلا اور آزاد مگر متحدہ ہندوستان کی تشکیل۔ پہلے مقصد کے لیے ہندو اکثریت والے جنوبی اور وسطی صوبوں سے برطانوی باشندوں کو مرحلہ وار نکالا جانا تھا اور دوسرے مقصد کے لیے بنگال اور پنجاب کی تقسیم کی دھمکی دینا تھا تاکہ مسلم لیگ کو مذہبی بنیادوں پر ہندوستان کی تقسیم سے باز رکھا جا سکے۔ اگرچہ برطانوی حکومت نے فوری طور پر تو اس منصوبے کو مسترد کر دیا مگر آخری مراحل میں اگلے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس کے چیدہ چیدہ اجزا اپنا لیے۔

1942 میں وزیر ہند لیو ایمری (Leo Amery)[1] برطانوی حکومت کی طرف سے ہندوستان کے مسئلے کو سلجھانے کے لیے ایک منصوبے کا اعلان کر چکا تھا جس کے تحت ملکی معاملات چلانے کے لیے وائسرائے کی انتظامی کونسل تشکیل دی جانا تھا جس میں اعلیٰ طبقوں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساوی نمائندگی ملنا تھا۔ اس منصوبے کے تحت اگرچہ گورنر جنرل کو ویٹو (veto) کا جو حق حاصل تھا، وہ ختم نہیں کیا جانا تھا مگر اس کا استعمال خال خال مواقع پر ہی ہونا تھا۔ اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے وائسرائے نے مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک کانفرنس منعقد کرنا تھا۔ اس کانفرنس کا انعقاد لارڈ ویول کے دور میں کہیں 25 جنوری 1945 کو ممکن ہوا۔ اس مقصد کے لیے کانگری لیڈروں کو جیل سے رہا کر دیا گیا مگر یہ کانفرنس ناکام رہی کیونکہ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح نے وائسرائے سے اصرار کیا تھا کہ صرف مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے اور کسی بھی غیر لیگی مسلمان کو کونسل کا رکن نہ بنایا جائے۔ وائسرائے اور کانگرس دونوں نے اس مطالبے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

جنگ عظیم دوم کے اختتام پر جب برطانیہ میں لیبر پارٹی برسر اقتدار آ گئی، اس نے ہندوستان میں پہلے تو فروری 1946 میں انتخابات منعقد کرائے اور پھر اس کی آزادی کے مسئلے کا جائزہ لینے اور اس کا حل تجویز کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دینے کا فیصلہ کیا۔ اسے کیبنٹ مشن کا نام دیا گیا۔ وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس،

---

1- اگرچہ وائسرائے کا عہدہ تخت ہی ہندوستانیوں کے لیے چھوٹے گئے تھے مگر خود وہ برطانوی حکومت کا محض ایک مہرہ ہوتا تھا اور اسے وہ پالیسی اختیار کرنا پڑتی تھی جس کا حکم برطانوی وزیر ہند (Secretary of State for India) دیتا تھا۔ جنگ عظیم دوم کے دوران میں لیو ایمری، جو کنزرویٹو پارٹی کا رکن تھا، وزیر ہند تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ایمری پنجاب یونیورسٹی کے اولین رجسٹرار اور گورنمنٹ کالج لاہور کے اولین پرنسپل لیٹنر کا بھانجا تھا اور یوپی کے شہر گورکھ پور میں پیدا ہوا تھا۔ وہ چرچل کے برعکس ہندوستان کو آزادی دینے کے حق میں تھا۔

وزیر تجارت سر سٹیفرڈ کرپس اور وزیر بحریہ اے وی الیگزینڈر اس کے ارکان تھے۔ مشن کے ارکان نے ہندوستان کا دورہ کیا، سیاسی زعما اور مختلف طبقۂ خیال کے لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور آخر میں اپنی تجاویز پیش کیں۔ ان کے تحت فیصلہ کیا گیا:

1. ہندوستان کو آزادی دے دی جائے گی مگر اس کا درجہ کینیڈا اور آسٹریلیا کی طرح ڈومینین (Dominion) کا ہوگا اور یہ مختلف صوبوں پر مشتمل ایک ڈھیلی ڈھالی کنفیڈریشن ہوگا۔
2. ملک کو تین خطوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ پہلا خطہ بلوچستان، سندھ، پنجاب اور شمالی مغربی سرحدی صوبے پر، دوسرا بنگال اور آسام پر اور تیسرا ہندوستان کے ان صوبوں پر جن میں ہندوؤں کی اکثریت تھی، مشتمل ہوگا۔
3. کنفیڈریشن کے پاس صرف تین محکمے — دفاع، امور خارجہ اور مواصلات — ہوں گے۔ باقی تمام محکمے خطوں اور صوبوں کو منتقل ہو جائیں گے۔

شروع میں تو کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے اس منصوبے کو منظور کر لیا مگر جب مولانا ابوالکلام آزاد کی جگہ پنڈت جواہر لال نہرو کانگرس کے صدر منتخب ہو گئے، انھوں نے چھوٹتے ہی اس منصوبے پر خط تنسیخ پھیر دیا۔ پنڈت نہرو کتنی ہی خوبیوں کے مالک کیوں نہ ہوں، مگر وہ تھے بے حد ambitious (جاہ طلب)۔ وہ ہندوستان کے وزیر اعظم بننا چاہتے تھے مگر پورے اختیارات، طمطراق اور جاہ و جلال کے ساتھ، انھیں کسی لولی لنگڑی کنفیڈریشن کا وزیر اعظم بننا قطعاً منظور نہیں تھا۔ انھوں نے دوٹوک الفاظ میں اعلان کر دیا کہ جب ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی کا اجلاس ہوگا، کانگرس کیبنٹ مشن پلان پر لفظ بلفظ عمل درآمد کرنے کی پابند نہیں ہوگی اور مرکز کو مضبوط بنانے کے لیے اس میں مناسب ترامیم کرے گی۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ان لوگوں کا، جو ہندوستان کو متحد رکھنا اور دیکھنا چاہتے تھے، خواب چکنا چور ہو گیا۔ برلا اور دوسرے بڑے بڑے مارواڑی سیٹھ بھی اس منصوبے کے زبردست مخالف تھے کیونکہ انھیں اندیشہ تھا کہ اپنی صنعتیں قائم کرنے کے لیے انھیں فرداً فرداً خطوں کی حکومتوں سے اجازت حاصل کرنا پڑے گا اور یوں ان کے لیے مشکلات پیدا ہوں گی۔ چونکہ کانگرس انھی لوگوں کے چندوں پر چلتی تھی اس لیے انھیں بڑا اثر و رسوخ حاصل تھا۔ انھوں نے سردار ولبھ بھائی پٹیل کو پٹی پڑھائی اور یوں وہ بھی منصوبے کے خلاف ہو گئے۔

31 مئی کو پنجاب یونیورسٹی نے میٹرک کے نتائج کا اعلان کر دیا مگر کسی وجہ سے نتیجہ اسی روز ہمارے سکول نہ پہنچ سکا۔ ہمیں اس کا شدت سے انتظار تھا، مگر جب ڈاکیا خالی ہاتھ آیا، ہمیں سخت مایوسی ہوئی۔ ہم چند

دوستوں کو اتنی لگن لگی ہوئی تھی کہ ہم سے اگلے دن کا انتظار نہ ہو سکا۔ ہم پیدل شاہ کوٹ پہنچے اور وہاں سے تانگے پر ریلوے سٹیشن۔ خوش قسمتی سے جلد ہی نکودر جانے والی ٹرین مل گئی۔ اس پر سوار ہوئے اور نکودر کے ریلوے سٹیشن پر جا اترے۔ بلا کی گرمی پڑ رہی تھی۔ پیاس سے ہمارے گلے خشک ہو چکے اور ان میں کانٹے پڑ چکے تھے۔ دودھ دہی کی دکان تلاش کی، اس کے مالک سے میٹھی لسی بنوائی، ندیدوں کی طرح لوہے کے بڑے بڑے گلاسوں پر جھپٹے، آن کی آن میں انھیں خالی کر دیا، تب کہیں جان میں جان آئی۔ نکودر بھی ہمارے لیے تقریباً اجنبی تھا۔ بہر حال معلوم ہوا کہ ڈی اے وی ہائی سکول سٹیشن سے کوئی خاص دور نہیں۔ لپک جھپک وہاں پہنچے۔ وہاں گزٹ آ چکا تھا اور سکول کے طلبا نتیجہ دیکھ کر اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ سکول میں کوئی خاص رونق نہیں تھی مگر دفتر ابھی کھلا تھا۔ اس میں کام کرنے والے بھلے لوگ تھے۔ انھوں نے ازرہِ مہربانی ہمیں گزٹ میں نتیجہ دیکھنے کی اجازت دے دی۔ بڑی بے چینی سے اپنے سکول کا صفحہ کھولا۔ نتیجہ دیکھ کر ہماری نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ تقریباً آدھی کلاس فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو گئی تھی اور فیل کوئی بھی نہیں ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یونیورسٹی اس سال خاصی فیاض ہو گئی تھی، جبھی تو مجھ جیسا دیہاتی طالب علم 850 میں سے 741 نمبر لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یونیورسٹی میں میری پانچویں پوزیشن آئی تھی۔ پہلی چاروں پوزیشنیں حسبِ معمول ڈی اے وی ہائی سکول لاہور کی تھیں۔ معلوم نہیں ان لوگوں کے پاس کون سی گیدڑ سنگھی تھی کہ کسی دوسرے کو آگے آنے کا موقع ہی نہیں دیتے تھے۔

## 57

اب مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے مجھے کسی کالج میں داخلہ لینا تھا لیکن کہاں؟ اس کا فیصلہ گھر والوں نے مجھ پر چھوڑ دیا۔ ہمارے گاؤں سے قریب ترین شہروں جالندھر اور کپورتھلہ میں اچھے کالج تھے لیکن میں نے اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) لاہور میں داخل ہونے کا عزم کر لیا۔ [اس وقت اسلامیہ کالج سول لائنز کا کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ قیامِ پاکستان کے کئی سال بعد ڈی اے وی کالج کی متروکہ عمارت میں بنا تھا۔] میرے فیصلے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یہ مسلمانوں کا قومی کالج تھا اور پنجاب کے ہر علاقے کے طالب علم اس میں جوق در جوق کھنچے چلے آتے تھے۔ پھر عبدالعزیز خالد پہلے ہی وہاں پڑھتا تھا اور میرے دوست غلام رسول فردوسی نے بھی وہیں داخل ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ میں چونکہ لاہور پہلی مرتبہ جا رہا تھا، اس لیے چچا میرے ساتھ ہو لیے۔ یہ سفر کئی مرحلوں پر مشتمل تھا۔ پہلے پیدل مہت پور اور مہت پور سے تانگہ پکڑ کر نکودر جانا تھا۔ نکودر

سے جالندھر تک دن میں تین چار مرتبہ ریل گاڑی چلتی تھی مگر لاہور پہنچنے سے پہلے جالندھر میں دلّی وغیرہ سے آنے والی کسی گاڑی میں سوار ہونا پڑتا تھا۔ ہم چونکہ بہت صبح سویرے روانہ ہوئے تھے، اس لیے 10 جون 1946 کو دس بجے سے پہلے ہی لاہور پہنچ گئے۔

داخلے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ کلرک نے فارم وصول کیا اور کھڑے کھڑے بتایا کہ مجھے میری خواہش کے مطابق پری انجینئرنگ کے فرسٹ ایئر میں داخل کرلیا گیا ہے۔ ہوسٹل میں بھی آناً فاناً داخلہ مل گیا۔ اس زمانے میں کالج میں ریواز اور بیلی نام کے دو ہوسٹل تھے، دونوں کے نام انگریز گورنروں کے نام پر تھے۔ ریواز بہت بڑا ہوسٹل ہے، اس کے مقابلے میں بیلی بہت ہی چھوٹا تھا۔ اس میں بعد میں انجمن حمایت اسلام نے انگلش میڈیم سکول قائم کردیا اور یوں جب ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے نجی تعلیمی ادارے قومیا لیے، یہ سکول سرکاری ہتھے چڑھنے سے بچ گیا۔ مجھے اسی ہوسٹل میں داخلہ ملا تھا۔

ہوسٹل دومنزلہ تھا۔ بیشتر کمرے کیوبکل (cubicles) تھے، اگرچہ چند ایک ڈورمیٹریاں (dormitries) بھی تھیں۔ چونکہ مانگ بہت زیادہ تھی (میرے ساتھ فرسٹ ایئر میں داخل ہونے والے طلبا کی تعداد چھ سو سے اوپر تھی)، اس لیے کیوبیکلوں میں بھی ایک ایک کی بجائے دو دو طلبا کو سمو دیا گیا۔ دونوں طرف ایک ایک چارپائی رکھنے کے بعد بیچ میں اتنی جگہ بھی نہیں بچتی تھی کہ آدمی وہاں اطمینان سے کھڑا ہو سکتا۔ ہمارے کمرے کے قریب ہی ایک کامن روم تھا جس میں کبھی طلبا ان ڈور (indoor) گیمز کھیلتے ہوں گے مگر اب اس میں چوبی دیواریں کھڑی کر کے متعدد کمرے بنا دیے گئے تھے اور طلبا کو ان میں دھکیل دیا گیا تھا۔ ان کمروں میں مقیم طلبا کی کوئی پرائیویسی (privacy) نہیں تھی کیونکہ چوبی دیواروں کی وجہ سے ان کی باتیں ساتھ کے کمروں والے بآسانی سن سکتے تھے۔

مجھے بالائی منزل کے جس کمرے میں جگہ ملی، اس میں میرا ساتھی مختار احمد بزمی تھا۔ بزمی میری کزن عالم بی بی کا دیور تھا۔ اس کا باپ چودھری شیر محمد بزدار جھنگ نہری پٹواری تھا۔ وہ منٹگمری سے اپنے بیٹے کو داخل کرانے آیا تھا۔ [بزمی کے ایک بھائی کا نام نذیر احمد تھا۔ وہ نہایت ذہین اور قابل تھا۔ سی ایس ایس کا امتحان پاس کرنے کے بعد پولیس سروس میں شامل ہوا۔ ایس پی بنا۔ یحییٰ خاں کے دور میں جب پولینڈ کا صدر اور وزیر خارجہ پاکستان کا دورہ مکمل کرنے کے بعد وطن واپسی کے لیے کراچی کے ہوائی اڈے پر پہنچے، ایک انتہا پسند جنونی نے، جسے جماعت اسلامی کا ہمدرد بتایا گیا تھا، انھیں ہلاک کرنے کے لیے ان پر اپنی گاڑی چڑھانے کی کوشش کی۔ نذیر احمد نے انھیں بچانا اپنا فرض گردانا۔ وہ آگے بڑھا اور صدر کی ڈھال بن گیا۔ وہ وزیر کو تو نہ بچا سکا مگر صدر کو خراش تک نہ آئی۔ خود نذیر احمد بھی اس فرض شناسی میں لقمۂ اجل ہو

گیا۔ خود آپا عالم بی بی کا اپنا بیٹا عبدالرؤف چودھری سی ایس پی بنا اور بطور اسٹیبلشمنٹ سیکرٹری ریٹائر ہوا۔ آج کل بطور وفاقی ٹیکس محتسب کام کر رہا ہے۔]

میرے ساتھ کے کمرے میں اقبال شہاب اور الطاف سکندر مقیم تھے۔ اقبال شہاب قدرت اللہ شہاب کا بھتیجا تھا۔ اس کا باپ کہیں پولیس سپرنٹنڈنٹ تھا۔ الطاف سکندر کا تعلق بٹالہ سے تھا۔ وہ بعد میں لاہور کا معروف وکیل بنا اور ایک مرتبہ لاہور ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن یا پنجاب بار ایسوسی ایشن کا سیکرٹری بھی منتخب ہوا۔ کامن روم میں چوبی دیواریں کھڑی کر کے جو کابکیں بنائی گئی تھیں، ان میں ہماری کلاس کے دو گورے چٹے طالب علم مقیم تھے۔ ایک کا نام جلیل احمد اور دوسرے کا شبیر حسن تھا۔ بعد میں شبیر حسن ایک بہت بڑے سکینڈل کا باعث بنا۔ اس لیے دونوں کے نام تبدیل کر دیے گئے ہیں۔

جس زمانے میں میں اسلامیہ کالج میں داخل ہوا، اپنی شاندار خدمات کی وجہ سے بعض سابق طلبا کے نام تب بھی گونج رہے تھے۔ ان میں سے تین — سید محمد قاسم رضوی، آفتاب قرشی اور اجلال حیدر زیدی — کا تعلق مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن سے تھا۔ تینوں بلا کے مقرر تھے۔ انھوں نے تحریک پاکستان کے دوران میں مسلم طلبا کو متحرک کرنے کے لیے نہایت اہم کردار ادا کیا تھا۔ آفتاب قرشی علامہ اقبال کے معالج حکیم محمد حسن قرشی کے فرزند ارجمند تھے جن کا مطب بیڈن روڈ پر تھا۔ آفتاب قرشی جب تعلیم سے فارغ ہوئے، انھوں نے اپنا آبائی پیشہ اختیار کر لیا۔ ان کے مطب پر لاہور کے بے فکرے زندہ دلوں کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں مگر وہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہے اور غالباً 1960 کی دہائی میں انتقال کر گئے۔ ان کے بھائیوں نے ہمدرد دواخانے کے مقابلے میں قرشی دواخانہ قائم کیا۔ ان کا بزنس اتنا کامیاب ہے کہ وہ اربوں میں نہیں تو کروڑوں میں ضرور کھیل رہے ہوں گے۔

اجلال حیدر زیدی نے سی ایس ایس (سنٹرل سپیریئر سروسز) کا امتحان دیا اور سی ایس پی بن گئے۔ سید قاسم رضوی انبالے کے وکیل اور شاعر غلام بھیک نیرنگ کے بھتیجے تھے۔ بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کے لا کالج میں داخلہ لے لیا اور اس کے ساتھ ہی ہمارے پرنسپل ڈاکٹر عمر حیات ملک نے انھیں ہمارے ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ مقرر کر دیا۔ گورا چٹا شبیر حسن ان کی رہائش گاہ میں، جو ہوسٹل میں ہی تھی، اکثر جاتا رہتا تھا اور یہی آمد و رفت دونوں کے زبردست سکینڈل کا موجب بنی۔ شبیر حسن ویسے بھی موتی چنا اور فلمیں دیکھنے کا بے حد شوقین تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا: ''میں بارہ آنے کا ناول کیوں خریدوں، بارہ آنے میں فلم کیوں نہ دیکھوں!'' ہمارے ہوسٹل کے سینئر طلبا کو شاید قاسم رضوی کا، جو ایک سال قبل انھی کی طرح کالج کا طالب علم تھا، سپرنٹنڈنٹ مقرر کیا جانا پسند نہیں تھا۔ انھیں شبیر حسن کی

سپرنٹنڈنٹ کی رہائش گاہ میں بار بار کی آمد و رفت میں ایک موقع نظر آیا اور انھوں نے اسے پرزور انداز سے کچھ اس طور پیش کرنا شروع کر دیا کہ دونوں کے آپس میں غیر فطری تعلقات ہیں۔ اللہ جانے اس میں سچائی کتنی تھی اور مبالغہ آرائی کتنی۔ خود شبیر حسن کے ساتھ میرے اچھے خاصے تعلقات استوار ہو چکے تھے مگر معاملے کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ مجھ میں اس سے حقیقت حال معلوم کرنے کا کبھی حوصلہ نہ ہوا۔ تاہم پراپیگنڈا اپنا رنگ لایا اور سید قاسم رضوی کو اپنے عہدے سے فارغ کر دیا گیا۔

سید اجلال حیدر زیدی کی طرح سید قاسم رضوی نے بھی ایل ایل بی کی تعلیم کے دوران میں ہی سی ایس ایس کا امتحان دیا اور سی ایس پی بن گئے۔ ایوب خاں کے زمانے میں وہ لائل پور کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ اس زمانے میں ڈپٹی کمشنروں کو عدالتی اختیارات بھی حاصل تھے اور وہ قتل تک کے مقدمات کی سماعت کیا کرتے تھے۔ لائل پور کے مشہور صنعتی خانوادے سہگل کے ایک نوجوان کی شہ پر حکیم دلبر نام کا ایک شخص قتل ہو گیا [بعد میں اسی نوجوان کی بیٹی سے مشہور کرکٹر جاوید میاں داد نے چوری چھپے شادی کی تھی۔] مقدمہ سید قاسم رضوی کی عدالت میں پیش ہوا۔ انھوں نے سہگلوں کے نوجوان کو کوئی سزا سنا دی۔ سہگلوں نے اس کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی۔ انھوں نے منٹگمری کے چودھری نذیر احمد کو اپنا وکیل مقرر کیا۔ چودھری نذیر احمد کا شمار اپنے زمانے کے انتہائی کامیاب اور نامور وکلا میں ہوتا تھا۔ وہ لیاقت علی خاں کی کابینہ میں وزیر رہ چکے تھے۔ وہ سہگلوں کی اپیل کے وقت ملک کے اٹارنی جنرل تھے۔ انھوں نے مقدمہ لڑنے کے لیے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ معلوم نہیں یہ چودھری صاحب کی وکالت کا کرشمہ تھا یا سہگلوں کی دولت کا اعجاز، ملزم صاف بری ہو گیا حالانکہ عام لوگوں کی نظر میں وہ صریحی مجرم تھا۔ بعد میں یحییٰ خاں کے دور میں جن 303 سرکاری ملازمین کو اپنے عہدوں سے برخواست کیا گیا، ان میں سید قاسم رضوی بھی شامل تھے۔

میرے داخل ہونے پر کالج کے جن سابق طلبا کی دھوم تھی، ان میں کالج کی کرکٹ ٹیم کے کپتان عبدالحفیظ بھی تھے۔ کالج کے میگزین ''کریسنٹ'' میں ان کی تصویر کے نیچے یہی نام تھا۔ کاردار وہ انگلستان جانے کے بعد بنے تھے۔

کاردار کو شہرت یوں ملی کہ جنگ عظیم دوم کے اختتام پر آسٹریلین افواج کی کرکٹ ٹیم برصغیر کے دورے پر آئی۔ ان میں آسٹریلیا کے کرشماتی آل راؤنڈر کیتھ ملر، عظیم بلے باز لنڈسے ہیسٹ (Hassett)، جو بریڈمین کی ریٹائرمنٹ کے بعد آسٹریلیا کے کپتان بنے، اور Pepper جیسے کھلاڑی شامل تھے۔ اس ٹیم کے خلاف ایک میچ میں کاردار نے 86 رنز بنائے اور یوں ان کی خوب واہ واہ ہوئی اور جب 1946 میں

ہندوستانی ٹیم نے بڑے نواب آف پٹوڈی افتخار علی کی زیرقیادت انگلستان کا دورہ کیا، کاردار اس میں منتخب ہو گئے۔ یہ ٹیم بری طرح ناکام رہی اور کاردار کی کارکردگی بھی مایوس کن رہی۔ تاہم کرکٹر ہونے کے ناتے انھیں اوکسفرڈ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا اور وہ وہیں ٹک گئے۔

1940 کی دہائی میں اسلامیہ کالج کی کرکٹ اور فٹ بال ٹیموں کی بڑی دھوم تھی۔ کرکٹ ٹیم میں کاردار کے علاوہ فضل محمود، امتیاز احمد، کاردار کے برادر نسبتی ذوالفقار احمد اور خان محمد جیسے کھلاڑی شامل تھے۔ ٹیم کا گورنمنٹ کالج کی ٹیم کے ساتھ کانٹے دار مقابلہ ہوتا تھا۔ چونکہ میں کرکٹ کی ابجد سے بھی ناواقف تھا اور مجھے اس کا کوئی شوق بھی نہیں تھا، اس لیے میں یہ مقابلہ بھی دیکھنے نہیں گیا۔ فٹ بال میں کالج ٹیم کا اصل جوڑ ڈی اے وی کالج کی ٹیم سے پڑتا تھا۔ یہ مقابلہ یونیورسٹی گراؤنڈ میں ہوتا تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے بلا مبالغہ سارا شہر امنڈ پڑتا تھا اور گراؤنڈ میں تل دھرنے کو جگہ نہیں بچتی تھی۔ 1946 کے اواخر یا 1947 کے اوائل میں دونوں ٹیموں کے مابین جو گھمسان کا رن پڑا تھا، اسے دیکھنے کے لیے ہوسٹل کے دیگر طلبا کے ساتھ میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ ہر طرف آدم ہی آدم تھا۔ اتنا بڑا ''ہجوم عاشقاں'' دیکھ کر میری تو سٹی ہی گم ہو گئی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین زبردست فقرے بازی ہو رہی تھی اور ہر کوئی اپنی اپنی ٹیم کو شاباش دے رہا تھا اور اس کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ یاد نہیں کون جیتا، کون ہارا مگر خیریت یہ ہوئی کہ سخت کشیدہ فرقہ وارانہ فضا کے باوجود کوئی ناروا واقعہ پیش نہ آیا۔

نیلی ہوسٹل کالج کے شمال مشرقی کونے میں واقع تھا۔ اس کا مشرقی گیٹ ایک انتہائی غلیظ اور تنگ گلی میں کھلتا تھا۔ جو اسے ریلوے روڈ سے ملاتی تھی۔ جس جگہ کالج واقع ہے، کسی زمانے میں وہاں کیلے کے باغات ہوتے تھے۔ کالج کی مشرقی جانب ریلوے روڈ اور مغربی طرف برانڈرتھ روڈ واقع ہے۔ دونوں سڑکوں کے علاقوں میں لوہے کی متعدد چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں تھیں۔ انھی میں سے ایک میں میاں نواز شریف اور میاں شہباز شریف کے والد میاں محمد شریف کام کیا کرتے تھے۔ نیلی ہوسٹل سے نکلنے والی گلی کے تقریباً سامنے تاج کمپنی کی دکان تھی جسے انتہائی خوبصورت اور دیدہ زیب رنگین قرآن مجید، ان کے تراجم اور تفاسیر چھاپنے کی ملک گیر شہرت حاصل تھی۔ کالج کے مین گیٹ کے قریب ہی طلبا کے لیے بیت الخلا بنے ہوئے تھے۔ چونکہ ان میں فلش سسٹم نہیں تھا، وہاں حوائج ضروریہ سے فارغ ہونا ایک عذاب جھیلنے سے کم نہیں ہوتا تھا۔ گیٹ کے تقریباً سامنے عرب ہوٹل تھا۔ ہوٹل تو misnomer ہے، اصل میں یہ ریستوران تھا۔ یہاں ممتاز صحافی، ادیب اور انشا پرداز چراغ حسن حسرت اپنے مداحین اور اردو/ پنجابی کے شاعر عبدالمجید بھٹی اپنے حوارین کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ اس ریستوران میں کڑک چائے ملا کرتی تھی۔ کبھی کبھی

عبدالمجید سالک بھی آجاتے تھے کہ ان کے اخبار انقلاب کا دفتر قریب ہی واقع تھا۔ اس دفتر کے کہیں قریب ہی ایک ہندو وید کا دواخانہ تھا جو ''امرت دھارا'' کے نام سے اس دعوے کے ساتھ ایک دوا بیچا کرتا تھا کہ اس کے استعمال سے ہر قسم کے مرض سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ''امرت دھارا'' ایک قسم کا محاورہ بھی بن گیا تھا۔ یہ ہر اس چیز کے لیے استعمال ہوتا تھا جس سے بیشتر مشکلات اور مسائل کا حل مل سکتا ہو۔ ریلوے روڈ اور نسبت روڈ کے درمیانی علاقے کو گوال منڈی کہا جاتا ہے۔ شاید کسی زمانے میں، جب قدیم لاہور دیواروں کے اندر بند تھا، یہاں گوالے رہتے ہوں۔ آج کل اس علاقے میں زیادہ تر امرتسر کے کشمیری آباد ہیں مگر تقسیم سے قبل یہ ہندوؤں کا گڑھ تھا۔ اسی علاقے میں میو ہسپتال کے قریب ہندوؤں کے انتہائی بااثر انگریزی اخبار ''ٹریبیون'' کا دفتر تھا جس میں قیام پاکستان کے بعد ''پاکستان ٹائمز'' اور ''امروز'' نے ڈیرا جما لیا۔ ہندوؤں کے ''پرتاپ''، ''ملاپ'' اور ''ویر بھارت'' جیسے اردو اخبارات کے دفاتر گوال منڈی چوک کے آس پاس واقع تھے۔ [سکھوں کے اردو اخبار کا نام اجیت تھا۔] یہ اخبار بھی خوب تھے کہ اردو زبان میں ہندی کی ترویج کرتے تھے۔ ان کے ایڈیٹر جو اداریے لکھتے تھے، ان کے نیچے اپنے نام (مہاشہ کرشن، ویریندر، نانک چند ناز وغیرہ) ضرور لکھتے تھے تاکہ کسی کو غلط فہمی نہ رہے کہ اداریہ کسی ایرے غیرے نے سپرد قلم نہیں کیا بلکہ خود مدیر صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ ایک مسلمان اخبار نویس وقار انبالوی ہوتے تھے۔ وہ غضب کے فی البدیہہ گو شاعر تھے، آپ کی فرمائش پر کھڑے کھڑے سو اشعار کی نظم یا غزل گھڑ کر سنا دیتے تھے۔ یہی نہیں، انھیں اردو، فارسی، پنجابی، عربی، ہندی اور سنسکرت پر بھی عبور حاصل تھا۔ پیشہ ان کا صحافت تھا مگر صحافیوں کا مالی اعتبار سے ان دنوں برا حال تھا۔ روٹی تو کما کھائے کسی طور مچھندر، وہ ہندو اخبارات میں فرضی ناموں سے کانگرس کے حق میں مگر اسی روز جواب میں مسلم اخبارات میں مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کے حق میں دھواں دھار مضامین لکھا کرتے تھے۔ ایک سکھ ''پریت لڑی'' کے نام سے ہفتہ وار یا ماہوار رسالہ نکالتا تھا۔ اس کے مضامین نظم و نثر اردو اور پنجابی دونوں زبانوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ ایک فلمی رسالہ ''چترا'' بھی چھپتا تھا جو ملک گیر شہرت کا مالک تھا۔

ریلوے روڈ پر مولوی ممتاز علی کا اشاعتی ادارہ دارالاشاعت بھی واقع تھا جو درسی، علمی اور ادبی کتابوں کے علاوہ عورتوں کا رسالہ ''تہذیب نسواں'' اور بچوں کا ''پھول'' چھاپا کرتا تھا۔ ایک زمانے میں احمد ندیم قاسمی

---

1۔ نانک چند ناز کے متعلق مولانا ظفر علی خاں نے لکھا تھا:

جو اچھے ہوتے اس اخبار کے بھاگ
نہ ملتی ناز کو اس کی ادارت

بھی پھول کے مدیر تھے۔

اسلامیہ کالج کا مین گیٹ تو ریلوے روڈ پر ہے مگر اس کے کھیل کے میدان سے جانب مغرب ایک راستہ برانڈرتھ روڈ کی طرف بھی نکلتا ہے۔ برانڈرتھ روڈ خاصی اونچائی پر ہے، اس لیے اس تک پہنچنے کے لیے چند سیڑھیاں چڑھنا پڑتی ہیں۔ یہ شمالی جانب چول والگراں پر ریلوے روڈ کو کاٹتی نکل جاتی ہے اور اس کا جنوبی سرا سرکلر روڈ میں گم ہو جاتا ہے۔ جب میں کالج میں داخل ہوا، سرکلر روڈ اور برانڈرتھ روڈ کے سنگم پر "کراؤن بس" کا اڈا ہوتا تھا، جہاں سے جنگ ختم ہونے کے باوجود کوئلے کی بھاپ سے چلنے والی بسیں مسافروں کو گوجراں والا اور سیال کوٹ پہنچاتی تھیں۔ اس اڈے کے عین سامنے موچی دروازے کے باہر ایک خاصا بڑا کھلا میدان ہوتا تھا۔ مسلمانوں کی سیاسی جماعتوں کے جلسے عموماً اسی میدان میں منعقد ہوتے تھے۔ اسلامیہ کالج کے ہوسٹلوں کے طلبا مسلم لیگ کے جلسوں کی رونق بڑھانے یہیں آتے تھے۔ سرکلر روڈ کی مغربی جانب ایک بہت بڑی عمارت واقع تھی۔ اس کا نام ہی "جہازی بلڈنگ" تھا۔ اس میں روزنامہ "احسان" اور مجلس احرار کے دفاتر تھے۔ اس زمانے میں شورش کاشمیری بھی وہیں رہائش پذیر تھے۔

موچی دروازے کے اندر آبادی زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل تھی مگر اس سے آگے شاہ عالمی دروازے کے اندر غلبہ ہندوؤں کا تھا۔ اس کے اندر داخل ہونے سے عین پہلے مسلمانوں نے راتوں رات سڑک کے عین درمیان میں ایک مسجد کھڑی کر دی تھی۔ کیوں؟ اس کی وجہ تو مجھے معلوم نہیں مگر دوسروں کی طرح اتنا ضرور معلوم ہے کہ اس واقعے کے ردعمل میں علامہ اقبال نے اپنی مشہور نظم "مسجد تو بنادی شب بھر میں" سپرد قلم کی تھی۔ شاہ عالمی دروازے کا اندرون آج کے شاہ عالم سے بالکل مختلف تھا۔ شروع میں ہندوؤں کی بے شمار دکانیں تھیں۔ ان دکانوں کے عقب میں اندرون شہر کے دوسرے علاقوں کی طرح ان کے دو دو، تین تین اور بعض اوقات چار چار منزلہ مکانات تھے۔ اندرون شہر ہندوؤں کا اصل گڑھ یہی علاقہ تھا۔ تقسیم ہند کے بعد جب پنجاب کے دیگر علاقوں میں آبادیوں کا انخلا عمل میں آ رہا تھا، دونوں جانب بے گناہ لوگوں کو نوک شمشیر پر دھرا جا رہا تھا اور عورتوں کا اغوا عام معمول بن چکا تھا، یہاں کے ہندوؤں نے اپنا یہ گڑھ خالی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس پر بعض سرپھرے مسلمان اشتعال میں آ گئے۔ انھوں نے رات کے اندھیرے میں چھپ چھپ کر آگیں لگانا شروع کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا تجارتی حصہ جل کر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ مجبوراً ہندوؤں کو بھاگنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نظر نہ آیا مگر ان کے دل پاکستان کے خلاف کدورت سے بھر گئے جو آج تک دور نہیں ہو سکی۔ اگر مسلمان یہ حرکت نہ کرتے، ہندوؤں کو یہیں رہنے دیتے، اس سے شاید دلی کے مسلمانوں کا بھلا ہو جاتا اور ان کا وہ قتل عام نہ ہوتا جو بعد میں ہوا۔

موجودہ شاہ عالم اسی سوختہ علاقے پر بنایا گیا ہے۔

شاہ عالمی دروازے سے میو ہسپتال کو جانے والی سڑک بانساں والا بازار کہلاتی تھی اور اب بھی کہلاتی ہے۔ اس بازار میں بریلی کے بانس، بانسوں کی سیڑھیاں وغیرہ اور مونج کی چارپائیاں فروخت ہوتی تھیں۔ اسلامیہ کالج کے ہوسٹلوں کے طلبا یہیں سے چارپائیاں خریدتے تھے۔ بریلی کے بانسوں کا رنگ قدرتی طور پر عنابی (maroon) ہوتا تھا۔ بعد میں پاکستان نے اپنے بانس اگائے مگر ان کا رنگ سبز ہی رہتا ہے، انھیں عنابی بنانے کے لیے ان پر رنگ کرنا پڑتا ہے۔

اس بازار کے آخری سرے پر میو ہسپتال کے عین سامنے ایک وسیع و عریض سرائے واقع تھی۔ یہ سلطان کی سرائے کہلاتی تھی۔ اس میں بسوں کے اڈے اور متعدد چھوٹے چھوٹے چائے خانے اور ریستوران واقع تھے۔ اب یہاں میو ہسپتال کا ذیلی ادارہ لیڈی ایچی سن ہسپتال تعمیر ہو چکا ہے۔

شاہ عالمی سے آگے لوہاری دروازہ آتا ہے۔ اس کے اندر بھی بیشتر آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ جب آپ اس کی جانب رخ کرتے، بائیں جانب بیئر (beer) کا بہت بڑا ڈرم پڑا نظر آتا۔ اس کے نیچے ٹونٹی لگی ہوئی تھی۔ جن تشنگان کو طلب ہوتی، وہ پاس بیٹھے شخص کو آنا دو آنے پکڑاتے، گلاس اٹھاتے، ٹونٹی کے نیچے رکھتے اور بھرنے کے بعد وہیں کھڑے کھڑے غٹاغٹ پی جاتے۔

لوہاری دروازے کے عین سامنے (نیو) انارکلی بازار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تقریباً سارے کا سارا بازار ایک مسلمان خاندان کی ملکیت تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ خاندان کے افراد کی تعداد گھٹنے لگی اور آخر میں صرف ایک نوجوان باقی رہ گیا اور وہ بھی غیر شادی شدہ۔ یہ نوجوان بالکل لاپروا اور لنگوٹ تھا۔ ایک مرتبہ اس کا ایک دوست اس سے ملنے چلا آیا۔ نوجوان نے اپنے نوکر کو حکم دیا کہ اس کے مہمان کے لیے چائے بنائی جائے۔ نوکر نے دست بستہ عرض کیا: "حضور، گھر میں کوئلہ ہے نہ لکڑی۔ مجھے یہ چیزیں خریدنے شام کو بازار جانا تھا۔" نوجوان نے جواب دیا: "کوئی بات نہیں۔ الماری میں نوٹوں کی جو دتھیاں پڑی ہیں، انھیں جلا کر چائے بنا دو۔ آخر ہمارا اتنا پیارا دوست آیا ہے، وہ چائے پیے بغیر کیسے واپس جا سکتا ہے۔" ان اللّوں تللّوں اور دریا دلیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ہی عرصے میں نوجوان کنگال ہو گیا اور در در کی ٹھوکریں کھانے لگا۔

حسب معمول انارکلی بازار پر بھی ہندوؤں ہی کو غلبہ حاصل تھا، مسلمانوں کی دکانیں چار پانچ ہی تھیں۔ ان میں سے ایک جوتوں کی دکان تھی۔ اس کا نام کرنال شاپ تھا۔ جب سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی پنجاب پولیس برانچ کے انچارج چودھری محمد حسین کے فحاشی کے خلاف بنائے گئے مقدمات

بھگتنے بمبئی سے لاہور آیا کرتے تھے، اسی دکان سے جوتے خریدا کرتے تھے۔ (بحوالہ ''گنجے فرشتے'')

قیام پاکستان سے دو تین سال قبل مسلمانوں کی دو خاصی بڑی بڑی دکانیں کھل چکی تھیں۔ ان میں سے ایک بمبئی کلاتھ ہاؤس (Bombay Cloth House) اور دوسری زیورات کی ''لیڈیز اون چوائس'' (Ladies Own Choice) تھی۔ ان کے اشتہارات اکثر حمید نظامی کے اخبار ''نوائے وقت'' میں شائع ہوتے تھے۔

انارکلی بازار میں کتابوں کی دو بہت بڑی بڑی دکانیں تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام عطر چند کپور اینڈ سنز اور دوسری کا نوری اینڈ سنز تھا۔ عطر چند کپور اینڈ سنز غالباً لاہور کے سب سے بڑے کتب فروش اور ناشر تھے۔ ان کا اپنا عظیم الشان پریس تھا جو لکشمی بلڈنگ کے عین سامنے ایبٹ روڈ اور میکلوڈ روڈ کے سنگم پر واقع تھا۔ قیام پاکستان کے بعد یہ چھاپہ خانہ دو صحافیوں میاں محمد شفیع عرف م ش اور ممتاز احمد کو الاٹ ہوگیا۔ دونوں نے کھالی کراسے چند سالوں میں برابر کردیا۔

عطر چند کپور اینڈ سنز زیادہ تر درسی کتابیں شائع کرتے تھے مگر ان کا اردو زبان پر بڑا احسان یہ تھا کہ انھوں نے مولانا تاجور نجیب آبادی اور ان کے معاون فاخر ہریانوی کی زیر نگرانی Everyman's Library اور Random House کی طرح یونیفارم سائز میں اردو کی کلاسیکی شاعری کی خوبصورت مجلد کتابیں چھاپی تھیں۔ یہ کتابیں ہوتی بھی بہت سستی تھیں۔ شاید پنجاب کے بعض گھرانوں اور کتب خانوں میں اب بھی ان کے نسخے موجود ہوں۔

نوری اینڈ سنز صرف درسی کتابیں شائع کرتے تھے۔ ان کی دکان بھی بہت وسیع و عریض تھی۔ تقسیم کے بعد یہ جالندھر کے کتب فروش ایچ کریم بخش اینڈ سنز کو الاٹ ہوگئی مگر اتنی بڑی دکان کو کتابوں سے بھرنا اور انھیں بیچنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ انھوں نے اسے کپڑوں کی دکان میں تبدیل کردیا۔ ان کا یہ بزنس اتنا کامیاب رہا کہ لاہور میں ان کی جگہ جگہ شاخیں کھل چکی ہیں۔

انارکلی سے ایک سڑک میو ہسپتال جاتی ہے۔ اس کا نام ایبک روڈ ہے۔ اس سڑک کے عین درمیان میں مشرقی جانب آتمارام اینڈ سنز کی دکان تھی۔ اس کے نیچے تہہ خانہ تھا، اس لیے یہ سڑک سے قدرے اونچائی پر واقع تھی۔ یہ بھی زیادہ تر درسی کتابیں چھاپتے اور بیچتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد یہ دکان جالندھر کے چودھری عبدالحمید کو الاٹ ہوگئی۔ چودھری صاحب علی گڑھ کے فارغ التحصیل تھے اور چند سال کابل یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھاتے رہے تھے۔ پھر وہ اکتا گئے اور انھوں نے جالندھر میں ''مکتبہ کاررواں'' کے نام سے کتابوں کی دکان کھول لی۔ ان کی شادی پاکستان کے مشہور سیاسی رہنما میاں عبدالباری کی،

جن کا مغربی پنجاب کے آخری انگریز گورنر سر فرانسس موڈی کو بھگانے میں اہم کردار تھا، صاحب زادی سے ہوئی تھی۔ چودھری صاحب بڑے باذوق شخص تھے اور خود بھی شعر کہا کرتے تھے۔ وہ بے حد بھلے مانس، شریف النفس اور قول کے پکے انسان تھے، ادیبوں سے جو وعدہ کرتے تھے، اسے ہر حال میں پورا کرتے تھے۔ وہ مجھ پر بہت مہربان تھے۔ میری درخواست پر جب انھوں نے ناصر کاظمی کا پہلا مجموعہ کلام "برگ نے" شائع کرنے کی ہامی بھری، ناصر کاظمی نے شرط عاید کر دی کہ وہ ہر کتاب پر دستخط کریں گے۔ یہ انوکھی شرط تھی اور غالباً دنیا کے کسی بھی پبلشر کو اس سے واسطہ نہیں پڑا ہوگا۔ چودھری صاحب کی شرافت دیکھیں کہ انھوں نے یہ شرط بھی بلاچون و چرا مان لی۔ اس کا طریقہ یہ نکالا گیا کہ ناصر کاظمی ہر کتاب پر دیباچے کے آخر میں دستخط کر دیں۔ یہ دیباچہ دراصل مظفر علی سید نے لکھا تھا مگر جب کتاب چھپ کر آئی تو اس کے دیباچے کے نیچے ناصر کاظمی کے دستخط تھے۔ مظفر علی سید نے شکایت کی تو ناصر کاظمی نے سگرٹ کا کش لگاتے اور پیک تھوکتے ہوئے بڑے اطمینان سے جواب دیا: "میں نے تمھیں دیباچہ لکھنے کو کہا تھا، یہ تو نہیں کہا تھا کہ یہ چھپے بھی تمھارے نام سے۔" مظفر علی سید منہ دیکھتا رہ گیا۔ انتظار حسین کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "گلی کوچے" بھی چودھری صاحب نے ہی شائع کیا تھا۔

ایبک روڈ پر قطب الدین ایبک کی تربت تھی۔ اس کی حالت بہت خستہ تھی۔ پھر کسی بھلے آدمی کو خیال آیا کہ یہاں اس کا مزار بننا چاہیے۔ چھوٹا موٹا مزار بنانے کے لیے بھی خاصی جگہ چاہیے اور یہ تو ایک بادشاہ کا مزار تھا۔ چنانچہ اسے اس کے شایانِ شان بنانے کے لیے اردگرد کی عمارتیں گرانا پڑیں۔ چودھری صاحب کی دکان بھی اس کی زد میں آ گئی۔ چودھری صاحب کو کچہری روڈ پر چودھری حمید الدین کا "یونیورسٹی بک ڈپو" الاٹ ہو گیا اور خود حمید الدین نے پروفیسر سراج الدین کے تعاون سے "راما کرشنا" پر قبضہ جما لیا۔

کچہری روڈ اور مال روڈ کے مابین انار کلی کا جو ٹوٹا ہے، اس میں درآمد شدہ انگریزی کتب کی تین بہت اچھی دکانیں تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام منروا (Minerva) بک ہاؤس تھا۔ [منروا عقل و دانش اور فنون کی رومی دیوی تھی۔] تقسیم کے بعد اس پر لاہور کے چند پبلشروں نے مل کر قبضہ جما لیا اور اس کا نام "پبلشرز یونائیٹڈ" رکھ دیا۔ شیخ محمد امین اس کے منیجر مقرر ہوئے۔ شیخ صاحب بہت مجھ دار آدمی تھے۔ وہ انتہائی بذلہ سنج، لطیفہ ساز بلکہ زبردست ہتھکو باز بھی تھے۔ وہ جب تک زندہ رہے، دکان کو پہلے بحسن و خوبی اور پھر لشٹم پشٹم چلاتے رہے۔ ان کی آنکھ کے بند ہونے کی دیر تھی کہ دکان کا کباڑا ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا بستر گول ہو گیا۔

ڈی پی آئی [ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن یا تعلیمات عامہ] کے ساتھ بائبل سوسائٹی آف پاکستان

کی دکان تھی۔ اس میں بائبل کے انگریزی، اردو اور پنجابی ترجموں اور عیسائیوں کی دیگر مذہبی کتب کے علاوہ درآمد انگریزی کتابوں کا بہت نفیس ذخیرہ ہوتا تھا۔ اس کی مال روڈ پر فیروز سنز کے قریب بھی ایک شاخ تھی۔ پاکستان میں جب کتابوں کا شوق ماند پڑنے لگا اور کاروبار ٹھپ ہونے لگے، مال روڈ والی شاخ تو بالکل ہی بند ہو گئی۔ اب وہاں "مادرا" کے نام سے ایک دکان قائم ہے اور اس میں زیادہ تر اردو کتب بکتی ہیں۔ انارکلی کی برانچ سے بھی شعروادب اور علوم وفنون کی انگریزی کتب اٹھ چکی ہیں۔ اب وہاں صرف عیسائیوں کی مذہبی کتابیں، رسالے اور کتابچے دستیاب ہیں یا پھر ایک شخص باہر کے دروازے کے پاس بیٹھا قلموں (pens) کی مرمت کرتا نظر آتا ہے۔

تاہم انارکلی کے اس حصے میں کتابوں کی سب سے بڑی اور عظیم الشان دکان "راما کرشنا" تھی۔ یہ انارکلی اور مال روڈ کے نکڑ پر واقع تھی۔ اس کا مالک بہت باذوق اور فن شناس شخص تھا۔ اس کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی بہت اچھے مصور (painters) تھے۔ ان کی تصویریں پمفلٹوں کی صورت میں مع تبصرہ شائع ہوتی تھیں اور غالباً مفت تقسیم ہوتی تھیں۔ دو تین پمفلٹ میرے ہاتھ بھی آ گئے تھے، پھر معلوم نہیں کہاں گم ہو گئے۔ اس کی دوسری بیٹی لاجونتی راما کرشنا کو پنجابی زبان وادب پر عبور حاصل تھا۔ اس نے انگریزی میں Punjabi Sufi Poets کے عنوان سے کتاب لکھی تھی۔ اس کا پنجابی ترجمہ مجلس شاہ حسین نے شائع کیا تھا۔

"راما کرشنا" کا مالک تقسیم کے بعد بھی کئی مہینے لاہور میں ٹکا رہا۔ پھر "یونیورسٹی بک ڈپو" کے مالک چودھری حمید الدین کی ریشہ دوانیاں رنگ لائیں۔ انھوں نے پروفیسر سراج الدین کے تعاون سے اسے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا اور وہاں "آئیڈیل بک ہاؤس" کے نام سے اپنی دکان قائم کر لی۔ ویسے چودھری حمید الدین بہت ادب دوست اور ادب شناس آدمی تھے۔ جس زمانے میں میں ایم اے کا طالب علم تھا، پاؤنڈ دس روپے اور شلنگ آٹھ آنے کا ہوتا تھا۔ یوں انگریزی کی نئی سے نئی کتب بہت سستی مل جاتی تھیں۔ پیپر بیک کی قیمت تو آنوں میں ہوتی تھی۔ حمید الدین خواجہ منظور حسین کے مشورے پر تازہ ترین کتابیں منگواتے رہتے تھے۔ مظفر علی سید اور میں نے ان کی دونوں دکانوں سے ڈھیروں کتابیں خریدی تھیں۔

مال روڈ پر کتابوں کی ایک اور بہت بڑی دکان تھی۔ اس کا نام جے رے (J. Ray) اینڈ سنز تھا۔ نام سے مجھے ہمیشہ شبہ رہا کہ یہ کسی انگریز کی ملکیت ہوگی۔ جب اس میں فیروز سنز نے ڈیرا جمایا، میرا خیال تھا کہ انھوں نے اسے اسی انگریز سے خریدا ہوگا۔ تاہم چند سال قبل میری غلط فہمی دور ہو گئی۔ جب میں اپنی انگلش اردو لغت تحریر کر رہا تھا، مجھے "لنڈن ٹائمز" کے ایک تبصرے سے معلوم ہوا کہ ایک انگریز Nigel Hawken نے، جو تقسیم کے بعد مستقلاً دلی میں آباد ہو گیا تھا، مشہور زمانہ "Hobson-Jobson" کی طرز پر بھارتی انگریزی

میں مقامی الفاظ اور مقامی اضافوں کے متعلق "Hanklyn-Janklin" کے نام سے ایک کتاب تحریر کی ہے۔ مجھے خیال آیا کہ مجھے اس کتاب کو ہر صورت منگوانا چاہیے کیونکہ میری کوشش تھی کہ اپنی لغت میں انگریزی میں استعمال ہونے والے مقامی الفاظ بھی زیادہ سے زیادہ تعداد میں شامل کر سکوں۔ یہ کتاب پاکستان میں کہیں دستیاب نہیں تھی۔ اکثر بھارت جانے والے دوستوں سے میں نے گزارش بھی کی مگر کسی نے بھی میری درخواست کو شرف قبولیت نہ بخشا۔ ناچار میں نے اپنے غائبانہ دوست اور خیر خواہ جناب اسلم محمود کو، جن سے میرا تعارف خیر مسعود کی وساطت سے ہوا تھا، خط لکھا۔ انھوں نے از رہِ کرم مجھے کتاب بھجوا دی اور ساتھ ہی لکھا کہ انھوں نے یہ کتاب لکھنو کے ایک بہت بڑے کتب فروش بے رے اینڈ سنز سے خریدی ہے، جن کی تقسیم سے قبل مال روڈ لاہور پر دکان تھی۔ جس رے کو میں انگریز گردانتا تھا، وہ دراصل بنگالی تھا۔ بعض بنگالی رائے کو رے لکھتے ہیں جیسے ستیہ جیت رے۔ بے رے کی دکان کے عقب میں بنگالیوں کا ایک پورا محلہ آباد تھا۔ میراجی کی میرا بھی اسی محلے میں رہتی تھی۔ ''بے رے اینڈ سنز'' کی اس دکان میں آج کل فیروز سنز کی دکان ہے۔ کچھ عرصہ ہوا اس دکان میں آگ لگ گئی۔ اس پر ڈان کے کالم نگار مجید شیخ نے اپنے ایک کالم میں بتایا کہ جس عمارت میں یہ دکان واقع ہے وہ کسی غلام رسول کی ملکیت ہے مگر انھوں نے بے رے اینڈ سنز کا کہیں ذکر نہیں کیا، اور نہ ان کتابوں کے ذخیرے کے متعلق کچھ بتایا جو اصل مالک تقسیم کے بعد چھوڑ گئے تھے۔

اس زمانے کی مال روڈ آج کل کی مال روڈ سے بالکل مختلف تھی۔ اپنے گھنے اور تناور درختوں کی وجہ سے یہ ٹھنڈی سڑک کہلاتی تھی۔ اس پر ''میٹرو''، ''لورینگو''، ''سٹیفلز'' اور ''سٹینڈرڈ'' نام کے نہایت اعلیٰ ریستوران ہوتے تھے۔ ان میں بعض میں ایک اینگلو انڈین لڑکی انجیلا ایوب کے زمانے تک ڈانس کرتی رہی اور ہم سب اسے دیکھنے جاتے رہے۔ اس کے فٹ پاتھ بہت چوڑے تھے۔ ان پر گھومنے پھرنے سے واقعی بہت لطف آتا اور راحت محسوس ہوتی تھی۔ گرمیوں کے موسم میں خاص طور پر یہ گمان گزرتا تھا جیسے لاہور کا سارا حسن ان فٹ پاتھوں پر امنڈ آیا ہو۔ مردوں نے تو خیر گھومنا پھرنا ہی ہوتا ہے، عورتیں بھی کم نہیں تھیں۔ انتہائی خوبصورت اور دیدہ زیب ملبوسات میں حسین سے حسین نوخیز دوشیزاؤں اور خواتین کی ٹولیوں کی ٹولیاں ہر طرف مٹرگشت کرتی نظر آتی تھیں۔ [اس زمانے کے لاہور کو سارے ہندوستان میں فیشن کا گڑھ تصور کیا جاتا تھا۔ تقریباً ہر نئے فیشن کا آغاز یہیں سے ہوتا تھا۔] ابھی تو رنگ و نور کے اس سیلاب کو دیکھ کر ایک دل جلے دیہاتی نے بڑی حسرت سے کہا تھا: ''خدا قسم، جنانیاں تو ایہہ نیں، ساڈیاں تاں ہُن تیئں کھوتیاں نال ای سونداں رَہے۔''

مال روڈ پر نہر کے پل کے پاس گورنر ہاؤس کے پائے کی ایک وسیع و عریض عمارت ہے۔ اس کا نام residency ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ اصلاً کس مقصد کے لیے بنائی گئی تھی۔ انگریزوں نے متحدہ ہندوستان کی پانچ سو سے اوپر ریاستوں کے نوابوں، راجوں، مہاراجوں کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی کہ وہ اپنی رعایا کے ساتھ جو چاہیں، سلوک کریں۔ ان کی عورتوں کی عزتوں کے ساتھ کھیلیں۔ ان لوگوں کے متعلق کے ایل گابا کی کتاب کا جملہ یاد کریں:

Some people begin their morning with a cup of tea, some with a morning paper, his Highness prefers a virgin.

ان پر جتنے چاہیں ٹیکس لگا دیں، جسے چاہیں کنگال بنا دیں اور جسے چاہیں اس کے سر پر وزارت کا تاج سجا دیں، جسے چاہیں پھانسی کے تختے پر لٹکا دیں اور جسے چاہیں اپنی کوئی داشتہ بخش دیں، یا اپنا مقرب خواص بنا لیں۔ انگریزوں نے انھیں قابو میں رکھنے اور ایک خاص حد سے آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے انگریز افسر مقرر کر رکھے تھے جنھیں ریزیڈنٹ (resident) کہا جاتا تھا۔ حیدر آباد، کشمیر، بھوپال، بہاول پور جیسی بڑی ریاستوں کے لیے علیحدہ علیحدہ ریزیڈنٹ ہوتا تھا۔ مگر چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی بے شمار تھیں۔ اگر ان میں سے چند کسی ایک ہی صوبے میں واقع ہوں، ان سب کے لیے ایک ہی ریزیڈنٹ کافی سمجھا جاتا تھا۔ متحدہ پنجاب کا جو علاقہ پاکستان کے حصے میں آیا، اس میں صرف ایک ریاست ــــ بہاول پور ــــ واقع تھی مگر مشرقی پنجاب میں چھوٹی بڑی درجنوں ریاستیں تھیں۔ ان میں سے بعض تو اتنی مہین تھیں کہ نقشے پر انھیں محدب شیشہ لگا کر ڈھونڈنا پڑتا تھا۔ ان کے راجے ریاست کی آمدنی سے اپنا پیٹ بھی نہیں پال سکتے تھے۔ انھیں میں سے ایک ریاست سولن تھی جو انبالے اور کالکا کے مابین واقع تھی۔ یہاں کا راجہ صبح کو گھاس کھودا کرتا تھا اور شام کو دربار لگایا کرتا تھا۔ یہ قصہ میرے اور زاہد ڈار کے خاندان کے مشترکہ دوست پروفیسر غلام مرتضیٰ چودھری (جی ایم سی) سنایا کرتے تھے۔ جی ایم سی کے والد چودھری غلام محمد لدھیانہ کے رئیس تھے۔ وہ پولیس کو وردیاں اور ان کی ضرورت کی دیگر اشیا فراہم کرتے تھے۔ تقسیم کے بعد وہ اپنا کاروبار لاہور لے آئے اور مال روڈ پر کمرشل بلڈنگ کے سامنے جی ایم سنز کے نام سے اپنی دکان بنائی۔ آج کل اسے جی ایم سی کا بھتیجا چلاتا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل چودھری صاحب کا سارا خاندان گرمیاں گزارنے ہر سال سولن جایا کرتا تھا اور راجہ کے احوال اپنی آنکھوں سے دیکھا کرتا تھا۔ تقسیم کے بعد سولن میں وسکی کا کارخانہ کھل گیا۔ مدتوں یہ وسکی پاکستان میں سمگل ہوتی رہی۔

شوالک کی پہاڑیوں میں بھی دو چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔ یہ مشترکہ طور پر منڈی سکیت کہلاتی تھیں۔

یہاں دریائے راوی پر بند بنا کر بجلی پیدا کی جاتی تھی۔ لاہور، امرتسر، جالندھر وغیرہ کو بجلی یہیں سے فراہم ہوتی تھی۔ ان سب ریاستوں کے امور کی نگرانی لاہور کی residency میں مقیم ریزیڈنٹ کیا کرتا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد بیورو کریسی نے اس عمارت میں CSS (سنٹرل سپیریئر سروسز) کی تربیتی اکیڈمی قائم کر لی۔ اگر یہ لوگ مخلص ہوتے، اپنی انا کے اسیر نہ ہوتے اور نئے ملک کے صحیح معنوں میں خیر خواہ ہوتے، یہ وہاں کم از کم خواتین کی یونیورسٹی قائم کر سکتے تھے مگر جاگیرداروں کی طرح یہ لوگ بھی عوام کو دبا کر رکھنا چاہتے تھے۔ اکیڈمی کے پہلے ڈائریکٹر جی معین الدین تو ان لوگوں کو سبق ہی یہ پڑھایا کرتے تھے: "ملک کے اصلی حکمران تم ہو، تمھیں عام لوگوں کو اپنے قریب بھی پھٹکنے دینا نہیں چاہیے۔" الطاف گوہر جیسے "دانش ور" بھی اسی فلسفے پر عمل کرتے تھے۔ اگر انھیں اطلاع ملتی کہ کوئی سی ایس پی افسر، جو اپنی دانست میں اپنے آپ کو ادیب سمجھتا تھا، لاہور کے پاک ٹی ہاؤس کے قریب گھومتا پایا گیا ہے، وہ اس سے سخت باز پرس کیا کرتے تھے۔

سی ایس پی اصحاب کے بھائی بند پولیس والے بھی کچھ کم نہیں۔ پنجاب سول سیکرٹریٹ کے مین گیٹ کے سامنے سے پرانی انارکلی کی طرف جانے والی سڑک پر قیام پاکستان سے قبل لاہور کالج فار ویمن قائم تھا۔ تقسیم کے بعد جب جیل روڈ پر واقع فتح چند کالج فار گرلز ختم ہوا، لاہور کالج کو وہاں منتقل کر دیا گیا کیونکہ فتح چند کالج کا کیمپس بہت وسیع و عریض تھا۔ پولیس نے موقع غنیمت جانا اور جھٹ زبردستی پرانے کیمپس پر قبضہ کر لیا۔ آج کل وہاں ڈی آئی جی کا دفتر بنا ہوا ہے۔ ضیاالحق کے دور میں گورنر پنجاب کے مشیر تعلیم فراز ہاشمی نے اپنا پورا زور لگا دیا مگر وہ اس عمارت کو خالی نہ کرا سکے۔ وہاں اب بھی ایک فرد واحد ٹھاٹ سے پاؤں پسارے بیٹھا ہے۔

لوہاری گیٹ سے آگے موری گیٹ آتا ہے۔ دونوں کے درمیان میں سرکلر روڈ کی مغربی جانب پہلوانوں کے اکھاڑے ہوتے تھے۔ سرکلر روڈ اور قدیم شہر کے مابین گھاس کے خوبصورت قطعات تھے جنھیں ایک چھوٹی سی نہر (راجباہ) سیراب کیا کرتی تھی۔ یہ راجباہ اور قطعات قیام پاکستان کے بعد بھی کافی عرصہ قائم رہے اور شہر کی فضا کو آلودہ ہونے سے بچاتے رہے۔ آہستہ آہستہ ان قطعات پر بے ضمیر اور مطلب پرست لوگوں نے قبضہ جمانا اور ان پر دکانیں تعمیر کرنے کا دھندا شروع کر دیا۔ یہ سب کچھ کارپردازان حکومت کی ناک کے عین سامنے ہوتا رہا مگر کسی نے بھی ان لوگوں کو روکنے کی کوشش نہ کی اور چشم پوشی برتتے رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا علاقہ گندگی کا ڈھیر بن گیا۔ ہریالی کے فقدان اور ٹریفک کی بھرمار سے وہاں کی فضا میں سانس لینا بھی دشوار ہوتا جا رہا ہے۔

پہلوانوں کے اکھاڑوں کے سامنے ایک ہندو پبلشر کی دکان تھی۔ وہ کوئی برنام واس نام کے وید کی "ہدایت نامہ خاوند" "ہدایت نامہ بیوی" جیسی کتابیں چھاپا کرتا تھا جو بے حد مقبول تھیں اور ریوڑیوں کی طرح بکتی تھیں۔ اسی حاتے میں Society for the Promotion of Scientific Knowledge کا ہال تھا۔ سوسائٹی کی رعایت سے اسے "ایس پی ایس کے ہال" کہا جاتا تھا۔ اس میں بڑی بڑی علمی کانفرنسیں اور مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور کارپوریشن کے بزرجمہروں نے سڑک فراخ کرنے کے نام پر اس تاریخی عمارت کو مسمار کر دیا اور لاہوریوں کو اس کے ایک تاریخی ورثے (heritage) سے محروم کر دیا۔ اگر شاہ عالم چوک کے سامنے سڑک کے عین بیچوں بیچ مسجد کو برقرار رکھا جا سکتا ہے، پھر ایس پی ایس کے ہال کو کیوں نہیں؟ یہ تو بنا ہوا بھی سڑک کے باہر تھا۔

موری گیٹ کے عین سامنے کا علاقہ آج کل اردو بازار کہلاتا ہے۔ اس زمانے میں اس سڑک کا نام، جو سرکلر روڈ سے شروع ہوتی ہے اور سنٹرل ماڈل سکول کے چوک پر اختتام پذیر، موہن لال روڈ تھا۔ نام کی غالباً یہ واحد تبدیلی تھی جسے اہل لاہور نے بخوشی قبول کیا ورنہ جن دوسری سڑکوں — مثلاً فیروز پور روڈ، جیل روڈ، ڈیوس روڈ، ایمپرس روڈ، ٹمپل روڈ وغیرہ — کے نام بار بار تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی وہ ہمیشہ سعیِ لاحاصل ثابت ہوئی، نئے ناموں کو کبھی قبولیت عامہ کی سند حاصل نہ ہو سکی۔

موہن لال روڈ جہاں سے لوئر مال کی طرف مڑتی تھی، وہاں ایک گلی کے نکڑ پر بھلنہ بک ڈپو کے نام سے پرانی (سیکنڈ ہینڈ) درسی کتابوں کی دکان ہوتی تھی۔ لاہور کے کالجوں اور سکولوں کے طلبا اکثر اس دکان کا طواف کرتے رہتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد یہ دکان جالندھر کے مولوی سردار محمد کو الاٹ ہوئی۔ مولوی صاحب نے اس دکان کا نام "علمی کتاب خانہ" رکھا۔ وہ اصلاً تھے تو کاتب مگر کتابوں کا یہ دھندا بھی انھیں بہت راس آیا۔ وہ پہلے کتب فروشی کرتے رہے، پھر انھوں نے درسی کتابوں کے خلاصے اور مختلف مضامین کی امدادی کتب (help books) بھی شائع کرنے کا کام شروع کر دیا۔ "مکتبہ کارواں" کے مالک چودھری عبدالحمید کی طرح مولوی سردار محمد بھی بے حد شریف النفس اور دیانت دار شخص تھے۔ وہ اپنے مصنفین کے ساتھ جو وعدہ کرتے تھے، اسے ہر صورت پورا کرتے تھے اور ادائیگی ہمیشہ چیک کے ذریعے کرتے تھے تاکہ حکومت کو بھی اس کا ٹیکس ملتا رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے بھی انھیں ان کی نیک نیتی کا اجر دیا۔ ان کا کاروبار اتنا پھیل گیا کہ انھوں نے کچہری روڈ کی طرف سے جانے والی سڑک پر ایک اور دکان بنائی۔ ان کا بڑا کارنامہ وارث سرہندی کی لغت لکھوانا اور چھاپنا تھا۔

سب سے آخر میں بھاٹی گیٹ آتا ہے۔ حکیم احمد شجاع کے مطابق اس کا اصل نام بھٹی گیٹ تھا مگر

امتداد زمانہ نے اسے بھاٹی گیٹ بنا دیا۔ غالباً 1960 کی دہائی میں حکیم صاحب کا ایک مضمون لاہور کے مشہور ادبی جریدے ''نقوش'' میں شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے بھاٹی گیٹ کو لاہور کا چیلسی بنا کر پیش کیا تھا۔ حکیم احمد شجاع بڑی کثیر الجہت (versatile) شخصیت تھے۔ وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ڈرامے اور افسانے لکھتے تھے۔ انھوں نے ''قاتل''، ''دوپٹہ'' اور ''دو آنسو'' جیسی فلموں کی کہانیاں اور ''کاروانِ حیات'' کے مکالمے لکھے تھے۔ انگریز حکومت نے انھیں ایم بی ای (ممبر آف برٹش ایمپائر) کا خطاب دیا تھا۔ وہ مدتوں پنجاب اسمبلی کے سیکرٹری رہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تصوف کی دنیا میں بھی قدم رکھتے تھے۔

بھاٹی گیٹ کے باہر تانگوں کا اڈا ہوتا تھا جہاں سے ریلوے سٹیشن کو تانگے چلا کرتے تھے اور فی سواری چار آنے وصول کیا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک خالی میدان ہوتا تھا جس میں سرکس اور گھوڑوں کی منڈی لگا کرتی تھی۔

## 58

ایک زمانے میں بھاٹی گیٹ کے اندر چھوٹے موٹے خصوصاً پنجابی کے شاعروں اور ادیبوں کی بھرمار تھی تاہم ان کے علاوہ بعض قدآور شخصیات وہاں مستقلاً یا عارضی طور پر مقیم رہی تھیں۔ علامہ اقبال کے نام سے تو سبھی آشنا ہیں۔ دیگر اکابرین میں شیخ سر عبدالقادر، اورینٹل کالج کے پروفیسر محمد شفیع، ''تہذیبِ نسواں'' کے ایڈیٹر، دارالاشاعت کے بانی اور امتیاز علی تاج کے والد محترم مولوی ممتاز علی، ''تاریخ لاہور'' کے مؤلف سید محمد لطیف، اسلامیہ کالج کے عربی کے یگانۂ روزگار پروفیسر اصغر علی روحی، جن کے علم و فضل کا ہر کوئی معترف تھا، اردو کے صاحبِ طرز ادیب مولانا محمد حسین آزاد، مشہور ڈراما نگار آغا حشر، اسلامیہ کالج لاہور کے انگریزی کے پروفیسر اور پرنسپل عبدالغنی، جن کے شیکسپیئر پر لیکچروں کی دھوم رہتی تھی جنھیں سننے کے لیے طلبا ہی نہیں، دور دور سے عام لوگ بھی آتے تھے اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر، مشہور افسانہ نگار غلام عباس اور گورنمنٹ کالج لاہور کے درویش صفت پرنسپل ڈاکٹر نذیر احمد، جو پرنسپلی کے زمانے میں بھی اپنی سائیکل پر آتے جاتے رہے، جانے پہچانے کرکٹر عبدالحفیظ کاردار، خان محمد، نذر محمد، امتیاز احمد وغیرہ شامل تھے۔ [کاردار کے خاندان کی ساندہ کلاں خرد میں زرعی زمینیں بھی تھیں۔] شیخ عبدالقادر کا اردو کا عہد ساز رسالہ ''مخزن'' بھی، جس نے پنجاب میں اردو کے فروغ میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا، اپنے ابتدائی دور میں اور

یوسف حسن کا ''نیرنگِ خیال'' یہیں سے شائع ہوتا تھا۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے اپنا فقید المثال جریدہ ''کارروان'' یہیں سے نکالا تھا۔ اس کے صرف دو ہی شمارے شائع ہو سکے تھے کہ وہ مزید تعلیم کے لیے انگلستان سدھار گئے۔ یہ ''نقوش'' کے بعض شماروں کی طرح بہت ضخیم ہوتا تھا۔ یہ فقید المثال اس لیے تھا کیونکہ اس میں مضامین نظم ونثر کے علاوہ عبدالرحمن چغتائی کی لازوال تصاویر (paintings) اور ان پر تاثیر کے بصیرت افروز تبصرے اور پطرس بخاری کے ترجمے شائع ہوتے تھے۔ بھاٹی گیٹ کے جن دیگر اکابرین نے نام کمایا ان میں اس زمانے کے گولڈن جوبلی فلموں کے ہیرو ایم اسمٰعیل، عبدالحفیظ کاردار کے کزن فلم ڈائریکٹر اے آر (عبدالرشید) کاردار، شاعر اور فلمی نغمہ نگار تنویر نقوی، گلوکار محمد رفیع، موسیقار فیروز نظامی وغیرہ شامل تھے۔ چودھری برکت علی اور ان کے بھتیجے نذیر احمد چودھری کا خوبصورت اور دیدہ زیب کتابیں اور رسالے چھاپنے والا مشہور چودھری خاندان بھی بھاٹی گیٹ کے اندر ہی رہتا تھا۔ اس خاندان کے سرخیل چودھری برکت علی نے ادبی کتابیں چھاپنے کے لیے مکتبہ اردو اور درسی کتابوں کی اشاعت کے لیے پنجاب بک ڈپو قائم کیا اور مشہور ادبی جریدے ''ادبِ لطیف'' کا اجرا کیا جس نے اردو ادب پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ [اس رسالے کو ان کی صاحب زادی صدیقہ بیگم آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہے۔] چودھری برکت علی کے بڑے بھتیجے نذیر احمد پہلے ان کے کاروبار میں شریک رہے، پھر انھوں نے ''نیا ادارہ'' کے نام سے اپنی دکان کھول لی اور زندہ و تابندہ ادبی رسالے ''سویرا'' کا آغاز کیا جسے اب بھی ان کے صاحب زادے ریاض احمد چودھری محمد سلیم الرحمٰن کے تعاون سے شائع کر رہے ہیں۔ نذیر احمد چودھری کے چھوٹے بھائیوں — بشیر احمد چودھری، رشید احمد چودھری، محمد حنیف رامے اور محمد حفیظ چودھری نے اپنا اشاعتی ادارہ ''مکتبہ جدید'' کے نام سے قائم کیا۔ انھوں نے جدید اردو ادیبوں کی کتابیں چھاپنے کے علاوہ قیامِ پاکستان کے بعد سعادت حسن منٹو اور محمد حسن عسکری کی ادارت میں ''اردو ادب'' نام کا ادبی رسالہ بھی نکالا تھا۔ [رامے ارائیوں کی ایک گوت ہے۔ محمد حنیف رامے بہت اچھے مصور اور خطاط تھے۔ وہ فرانس کے سیزان (Cezane)، مانے (Manet)، مونے (Monet) جیسے تاثرات پسند (impressinistic) مصوروں سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ مانے اور مونے کی رعایت سے انھوں نے اپنے نام کو Ramet لکھنا شروع کر دیا۔ بعد میں انھیں خیال آیا کہ یہاں کے لوگ تو اسے شاید رامیت پڑھیں گے، چنانچہ دوستوں کے مشورے سے انھوں نے اسے Ramay بنا لیا۔] اسی زمانے میں میں نے ادھر ادھر سے مواد اکٹھا کر کے سیزان پر ایک کچا پکا مضمون لکھ مارا جسے میرزا ادیب نے فراخ دلی سے ''ادبِ لطیف'' میں چھاپ دیا۔

یہ درست ہے کہ ان قدآور شخصیات کی وجہ سے بھاٹی گیٹ لاہور کا اہم مقام بنا رہا ہے مگر حکیم صاحب نے اسے لاہور کا چیلسی کیوں کہا، کم از کم میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ کیا اس کی وجہ ہمارا یہ احساس کمتری تو نہیں کہ جب تک ہم اپنی بعض اہم شخصیات اور مقامات کو دیار مغرب کی مشہور و معروف شخصیات اور مقامات سے تشبیہ نہ دے لیں، ہماری تسلی نہیں ہوتی۔ ہم آغا حشر کو شیکسپیئر، ظہیر عباس کو ایشیا کا بریڈ مین اور لائل پور کو پاکستان کا مانچسٹر بنا دیتے ہیں اور یہ بھی نہیں سوچتے کہ جن شخصیات اور مقامات سے انھیں تشبیہ دی جا رہی ہے، ان کے مقابلے میں یہ بالکل بونے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ کسی نے میر، غالب، اقبال اور کرکٹر عمران خاں کو کوئی مغربی شخصیت نہیں بنایا۔

اس چیز سے انکار نہیں کیا جا سکتا چیلسی میں بیسویں صدی سے قبل جوناتھن سوفٹ (Swift)، ٹامس کارلائل، الزبتھ گاسکل، جارج ایلیٹ، ہنری جیمز، مصور ہنری ٹرنر، انشا پرداز رچرڈ سٹیل، نقاد اور شاعر لی ہنٹ (Leigh Hunt) اور ناول نگار جارج میری ڈتھ (Meredith) رہائش پذیر رہ چکے تھے مگر بیسویں صدی کے آتے آتے چیلسی امرا کا گڑھ بن چکا تھا۔ اب وہاں ادیب اور عالم فاضل لوگ نہیں بلکہ بڑی بڑی اداکارائیں، بینکار، بیمہ فروش اور صنعت کار رہنے لگے تھے۔ ادیبوں اور صاحب علم لوگوں کا اصل مرکز تو بلومز بیری (Bloomsbury) تھا بلکہ اب بھی ہے۔[اگر اس علاقے کا کسی حد تک کوئی ہمسر تھا اور ہے تو وہ ہیمپ سٹیڈ (Hampstead) ہے۔] یہاں نظریہ ارتقا کے بانی چارلس ڈارون، شاعر فرینک سیونرٹن (Swinnerton)، نقاد اور ناول نگار تھیوڈور واٹس ڈنٹن (Watts-Dunton)، طربیہ خداوندی (Divine Comedy) کی مترجم اور ادبی چاشنی کے حامل جاسوسی ناول لکھنے والی ڈوروتھی ایل سیئرز (Sayers)، ٹی ایس ایلیٹ، جارج میری ڈتھ (Meredith)، Pre-Raphaelite Brotherhood کے مصوروں کا روح رواں دانتے گیبرئیل روزیٹی (Dante Gabriel Rossette) اور اس کے بعض ہم پیالہ و ہم نوا، تحریک حقوق نسواں کی عظیم علم بردار ملی سنٹ گیرٹ فوسیٹ (Millicent Garrett Fawcett)، عظیم آئرش شاعر ڈبلیو بی ییٹس (Yeats)، آسکر وائلڈ (Wilde)، سر جیمز میتھیو بیری (Jim Barrie)، جس کے لازوال ڈرامے پیٹر پین (Peter Pan) کے دائمی حقوق مصنف کی خواہش اور کاپی رائٹ ایکٹ میں خصوصی ترمیم کے ذریعے لندن کے بچوں کے مشہور عالم ہسپتال Great Ormond Street Children's Hospital کے نام محفوظ ہیں، ناول نگار اور وزیر اعظم برطانیہ ڈزرائیلی (Isaac D'Israeli) اور روایت شکن امریکی ادیبہ گرٹروڈ سٹائین (Gertrude Stein) مستقلاً یا عارضی طور پر سکونت پذیر رہے۔ اسی علاقے میں برٹش میوزیم [جس میں برٹش لائبریری بھی شامل تھی جس کے ریڈنگ روم میں

بڑے بڑے ادیب اور محقق بیٹھا کرتے تھے۔ یہ لائبریری اب کنگز کراس سٹیشن کے قریب یوسٹن روڈ (Euston Road) روڈ پر اپنی نئی وسیع و عریض اور پرشکوہ عمارت میں منتقل ہو چکی ہے]، لندن یونیورسٹی، سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز اور نئی اور پرانی کتابوں کی بے شمار دکانیں واقع ہیں۔

لیکن اس علاقے کو اصل شہرت حکیم صاحب کے اپنے معاصر ادیبوں اور دانش وروں کے ایک گروہ کے باعث ملی جنھیں بحیثیت مجموعی بلومز بری گروپ کہا جاتا ہے۔ اس گروہ میں ورجینیا وولف (Woolf)، اس کا پبلشر شوہر لیونارڈ (Leonard) وولف، اس کی مصورہ ہمشیرہ وینیسا بیل (Vanessa Bell) اور بہنوئی اور آرٹ کا نقاد کلائیو بیل (Clive Bell)، مصور ڈنکن گرانٹ، مصور اور آرٹ کا نقاد روجر فرائی (Roger Fry)، اپنے عہد کا عظیم ترین ماہر معاشیات لارڈ جون مینارڈ کینز (Maynard Keynes)، صحافی اور مدیر ڈیزمونڈ میکارتھی (Desmond MacCarthy)، ماہر تحلیل نفسی ایڈرین سٹیفن (Adrian Stephen)، ناول نگار اور نقاد ای ایم فورسٹر (Forster)، نامور مورخ لٹن سٹریچی (Lytton Strachey)، ورجینیا وولف کا بھائی تھوبی (Thoby) سٹیفن، مصور ڈورا کیرنگٹن (Carrington) اور سول سرونٹ سیکسن سڈنی ٹرنر (Saxon Sydney - Turner) وغیرہ شامل تھے۔ اگر حکیم صاحب بھاٹی گیٹ کا موازنہ لندن کے کسی علاقے سے کرنا گزیر سمجھتے تھے، تو بلومز بری سے کرتے۔

اس علاقے میں برصغیر کے لوگوں کی دلچسپی کی چیز نوراتسا (عنایت) کا کانسی کا مجسمہ ہے۔ نوراتسا شیر میسور سلطان ٹیپو کے اخلاف میں سے تھی۔ وہ جنگ عظیم دوم کے دوران میں فرانس میں انگریزوں کی جاسوس تھی۔ پکڑی گئی۔ جرمنوں نے اسے طرح طرح کی ایذائیں دیں۔ وہ بالآخر ہلاک ہوگئی مگر اس نے مرتے دم تک اپنی زبان نہ کھولی۔ اس کی اس قربانی کے اعتراف کے طور پر 8 نومبر 2012 کنگز کراس سٹیشن کے قریب بلومز بری کے گورڈن چوک (Gorden Square) میں، جس کے قریب ہی اس کی رہائش گاہ تھی، لوگوں کے چندوں سے جمع کیے گئے ایک لاکھ پاؤنڈ کے خرچ سے اس کا کانسی کا مجسمہ نصب کیا گیا۔

بھاٹی گیٹ سے آگے داتا دربار آتا ہے۔ یہ علاقہ بھی اب پہلے سے بے حد مختلف ہو چکا ہے۔ دربار صاحب کے قریب ایک سڑک ہے جس پر کربلا گامے شاہ ہے جہاں دس محرم (یوم عاشورہ) کا جلوس اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک میلا رام ٹیکسٹائل مل تھی۔ کہا جاتا ہے جب یہ کارخانہ قائم ہوا تھا، یہاں تین دن محفل موسیقی و رقص برپا ہوتی رہی جس میں برصغیر کے نامور گلوکاروں اور رقاصاؤں نے حصہ لیا تھا۔ پاکستان کے حصے میں جو دو چار کارخانے آئے تھے ان میں یہ بھی شامل تھا۔ ہمارے دوست اور

نفیس غزل گو احمد مشتاق نے بھی کچھ عرصہ اس میں کام کیا تھا۔ ان کی ڈیوٹی عموماً رات کو ختم ہوتی تھی، ہم۔۔۔ ناصر کاظمی، انتظار حسین، مظفر علی سید، راقم الحروف وغیرہ۔۔۔ اکثر انھیں لینے جایا کرتے تھے اور واپسی پر دربار صاحب کے چوک کے ایک ٹوٹے پھوٹے ریستوران میں، جو ساری رات کھلا رہتا تھا، چائے پیا کرتے تھے۔

دربار صاحب سے آگے اسلامیہ ہائی سکول تھا۔ عبدالحفیظ کاردار، امتیاز احمد اور بھاٹی گیٹ کے اکثر لوگوں نے ابتدائی تعلیم اسی سکول میں پائی تھی۔ داتا دربار بھی پہلے سے کہیں وسیع و عریض ہو گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے اردگرد کی متعدد عمارتیں گرانا پڑیں جن میں یہ سکول بھی شامل تھا اور یوں اہلِ لاہور کا ایک اور ورثہ پیوندِ خاک ہو گیا۔

داتا دربار سے سول سیکرٹریٹ کی طرف جانے والی سڑک لوئر مال کہلاتی ہے۔ اس سڑک پر ضلع کچہری (ڈسٹرکٹ کورٹس) اور گورنمنٹ کالج آمنے سامنے واقع ہیں۔ انگریزوں نے مختلف شہروں کے مابین فاصلہ ماپنے کے لیے ہر ضلع کی کچہری کے سامنے بھاری پتھر نصب کر رکھے تھے۔ لاہور میں یہ پتھر گورنمنٹ کالج کے جنوبی گیٹ کے ساتھ، جو آج کل بند رہتا ہے، پیوست تھا۔ معلوم نہیں یہ پتھر اب بھی موجود ہے یا میاں شہباز شریف کی میٹرو بس کی لپیٹ میں آ چکا ہے۔

گورنمنٹ کالج اس زمانے میں امرا کا کالج سمجھا جاتا تھا، اس میں غریب آدمی کا بیٹا داخلے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کا پرنسپل عموماً انگریز ہوتا تھا اور یہ اتنا طاقت ور ہوتا تھا کہ اس کے نامزد وامیدوار بلا امتحان اور انٹرویو پی سی ایس (پنجاب سول سروس) بن جاتے تھے۔ صرف 1940 کی دہائی میں دو تین سال کے لیے جی ڈی سوندھی دیسی پرنسپل بن گئے تھے۔ سوندھی کے نام پر گورنمنٹ کالج میں سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی اب بھی موجود ہے۔ خود سوندھی تقسیم کے بعد کئی سال انڈین اولمپک ایسوسی ایشن کے صدر رہے۔

کالج میں انگریزی پروفیسر پطرس (احمد شاہ بخاری) جیسی قدر آور شخصیات پڑھایا کرتی تھیں۔ پروفیسر سراج الدین اور پروفیسر اندرورما [ان کی گرامر اور کمپوزیشن پر ضخیم کتاب اپنی مثال آپ تھی۔ وہ تقسیم کے بعد (بھارتی) پنجاب یونیورسٹی کے اولین وائس چانسلر مقرر ہوئے۔] نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز یہیں سے کیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے رقیب تھے۔ ہوا یہ کہ دونوں ایک ہی دوشیزہ۔۔۔ رضیہ۔۔۔ کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ رضیہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی، خوبصورت تھی اور سب سے بڑھ کر بہت اچھی مصور تھی۔ اس نے شرط عاید کر دی کہ ان میں سے جو انگلستان سے پہلے ڈگری لے کر آئے گا، وہ اس کے ساتھ شادی کر لے گی۔ اتفاق سے سراج صاحب پہلے لوٹ آئے اور انھوں نے رضیہ کے ساتھ شادی کر

لی۔ رضیہ کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ سراج صاحب نے اس کا نام اپنے دوست پروفیسر امداد حسین کے نام پر امداد حسین رکھا۔ بعد میں یہ امداد حسین بہت اچھا پیانسٹ (pianist) بنا۔ ایوب خاں کے زمانے میں "پاکستان ٹائمز" میں اس کے متعلق متعدد مضامین اور خبریں شائع ہوئی تھیں۔

سراج صاحب استاد تو بہت اچھے تھے مگر آدمی دل پھینک تھے۔ سوندھی کی بیٹی اُرملا ایم اے میں ان سے انگریزی پڑھا کرتی تھی۔ سراج صاحب اس پر فدا ہو گئے۔ اُرملا نے محبت کا جواب محبت میں دیا اور دونوں نے چپکے سے آپس میں شادی کر لی۔ سراج صاحب نے اپنی پہلی بیوی رضیہ کو طلاق دے دی۔

تقسیم کے بعد سراج صاحب کو خیال آیا کہ اُرملا تو ہندو نام ہے، کہیں گڑبڑ نہ ہو جائے، (وہ لاہور کالج فار ویمن میں پڑھایا کرتی تھی اور مدت ملازمت مکمل ہونے پر بطور صدر شعبہ ریٹائر ہوئی تھی) چنانچہ انھوں نے اس کا نام امراؤ سراج الدین رکھ دیا اور یوں وہ یُو (U) سراج کی یُو سراج ہی رہی۔ جب ملک میں امن چین قائم ہو گیا، وہ دوبارہ اُرملا سراج بن گئی۔

پروفیسر سوندھی کیا وضع آدمی تھے، ان کی دوسری بیٹی صوبہ سرحد کے ہوتی خاندان کے ایک وجیہہ و شکیل نوجوان محمد علی کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ ان دونوں نے بھی آپس میں شادی کر لی۔ سوندھی تو دلی چلے گئے مگر ان کی دونوں بیٹیاں پاکستان میں مقیم رہیں۔

## 59

11 جون 1946 کو ہماری پڑھائی شروع ہو گئی۔

شامت اعمال ما، ہمیں انگریزی پڑھانے کے لیے ایک فرانسیسی موسیو پانساں (Pinson) مقرر ہو گئے۔

اسلامیہ کالج اور اس میں انگریزی کوئی فرانسیسی پڑھائے، ایک معما تھا سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ شاید موصوف جنگ کی وجہ سے اپنے وطن مالوف واپس نہیں جا سکے تھے اور یوں روزی کمانے کے لیے انھیں جو وسیلہ دستیاب ہوا، اسے بروئے کار لے آئے۔ وہ ایک تو فرانسیسی تھے، اوپر سے بولتے بھی ناک میں تھے، ہم جیسے دیہاتیوں، قصباتیوں اور لاہور کے نسبتاً کم خوشحال خاندانوں کے بیٹوں کی، جن کی کلاس میں اکثریت تھی، خاک سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا فرما رہے ہیں۔ اوپر سے شاعری کی کتاب ایک پولش پروفیسر کی اے ایچ بیری (Barry) کی مرتب کردہ تھی۔ وہ چیفس کالج (ایچی سن کالج) میں پڑھاتے تھے۔ وہ غالباً

سمجھتے تھے کہ پنجاب کے عام سکولوں کے طلبا کی انگریزی کا معیار ان کے اپنے کالج کے طلبا کا ہوگا۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے انتخاب کے آغاز میں آسان نظمیں شامل کرتے، انھوں نے اسے زمانی اعتبار (chronological order) سے مرتب کرنا مناسب خیال کیا۔ چنانچہ انھوں نے ابتدا شیکسپیئر کے دو تین سانیٹوں (Sonnets) اور دو چار ڈراموں کے اقتباسات سے کی [اگر وہ چوسر سے شروع ہو جاتے، ہم ان کا کیا بگاڑ لیتے ا۔] پیشتر پڑھنے والے دیہاتی اور قصباتی، پڑھانے والا فرانسیسی اور پڑھنا پڑا شیکسپیئر، ہم سب کے پسینے چھوٹنے لگے۔ ہم نے ہوسٹل میں بعض سینئر طلبا سے اپنی مشکل بیان کی۔ انھوں نے سمجھایا: "میاں، کن چکروں میں پڑے ہو۔ اگر پانساں جیسے پروفیسروں کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے، پھر تمھارا بیڑا کبھی پار نہیں ہوگا۔ بھئے بک شاپ پر جاؤ، نیا یا پرانا جو خلاصہ بھی ملے، خرید لاؤ۔ خلاصے لکھنے والوں نے ہر چیز بڑی وضاحت اور صفائی سے بیان کر دی ہے بلکہ اہم باتوں کے آغاز میں ہاتھ کا نشان بھی بنا دیا ہے۔ پڑھو گے تو ہمیں دعائیں دو گے۔" ہم نے ان کی نصیحت پلّے باندھ لی۔ ان دنوں دو ہندو پروفیسروں — چیٹر جی اور کے ایل کپور — کے خلاصے بہت چلتے تھے۔ کوئی غیبی آواز آئی کہ کے ایل کپور کا خلاصہ خرید لو، نفع میں رہو گے۔ کے ایل کپور ڈی اے وی کالج میں پڑھاتے تھے اور اضافی آمدنی کے لیے ہر کتاب کا خلاصہ لکھا کرتے تھے۔ ان کی تحریر اتنی آسان اور شگفتہ ہوتی تھی کہ شیکسپیئر کا باپ ہوتا، وہ بھی ہمارے پلّے پڑ جاتا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کے ایل کپور اردو کے جانے پہچانے طنز نگار کنھیا لال کپور تھے۔ گویا قدرت ہم پر مہربان تھی، خلاصہ بھی پڑھا تو کس کا، کنھیا لال کپور کا، اس سے بڑی خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی تھی۔

نثر کی کتاب ایف سی کالج کے پروفیسر ویلٹی (Velte) کی مرتب کردہ تھی۔ ویلٹی اصلاً امریکی تھے۔ غالباً کسی پادری کے فرزند ارجمند تھے۔ یاد نہیں انھوں نے اپنے انتخاب میں کس کس نثر نگار کی نگارشات شامل کی تھیں، مگر ایک اقتباس جس نے کچھ اس طرح میرے ذہن کو اپنی گرفت میں لیا کہ میں اسے کبھی بھول نہیں پایا۔ یہ اقتباس لارڈ میکالے کی کتاب "History of England" سے لیا گیا تھا۔ [یہ وہی میکالے تھا جس نے برصغیر میں انگریزی تعلیم کی راہ ہموار کی، بابوؤں کا طبقہ پیدا کیا، مقامی لوگوں کی اپج (originality) ختم کی جو صرف مقامی/مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے سے فروغ پاتی ہے، دفتر بازی کو پروان چڑھایا اور جس نے بڑی رعونت اور حقارت سے کہا تھا کہ مشرق کی اوقات یہ ہے کہ اس کا سارا علم ایک الماری میں بند کیا جا سکتا ہے۔] میکالے کی کتاب کا اقتباس برطانوی تاریخ کے ایک الم ناک واقعے سے متعلق تھا۔ ہوا یہ کہ برطانیہ کے بادشاہ چارلس دوم کا بھائی جیمز دوم تخت نشیں ہو گیا۔ جیمز دوم رومن کیتھولک تھا جب کہ ملک کی بھاری اکثریت پروٹسٹنٹ تھی۔ جیمز دوم نے اپنے عقائد کو پروان چڑھانا اور پروٹسٹنٹوں کا ناطقہ

بند کرنا شروع کر دیا۔ چارلس دوم کے حکم پر جیمز دوم کی دونوں بیٹیوں کی تربیت پروٹسٹنٹ کے طور پر ہوئی تھی اور اس کی بڑی بیٹی میری کی شادی بھی جرمنی کی ایک چھوٹی سی ریاست اورنج (Orange) کے والی ولیم پرنس آف اورنج کے ساتھ ہوئی تھی۔ جیمز دوم کے ارادوں کو بھانپ کر برطانوی پارلیمنٹ کے سرکردہ ارکان نے پرنس ولیم اور اس کی بیوی میری کو برطانیہ پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا۔ پرنس ایک بحری بیڑا لے کر چل پڑا مگر اس کے پہنچنے سے پہلے ہی جیمز دوم آئرلینڈ بھاگ گیا۔ پرنس ولیم اور میری کسی خون خرابے کے بغیر برطانوی تخت پر قابض ہو گئے اس واقعے کو برطانوی تاریخ میں ''سنہری انقلاب'' (Golden Revolution) کہا جاتا ہے۔

آئرلینڈ تب بھی اور اب بھی رومن کیتھولک ملک ہے مگر اس کی مشرق کی چھ کاؤنٹیوں میں سکاٹ لینڈ کے پروٹسٹنٹ اتنی کثیر تعداد میں آباد ہو چکے تھے کہ انھیں وہاں بھاری اکثریت حاصل ہو گئی۔ باقی آئرلینڈ کے برعکس ان کاؤنٹیوں نے جیمز دوم کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جیمز دوم کی حامی فوج نے مار دھاڑ کرتے ایک شہر ڈیری کا محاصرہ کر لیا۔ شہر کے لوگوں نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی سزا انھیں یہ ملی کہ باہر سے خوراک کی رسد بند ہو گئی اور محاصرے کے طول پکڑنے پر غذا کی اتنی قلت ہو گئی کہ محصور لوگ کتوں، بلیوں اور ان لوگوں کا، جو فاقہ کشی سے انتقال کر جاتے تھے، گوشت کھانے پر مجبور ہو گئے۔ کوئی تین ماہ بعد محاصرہ تب ختم ہوا جب برطانیہ کے نئے حکمران ولیم آف اورنج نے اپنی بحری فوج آئرلینڈ بھیجی جس نے جیمز دوم کو شکست دی۔ جب محاصرہ ختم ہوا شہر کے لوگوں نے اظہار تشکر کے طور پر اپنے شہر کا نام لنڈن ڈیری رکھ دیا۔ 1921 میں جب آئرلینڈ برطانیہ سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا، یہ چھوں کاؤنٹیاں شمالی آئرلینڈ کے نام سے برطانیہ کا حصہ چلی آ رہی ہیں۔ پچھلے چند سالوں تک وہاں کے پروٹسٹنٹوں اور رومن کیتھولکوں کے مابین جو فساد ہوتا رہا ہے، اس کا آغاز اسی واقعے سے ہوا تھا۔ ایک تو یہ واقعہ خود بڑا الم ناک اور دل خراش تھا، اوپر سے میکالے کا پرشکوہ اور گھن گرج سے بھرپور (sonorous) انداز تحریر، ہمارے قلوب و اذہان پر اس کا اثر تو ہونا ہی تھا۔ وِلٹی خود بھی پروٹسٹنٹ تھا۔ اس کا اس تحریر کو شامل کرنے کا مقصد بھی شاید پروٹسٹنٹوں کے لیے مقامی لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا تھا۔

انگریزی کے نصاب میں ایک ناول بھی شامل تھا۔ اس کے مصنف سر آرتھر کولر کوچ (Quiller-Couch) تھے۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر تھے۔ ہمارے ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے انھی کی نگرانی میں اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا تھا اور انھی کی تحریک پر یہ ناول ہمارے نصاب میں داخل کیا گیا تھا۔ وہ اپنے

زمانے کے بہت بڑے ادبی نقاد تھے [ ہمارے محمد سلیم الرحمٰن بھی ان کی نثر کے بہت معتقد ہیں ]۔ انگریزی ادبی تنقید میں نئی راہیں تراشنے والے ایف آر لیوس (Leavis) ان کے متوسلین (proteges) میں شامل تھے۔ کولر کوچ افسانہ نویس اور ناول نگار بھی تھے۔ [ حال ہی مجھے یہ پڑھ کر بہت حیرت ہوئی کہ وہ جاسوسی کہانیاں بھی لکھا کرتے تھے اور جنگ عظیم دوم سے قبل اس قسم کی کہانیوں کے جو انتخابات شائع ہوتے تھے، ان میں ان کی کوئی نہ کوئی کہانی ضرور شامل ہوتی تھی۔ ] تاہم ان کا سب سے بڑا کارنامہ شعر و شاعری اور دیگر اصناف سخن کے انتخابات تھے، اس لیے انھیں بابائے انتخابات (master anthologist) کہا جاتا تھا۔ 1992 میں بی بی سی کے ڈرامے The Last Romantics کے مرکزی کردار کولر کوچ تھے۔ ڈرامے کی کہانی ان کے چہیتے شاگرد اور متوسل ایف آر لیوس اور دیگر شاگردوں کے ساتھ تعلقات کے گرد گھومتی ہے۔

کولر کوچ کا شہکار انتخاب "Oxford Book of English Verse" تھا تا آنکہ 1972 میں پروفیسر ہیلن گارڈنر کی جنھیں ٹی ایس ایلیٹ کے بہترین شارحین میں شامل کیا جاتا ہے، ''نیو آکسفرڈ بک آف انگلش ورس'' نے لے لی۔ کولر کوچ کے انتخاب کا آغاز کسی گمنام شاعر کی نظم Cuckoo Song سے ہوتا ہے جو 1250 میں منظر عام آئی تھی۔ آپ نے cuckoo کے متعلق، جسے آپ دلاتی کوئل سمجھ لیں، ولیم ورڈزورتھ کی نظم پڑھی ہوگی، اب اس نظم کا بھی چسکا لیں:

Sumer is icumen in,
Lhude sing cuccu!
Groweth sed, and bloweth med,
And springth the wude nu —
Sing cuccu!

Awe bleteth after lomb,
Lhouth after calve,
Bulluc sterteth, bucke verteth,
Murie sing cuccu!

Cuccu, cuccu, well singes thou, cuccu:
Ne swike thu naver nu.
Sing cuccu, nu, sing cuccu,

Sing cuccu, sing cuccu, nu!

نظم میں کسی مقبول گیت کی روانی اور غنائیت پائی جاتی ہے بشرطیکہ آپ بعض الفاظ کی موجودگی سے گھبرا نہ جائیں۔ چند الفاظ آج بھی مستعمل ہیں، صرف ہجے تبدیل ہو گئے ہیں، مثلاً sumer(summer)، lhude(loud)، awe(ewe بھیڑ)، louth(loweth)، sed(seed)، mead(meadow)، bleteth (bleats)، murie(merrily)، naver(never)، nu(now)؛ البتہ بعض الفاظ اب متروک ہو چکے ہیں، مثلاً sterteth(leaps)، swike(cease)، mead blows کا مطلب meadow grows/blossoms، جب کہ wud to spring the wood sprouts ہے۔ icumen کو جدید انگریزی میں is coming اور louth کو moos کیا جاتا ہے۔ پوری نظم کو جدید انگریزی میں اس طرح لکھا جا سکتا ہے:

Summer has come in; / the cuckoo sings loudly!

Seeds grow and the meadow blossoms

The wood springs new. / Sing cuckoo.

The ewe bleats after her lamb / the cow lows after her calf

The young bull leaps. The bullock darts

Merrily sings the cuckoo! / cuckoo, cuckoo

Well do you sing. / Never stop singing.

اپنی quaint (خلاف معمول یا قدیم الوضع ہونے کے سبب پرکشش) زبان کے باوصف یہ گیت اس قدر سریلا اور غنائیت سے بھرپور ہے، کہ اسے آج کے زمانے میں بھی بے شمار گیتوں اور فلموں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی متعدد پیروڈیاں (parodies) بھی کی گئی ہیں۔ بیسویں صدی کے عظیم امریکی شاعر ایذرا پاؤنڈ کی پیروڈی درج ذیل ہے:

Winter is icumen in, / Lhude sing Goddamm,

Raineth drop and staineth slop,

And how the wind doth ramm!

Sing: Goddamm.

Skiddeth bus and sloppeth us,

An ague hath my ham.

Freezeth river, turneth liver,
Damn you, Sing Goddamm.
So 'gainst the winter's balm.
Sing goddamm, damm, sing goddamm,
Sing goddamm, sing goddamm, Damm.

کولر کوچ کے ناول Fort Amity کا تعلق ایک عالمی جنگ سے ہے جو 1754 اور 1763 کے مابین یورپی طاقتوں کے مابین دنیا کے مختلف ممالک پر قبضہ جمانے کے لیے یورپ، شمالی امریکا، وسطی امریکا، مغربی افریقہ، برصغیر اور فلپائن میں لڑی گئی تھی۔ ناول کی بساط زیادہ تر امریکا (USA) کی مشرقی ریاست میساچوسٹس (Massachusetts) میں بچھائی گئی ہے۔ اس قسم کی بساط میں قاری کسی adventure story (مہم جویانہ کہانی) کی توقع کرتا ہے لیکن سر ہنری نیو بولٹ (Newbolt) کا کہنا ہے، جس کے نام یہ کتاب معنون کی گئی ہے کہ "یہ کسی سمجھ میں نہ آنے والی (perplexing) اور مرنے مارنے پر تل جانے والی (desperate) مہم کا کسی نوجوان افسر کے دل و دماغ اور اعصاب پر کیا اثر ہوتا ہے، اس کا بیان ہے۔ کسی جنگ میں فوجیوں کو جس جسمانی اور ذہنی اذیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور جس کے لیے ہماری نسل نے shell-shock کی ترکیب وضع کر لی ہے، یقینی طور پر فکشن میں یہ اس کی اولین ہمدردانہ روداد ہے۔"

یہ سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں مگر راقم الحروف بڑے ادب سے گزارش کرے گا کہ تاثیر صاحب نے اپنے واجب الاحترام استاد کو مالی منفعت پہنچانے کی خاطر پنجاب کے انٹر کے طلبا کو یہ کتاب پڑھنے پر مجبور کر کے کوئی قابلِ تحسین کام نہیں کیا تھا۔ آج کی بات چھوڑیں، انگریز کے زمانے کے انٹر کے کتنے طلبا ہوں گے جنھیں اس سات سالہ جنگ کا علم ہوگا یا وہ ناول کی تھیم (موضوع) سمجھ سکتے ہوں گے۔ اگر وہ Tom Brown's School Days، Three Men in a Boat، Goodbye Mr Chipps، Gulliver's Travels یا آر ایل سٹیونسن کا Treasure Island تجویز کر دیتے تو طلبا پر بڑا احسان کرتے۔

## 60

گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد موسیو پانساں منتقل ہو گئے، وہ شاید فرانس لوٹ گئے تھے۔ ان کی جگہ آفتاب احمد خاں ہمیں انگریزی پڑھانے پر مامور ہو گئے۔ آفتاب احمد خاں نے بعد میں غالب کے نقاد کی حیثیت سے بڑا نام کمایا۔ انھوں نے اپنی کتاب "با صحبتِ نازک خیالاں" میں محمد حسن عسکری کا نہایت خوبصورت اور

معلومات سے بھرپور خاکہ تحریر کیا تھا۔ وہ شاہدرہ میں رہا کرتے تھے اور بس پر کالج آیا کرتے تھے۔ جب تک وہ ہمیں پڑھاتے رہے ایک دن بھی وہ وقت پر کلاس میں پہنچ نہیں پا سکے تھے کیونکہ ان کی بس ہمیشہ ہی لیٹ ہو جایا کرتی تھی۔ وہ پڑھایا کم کرتے تھے اور غالب کی غزلیں زیادہ سنایا کرتے تھے۔ ''جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن / بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے'' میں نے سب سے پہلے انھی کی زبانی سنی تھی۔

## 61

قیام پاکستان کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں اساتذہ کی متعدد اسامیاں خالی ہو گئی تھیں، انھیں پُر کرنے کے لیے اسلامیہ کالج کے کئی ایک لیکچرر وہاں تعینات ہو گئے۔ ان میں آفتاب احمد خاں، ہمارے محبت پور کے لال محمد چاولہ [وہ ریاضی پڑھاتے تھے۔ گورنمنٹ کالج سے بطور صدر شعبہ ریٹائر ہوئے اور ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے انگریزی میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی] اور ہمارے انگریزی کے ایک اور استاد ملک محمد انور شامل تھے۔ جب میں گورنمنٹ کالج ساہی وال میں پڑھاتا تھا، وہ وہاں چار پانچ سال میرے پرنسپل رہے۔ وہ گینڈر رپورٹس والوں کے بہنوئی تھے۔ اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج دونوں جگہ انھیں Lady Clare کہا جاتا تھا [لیڈی کلیر ٹینی سن کی ایک نظم کا نام ہے۔ اسے انٹرنیٹ پر پڑھا جا سکتا ہے]۔ ملک محمد انور بہت مزے کے آدمی تھے۔ وہ بڑھ چڑھ کر بے نوشی کیا کرتے تھے۔ وہ خود ہی بتایا کرتے تھے کہ نشے کے عالم میں وہ گینڈر والوں کے تہہ خانے میں مرغا بن کر بانگ دیا اور ککڑوں کیا کرتے تھے۔ جب وہ گورنمنٹ کالج میں تھے، وہ کالج کی غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ سراج الدین پرنسپل تھے، انھوں نے اپنی خفیہ (Confidential) رپورٹ میں لکھا: "He takes interest in every activity of the college."۔ اگلے سال خواجہ منظور حسین پرنسپل بن گئے اور انھوں نے اسی بات کو یوں لکھا: "He has his finger in every pie." دونوں جملوں کا مطلب ایک ہی ہے مگر ایک میں تعریف کا جب کہ دوسرے میں ذم کا پہلو نکلتا ہے۔ ساہی وال میں اپنی پرنسپلی کے دوران میں انھوں نے کالج میں مسجد تعمیر کرائی تھی۔ چندوں سے مسجد تعمیر کرانا ایک بڑا کارنامہ تھا، اس سے ہوسٹل کے طلبا کو بڑی سہولت حاصل ہو گئی۔

آفتاب احمد خاں اور ملک محمد انور کے بعد دیگرے دونوں ہمیں شاعری پڑھاتے تھے، گولز گوچ کے ناول کی تدریس چودھری غلام علی کے سپرد تھی۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ وہ کیا اور کیسے پڑھاتے تھے مگر اتنا ضرور

یاد ہے کہ وہ آدمی بہت بھلے تھے۔ چند سال بعد اطلاع ملی کہ وہ برطانیہ کی کسی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر آئے ہیں اور پنجاب یونیورسٹی میں انگریزی پڑھا رہے ہیں۔ برطانیہ کی فضا انھیں کچھ ایسی راس آئی کہ وہ افسانہ نگار بھی بن گئے۔ محمد سلیم الرحمٰن کی رائے میں انھوں نے ایک دو بہت اچھے افسانے لکھے تھے۔ انھوں نے چند افسانے حلقۂ ارباب ذوق کے اجلاسوں میں سنائے تھے۔

ہمیں فزکس پڑھانے کے لیے جو استاد مقرر ہوئے، وہ بے حد فرض شناس تھے، عین وقت پر کلاس میں آتے تھے، آتے ہی اپنا لیکچر دیتا اور اس کی وضاحت تختہ سیاہ پر کرنا شروع کر دیتے۔ چاک کے مہین ذرات ان کے گاؤن پر گرتے اور اسے سفید بناتے رہتے مگر وہ اپنی دھن میں لگے رہتے۔ بدقسمتی سے ایک دن ان کی پتلون کے بٹن کھلے رہ گئے [اس زمانے میں پتلون کی فلائی میں زپ نہیں، بٹن لگائے جاتے تھے] اور ان کا آلہ، جو معلوم نہیں کیسے اکڑ گیا تھا، باہر جھانکیاں مارنے لگا۔ جب اس پر طلبا کی نظر پڑی، پہلے تو وہ سکتے میں آ گئے اور پھر بیک وقت کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ پروفیسر صاحب کی پہلے تو سمجھ میں ہی نہ آیا کہ ان کے شاگرد ہنس کیوں رہے ہیں، پھر اچانک ان کی نگاہ نیچے پہنچی، نرالا منظر دیکھ کر وہ اتنا بوکھلائے کہ کلاس چھوڑ کر بھاگ گئے اور پھر کبھی نظر نہ آئے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ کئی سال دیال سنگھ کالج کے پرنسپل رہے۔

اس زمانے کے اسلامیہ کالج کے نیلی ہوسٹل کی ایک خاص بات یہ تھی کہ ہمارے ڈی پی ای (directors of physical education) محمد اسلم اور ریاض احمد سردیاں ہوں یا گرمیاں، پانچ بجے صبح سویرے سیٹیاں بجاتے ہمارے ہوسٹل پہنچ جاتے۔ ہمیں چار و ناچار اٹھنا پڑتا کیونکہ انھوں نے ہمیں جسمانی کسرتیں کرانا ہوتی تھیں۔ اگر نہ اٹھتے تو اچھا خاصا جرمانہ ہو جاتا تھا۔ یہ اٹھک بیٹھک اتنی سخت ہوتی تھی کہ دسمبر جنوری کے مہینوں میں بھی ہمارے جسم پسینے سے شرابور ہو جاتے تھے۔

کالج میں ایک اختیاری (optional) مضمون بھی پڑھنا پڑتا تھا۔ میں نے عربی اور فارسی کے مقابلے میں اردو کو ترجیح دی تھی [اگرچہ بعد میں میری نیت بدل گئی اور میں نے امتحان فارسی ہی میں دیا]۔ ہمیں اردو پڑھانے کے لیے جو استاد مقرر ہوئے، وہ مشہور کرکٹ برادران وسیم راجا اور رمیز راجا کے والد راجا سلیم اختر تھے۔ اس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی اور اس کے کسی ملحقہ کالج میں نہ تو ایم اے اردو پڑھانے کا کوئی انتظام تھا اور نہ یونیورسٹی اس کا امتحان لیتی تھی۔ جن مسلمان طالب علموں کو اردو میں ایم اے کرنے کا شوق ہوتا تھا، وہ عموماً مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جایا کرتے تھے۔ راجا سلیم اختر بھی علی گڑھ ہی سے ڈگری لے کر آئے تھے۔ اختیاری مضمون ہونے کی وجہ سے اردو کی کلاس ہفتے میں ایک آدھ بار ہی ہوتی تھی اور ہم لوگ بھی اس کی کوئی خاص پروا نہیں کرتے تھے، کبھی چلے گئے اور کبھی غیر حاضر ہو گئے۔ راجا سلیم اختر بہت

دھیمے انداز میں بولا کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ پی سی ایس کا امتحان پاس کرنے کے بعد کہیں مجسٹریٹ تعینات ہو گئے۔

مسلمانوں کے دیگر تعلیمی اداروں کی طرح اسلامیہ کالج میں بھی اسلامیات پڑھانے کا انتظام تھا۔ اسے تب دینیات کہا جاتا تھا۔ ہمیں سکول میں جو بزرگ دینیات پڑھایا کرتے تھے، وہ کسی دینی مدرسے کے فارغ التحصیل تھے۔ معلوم نہیں انھیں عربی میں کتنی مہارت حاصل تھی مگر دعویٰ یہی کیا کرتے تھے کہ عربی ام اللسان [تمام زبانوں کی ماں] ہے۔ انھیں انگریزی کے غالباً دو چار لفظ ہی آتے تھے مگر اپنے دعوے کے ثبوت میں انگریزی کے لفظ blind کی مثال دیا کرتے تھے کہ یہ اصلاً عربی لفظ "بلا عین" تھا جو انگریزی تک پہنچتے پہنچتے blind ہو گیا۔ کالج میں دینیات پڑھانے کے لیے جو استاد مقرر ہوئے، ان کا اسم شریف علامہ علاؤ الدین صدیقی تھا۔ وہ بعد میں داؤ پیچ لڑا کر اور بڑوں بڑوں کو پچھاڑ کر پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بن گئے اور یہ وہ عہدہ تھا جسے سرتوڑ کوشش کے باوجود ڈاکٹر تاثیر حاصل نہیں کر سکے تھے۔ وہ افراتفری کا زمانہ تھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ انھوں نے کبھی ہماری کلاس لی ہو۔ البتہ وہ مقرر بہت زبردست تھے اور مہینے میں ایک بار ہال میں کالج کے سارے طلبا کے سامنے وعظ کہا کرتے تھے۔ ان کے کلاس میں نہ آنے پر ہمیں کوئی افسوس نہیں ہوتا تھا، مفت کی چھٹی مل جاتی تھی۔ پھر یونیورسٹی نے بھی اس کا کون سا امتحان لینا ہوتا تھا۔

دینیات میں ہمیں جو کتاب پڑھنے کے لیے کہا گیا، وہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی اسلام کے ارکان خمسہ کے متعلق تھی۔ مولانا مودودی اس زمانے میں ضلع گورداس پور کے ایک صحت افزا مقام پٹھان کوٹ میں جماعت اسلامی کا ڈول ڈالنے، دینی کتب تحریر کرنے اور تحریک پاکستان کی مخالفت کرنے میں مصروف تھے۔ تاہم اتنا تقریباً سب لوگ مانتے ہیں کہ ان کا طرز تحریر نہایت سلیس اور دل نشیں ہوتا تھا۔ ان کا ارکان خمسہ پر کتابچہ طلبا میں بہت مقبول تھا۔ ان کی فصیح و بلیغ زبان اور معقول دلائل دل پر بہت اثر کرتے تھے۔

انجمن حمایت اسلام، جو اسلامیہ کالج کو چلاتی تھی، کوئی امیر کبیر جماعت (body) نہیں تھی۔ اسے کالج کے اخراجات پورا کرنے کے لیے طلبا کی فیسوں، جو یہی کوئی دس بارہ روپے فی ماہ ہوتی تھیں، اور عوام الناس کے چندوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ اس زمانے میں تعلیم تجارتی (commercialized) جنس نہیں تھی، یہ وبا پاکستان بننے کے بعد نازل ہوئی۔ انجمن کے کارپرداز بچت کے نت نئے طریقے سوچتے رہتے تھے۔ گورنمنٹ کالجوں کے اساتذہ کلاسوں میں لیکچر بھی دیتے تھے اور تجربات (experiments) بھی خود ہی کراتے تھے۔ انجمن نے تجربات کرانے کے لیے علیحدہ سٹاف بھرتی کیا ہوا تھا۔ یہ لوگ

demonstrators کہلاتے تھے۔ یہ ایم ایس سی نہیں بلکہ محض گریجویٹ (بی ایس سی) ہوتے تھے، اس لیے لیکچراروں کے برعکس انھیں تنخواہیں بھی کم دینا پڑتی تھیں۔ ہمیں جو اصحاب فزکس کے تجربات کراتے تھے، ان میں ایک قدرے دبلے پتلے قوم قریشی تھے۔ وہ اس زمانے میں بھی خاصے خوش پوش، تیز طرار اور پھرتیلے ہوا کرتے تھے۔ میرے کالج چھوڑنے کے بعد معلوم نہیں وہ کہاں کہاں رہے اور کیا کیا کرتے رہے۔ پھر ایوب خاں کے زمانے میں خبر آئی کہ وہ نئے نویلے بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اور سیکنڈری ایجوکیشن کے، جسے یونیورسٹی کی جگہ انٹر اور میٹرک کے امتحانات منعقد کرانے کا فریضہ سونپا تھا، چیئرمین مقرر ہو گئے ہیں۔ معلوم نہیں ان کے پاس کیا چھومنتر تھا کہ وہ ایک دوسرے فوجی حکمران ضیاء الحق کے عہد میں پنجاب کے ایجوکیشن سیکرٹری تعینات ہو گئے۔

## 62

اسلامیہ کالج سے ریلوے سٹیشن کوئی خاص دور نہیں۔ ٹریفک کی اتنی بھرمار نہیں تھی، سڑکوں پر فٹ پاتھ بھی موجود تھے، چنانچہ زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں پیدل وہاں پہنچا جا سکتا تھا۔ سٹیشن کے عین سامنے ایک وسیع و عریض گول چکر ہے۔ ہونا تو اسے سرسبز چاہیے کیونکہ اس کے اندر سلیقے سے گھاس لگی ہوتی تھی مگر اس پر تب بھی اور اب بھی خوانچہ فروشوں اور ریڑھی بانوں کا قبضہ رہتا ہے۔ تب وہاں بعض خوانچہ فروش زمین پر بیٹھ کر دال روٹی فروخت کیا کرتے تھے اور ساتھ ساتھ صدا لگاتے جاتے تھے: "روٹی ایک پیسا، دال مفت"۔ صدا سن کر ایک سردار صاحب کی، جو نئے نئے لاہور پہنچے تھے، رال ٹپکی۔ وہ ایک خوانچہ فروش کے پاس پہنچے اور بڑے تحکم سے بولے: "آج سردار صاحب صرف دال پر گزارہ کریں گے، بھر دو آٹھ دس پیالے۔"
قیام پاکستان کے بعد اگرچہ روٹی کی قیمت بڑھنے لگی تھی مگر دال کافی عرصہ مفت بکتی رہی۔

سٹیشن کے قریب برے گنزا (Braganza) ہوٹل اور آسٹریلیشیا مسجد ساتھ ساتھ واقع تھی۔ برے گنزا غریب پرور ہوٹل تھا۔ اس میں عموماً درمیانے طبقے کے لوگ ٹھہرا کرتے تھے۔ آسٹریلیشیا مسجد خواجہ بشیر بخش نے بنوائی تھی۔ خواجہ بشیر بخش کے آباؤ اجداد کسی زمانے میں آسٹریلیا کے مغربی شہر پرتھ (Perth) میں آباد ہو گئے تھے۔ وہاں وہ بہت کامیاب کپڑے کے تاجر بن گئے تھے۔ انھوں نے پرتھ کی پہلی مسجد بھی تعمیر کرائی تھی۔ جنگ عظیم دوم کے آغاز سے کچھ عرصہ قبل وہ واپس ہندوستان لوٹ آئے تھے۔ برے گنزا ہوٹل کے قریب ایک قطعہ زمین خالی پڑا تھا۔ 1940 کی دہائی کے اوائل میں حکومت نے اسے نیلام کرنے کا

فیصلہ کرلیا۔ خواجہ بشیر بخش نے اپنے کارندے کو حکم دیا کہ یہ قطعہ زمین حاصل کرنا ہے خواہ اس کے لیے کتنی ہی رقم ادا کرنا پڑے۔ ہوا بھی یہی، بولی بہت اونچی اٹھ گئی اور بالآخر ان کے نام چھوٹ گئی۔ خواجہ بشیر بخش نے اس کے ایک حصے پر مسجد تعمیر کرائی اور آسٹریلیا اور ایشیا دونوں براعظموں کی رعایت سے اس کا نام آسٹریلیشیا مسجد رکھا۔ دوسرے حصے پر انھوں نے اپنے چند دوستوں کے تعاون سے آسٹریلیشیا بینک قائم کیا تا کہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ مسلمان بینکنگ اور انشورنس کے شعبوں کو بھی کامیابی سے چلا سکتے ہیں۔ جب ذوالفقار علی بھٹو نے قومیانے کی پالیسی اختیار کی تو یہ بینک بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ بھٹو کی حکومت نے اس کا نام بھی تبدیل کر دیا اور اسے الائیڈ (Allied) بینک بنا دیا۔

دو موریا پل سے نکل کر جو گرینڈ ٹرنک (GT) روڈ (جرنیلی سڑک) شاہدرہ کی طرف جاتی ہے، اس کے شروع میں ایک سینما ہاؤس ہوا کرتا تھا۔ اس کا نام ریوالی (Rivoli) سینما تھا۔ قیام پاکستان کے بعد میں نے دلیپ کمار اور منی کی فلم "داغ" یہیں دیکھی تھی اور طلعت محمود کے گانوں سے مسحور ہوا تھا۔ سینما کے ساتھ سبزیوں اور پھلوں کی پرانی منڈی تھی جسے تقسیم ہند کے بعد بادامی باغ منتقل کر دیا گیا۔ دو موریا پل سے مشرق کی طرف جانے والی جی ٹی روڈ پر ایک آبادی آتی ہے اس کا نام تیزاب احاطہ ہے۔ یہاں میرے کزن محمد بشیر رہتے تھے جو انجینئرنگ کالج میں پڑھتے تھے۔ کبھی میں انھیں ملنے چلا جایا کرتا تھا اور کبھی وہ مجھے ملنے میرے ہوسٹل آ جایا کرتے تھے۔ ایک روز وہ دن ڈھلے آئے اور بولے "آؤ تمھیں فلم دکھائیں۔" اگرچہ مجھے لاہور میں رہتے کچھ مہینے گزر چکے تھے مگر میں نے ابھی تک کسی سینما ہاؤس کا رخ نہیں کیا تھا۔ وہ مجھے کیپیٹل (Capitol) سینما لے گئے۔ وہاں محبوب خاں کی فلم "انمول گھڑی" چل رہی تھی۔ اس کی ہیروئن نور جہاں، سائیڈ ہیروئن ثریا اور ہیرو سریندر تھا۔ تینوں پائے کے گلوکار تھے اور انھوں نے اپنے اپنے گانے خود گائے تھے۔ البتہ ایک گانا "اڑن کھٹولے پہ اڑ جاؤں" شمشاد بیگم اور زہرہ بائی انبالے والی کا تھا۔ نور جہاں کا "آ جا میری برباد محبت"، "جواں ہے محبت حسیں ہے زمانہ"، "کیا مل گیا بھگوان"، "میرے بچپن کے ساتھی"، نور جہاں اور سریندر کا "آواز دے کہاں ہے"، ثریا کا "میں دل میں درد بسا لائی"، "سوچا تھا کیا، کیا ہو گیا"، "من لیتا ہے انگڑائی"، سریندر کا "اب کون ہے میرا" اور محمد رفیع کا "تیرا کھلونا ٹوٹا" آج بھی کانوں میں رس گھولتے محسوس ہوتے ہیں۔ یہ تمام گانے تنویر نقوی نے تحریر کیے تھے۔ ان میں شاعری اور نغمگی دونوں تھیں۔ اب تو فلمی شاعری بالکل بے ہنگم ہو گئی ہے۔ اس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو ایک بجے دوپہر فلمی گانے نشر کیا کرتا تھا اور ہوسٹل کا ریڈیو انھیں با آواز بلند سنایا کرتا تھا۔ یہ گانے اتنی بار سنے کہ کبھی نہ بھول سکے۔ تقسیم ہند کے بعد آل انڈیا ریڈیو اپنی اردو سروس میں "آواز دے کہاں ہے" کے نام

سے ایک ہفتہ وار پروگرام نشر کیا کرتا تھا جس میں فلمی گانوں کے ساتھ پاکستانی سامعین کے خطوط بھی پڑھ کر سنائے جاتے تھے۔ ''آواز دے کہاں ہے'' کا مقصد پاکستانیوں کو یاد کرانا ہوتا تھا کہ وہ سوچیں: ''اے متحدہ ہندوستان: تو کہاں رہ گیا'' اور آہیں بھریں۔

تیزاب احاطہ کے آگے سکوٹیشل کالج تھا اور اس کے بعد انجینئرنگ کالج۔ قیام پاکستان کے بعد دونوں کو یکجا کر کے یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی بنا دیا گیا۔

ان دنوں لاہور ریلوے سٹیشن بے حد مصروف رہتا تھا۔ یہاں سے دہلی، کالکا، بمبئی، کلکتہ وغیرہ کی جانب چلنے والی ریل گاڑیوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ ان کی تفصیل ریلوے ٹائم ٹیبل کے، جو چھ آنے میں فروخت ہوتا تھا، آمنے سامنے کے پورے دو صفحات پر آتی تھی۔ ان میں دو گاڑیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک تو فرنٹیئر میل (Frontier Mail) تھی اور دوسری بمبے ایکسپریس۔ فرنٹیئر میل پشاور سے چلتی تھی اور بمبئی پہنچتی تھی۔ یہ رات کے نو بجے لاہور پہنچتی تھی۔ اس میں عموماً کھاتے پیتے لوگ ہی سفر کیا کرتے تھے جن میں بڑی بڑی حسین و جمیل اور خوش پوش خواتین اور دوشیزائیں شامل ہوتی تھیں۔ یہ پلیٹ فارم نمبر 1 پر ٹھہرتی تھی۔ اسلامیہ کالج کے ہوسٹلوں کے طلباء اپنی آنکھیں سینکنے کے لیے ایک آنے کی پلیٹ فارم کی ٹکٹ خرید کر اس پلیٹ فارم پر اکثر گھومتے پھرتے رہتے تھے۔

دوسری ریل گاڑی بمبے ایکسپریس تھی۔ یہ لاہور سے بمبئی جاتی تھی۔ میں دنیا کے متعدد ملکوں میں گھوما پھرا ہوں اور میں نے وہاں کی ٹرینوں میں سفر کیا ہے مگر ایسی گاڑی کہیں نہیں دیکھی۔ میں نے جتنی مرتبہ بھی اس پر سفر کیا، اسے ہمیشہ تاریکی میں ڈوبا پایا، کسی بھی ڈبے میں کبھی کوئی روشنی دکھائی نہیں دی۔ یہ رات کے گیارہ بجے دلّی سے جالندھر پہنچتی تھی۔ میں اور میرے بعض دوست اس کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر اس میں اکثر مفت سفر کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ریل گاڑیاں انگریز کی ملکیت سمجھی جاتی تھیں اور ان میں بلا ٹکٹ سفر کرنا عین حب الوطنی کیونکہ اس سے مفروضہ طور پر انگریز کو مالی زک پہنچتی تھی۔ لاہور سٹیشن سے باہر نکلنا بھی بہت آسان تھا۔ سٹیشن میں داخل ہونے اور اس سے باہر نکلنے کے لیے سیڑھیوں کے قریب راستہ ہے۔ اس سے مغرب کی جانب چند قدم دور ایک چھوٹا دروازہ بھی ہے۔ یہ عموماً ہر وقت کھلا رہتا تھا اور اس کی نگرانی کے لیے ریلوے کا کوئی کارندہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ ہم اس میں سے بلا دھڑک باہر نکل جایا کرتے تھے۔ تاہم میں نے بہت جلد اس پر سفر کرنا چھوڑ دیا کیونکہ یہ بڑے کڈھب وقت (ungodly hour) پر لاہور پہنچا کرتی تھی اور پھر پوری نیند سے محروم رکھتی تھی۔

لاہور سے ایک اور راستے سے بھی ریل گاڑیاں دہلی جاتی تھیں۔ اس راستے پر گاڑیاں براستہ رائے ونڈ،

قصور، فیروز پور، بھٹنڈا اور ہانسی اپنی منزل مقصود پر پہنچتی تھیں۔ بھٹنڈا ضلع بہاول نگر کی سرحد کے قریب ریاست پٹیالہ میں واقع تھا اور غالباً نارتھ ویسٹرن ریلوے کا سب سے بڑا جنکشن تھا۔ بھٹنڈا اکثر مذاق کا نشانہ بنا رہتا تھا۔ ایک زمانہ تھا جب پنجاب یونیورسٹی کسی بھی سطح کے امیدواروں کو پرائیویٹ امتحان دینے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ جو لوگ سکولوں یا کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے ذرائع سے محروم ہوتے تھے مگر اپنی تعلیمی قابلیت (qualification) بہتر بنانے کے متمنی ہوتے تھے، ان کے لیے یونیورسٹی نے ایک راستہ نکال لیا تھا۔ یہ لوگ پہلے اردو میں ادیب، ادیب عالم اور ادیب فاضل، فارسی میں منشی، منشی عالم اور منشی فاضل یا عربی میں مولوی، مولوی عالم اور مولوی فاضل کے امتحانات پاس کرتے تھے [ہندی، سنسکرت اور گورمکھی میں بھی اس قسم کے امتحانات منعقد ہوتے تھے]۔ اس کے بعد انھیں بالترتیب میٹرک، ایف اے اور بی اے کے امتحانات میں بیٹھنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ اس قسم کے امیدواروں کو صرف انگریزی کا امتحان دینا پڑتا تھا مگر انھیں سند پوری مل جاتی تھی۔ باقاعدہ تعلیم یافتہ لوگوں کو ان لوگوں کی علمی قابلیت پر شک ہوتا تھا اور ان کے متعلق اکثر ازرہِ مذاق کہا کرتے تھے: "بیچارہ کیا کرے، براستہ (via) بھٹنڈا پاس آں۔" وغیرہ۔ اب بھارت نے بھٹنڈہ میں تیل صاف کرنے کا بہت بڑا کارخانہ (refinery) قائم کر دیا ہے جس کا دھواں پاکستان کی فضا کو مسموم کرنے کے لیے مفت فراہم ہوتا ہے۔

جن لوگوں کو دہلی، بمبئی، کلکتہ وغیرہ جانا ہوتا، وہ عموماً براستہ امرتسر، جالندھر، انبالہ اور سہارن پور جانے والی ریل گاڑیوں پر ہی سفر کرتے تھے۔ دوسرے راستے پر زیادہ تر مسافر گاڑیاں چلتی تھیں، صرف ایک میل ٹرین اور ایک ہی ایکسپریس ٹرین تھی۔ 1941 میں میرے ایک بزرگ کے ساتھ ایک المناک واقعہ پیش آیا جس کا خمیازہ انھیں اپنی جان کا نذرانہ دے کر چکانا پڑا۔ میاں سمیع اللہ ایم اے بی ٹی تھے۔ بہت قابل، سمجھ دار اور دبنگ آدمی تھے۔ سرکاری ملازمت نہیں کرتے تھے، صرف اسلامیہ سکولوں میں ہیڈ ماسٹری کرتے تھے۔ لیکن ان کی طبیعت کو قرار نہیں تھا، آج یہاں تو کل وہاں۔ اسی چکر میں وہ اسلامیہ ہائی سکول جلال پور جٹاں کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔ پنجاب کا یہ علاقہ اپنی حسین و جمیل خواتین کے باعث بہت مشہور ہے۔ کہاوت ہے: "واتن بھلا ودی، رن گجراتی ودی۔" حالانکہ میاں سمیع اللہ پہلے سے شادی شدہ تھے اور چار بیٹیوں کے باپ تھے، وہ جلال پور جٹاں کی ایک کشمیری دوشیزہ کو دل دے بیٹھے۔ انھوں نے لڑکی کے والدین کی اجازت سے اس سے نکاح کر لیا۔ جیسا کہ ہمارے ہاں اکثر ہوتا ہے، خاندان کے بعض سرپھرے نوجوانوں نے اسے اپنی غیرت کا معاملہ بنا لیا اور انتقام کے لیے موقع کی تلاش میں رہے۔ پھر ایک روز انھیں یہ موقع مل گیا۔ میاں سمیع اللہ نے ایک کام کے سلسلے میں دہلی جانا تھا۔ انھوں نے سفر کے لیے بھٹنڈا

کا راستہ اختیار کیا۔ ان کے دشمنوں کو اس کی اطلاع مل گئی اور وہ بھی اسی گاڑی میں سوار ہو گئے جس کی فرسٹ کلاس میں میاں مسیح اللہ کی برتھ (berth) تھی۔ جب ان کی گاڑی قصور اور فیروز پور کے مابین شور وغل مچاتی دریائے ستلج کے پل پر پہنچی، انھوں نے میاں صاحب کے ڈبے کو دھکا دے کر کھولا، ان پر گولی چلائی اور ان کی لاش کو پتھر سے باندھ کر دریا میں پھینک دیا جو کبھی مل نہ سکی۔ سب کو معلوم تھا قاتل کون ہیں مگر عدم ثبوت کی بنا پر گرفتار کسی کو نہ کیا جا سکا۔ میاں صاحب کا آبائی گاؤں ہمارے گاؤں کے قریب تھا۔ اس کا نام راتوت تھا۔ ان کی نئی نویلی دلہن نے جلال پور جٹاں میں رہنے سے انکار کر دیا۔ وہ مرحوم شوہر کے آبائی گاؤں چلی آئی اور کبھی واپس نہ گئی۔ اس کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ اس کا نام احسان اللہ ہے۔ اس کی شادی میاں عبدالرب کی سب سے چھوٹی بیٹی طاہرہ سے ہوئی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد وہ انگلستان چلا گیا۔ گلوسٹر شائر کی بلدیہ میں خاصے بڑے عہدے پر فائز رہا۔ آج کل وہاں ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہا ہے۔

## 63

پھر ایک روز میری ملاقات مستقبل کے مظفر علی سید سے ہو گئی۔

سکول کے ایام میں مظفر اپنے آپ کو مظفر علی اثیر لکھا کرتا تھا۔ جیسا کہ میں اوپر تحریر کر چکا ہوں، وہ تھا امرتسر کا مگر نویں جماعت میں سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں داخل ہو گیا تھا اور اس کے دسویں کے نوماہی امتحان کے اردو، فارسی اور انگریزی کے پرچوں کے جوابات طلبا کے رسالے ''کتابستان'' میں شائع ہوئے تھے، جنھیں پڑھ کر ہم بہت مرعوب ہوئے تھے۔ بعض اوقات قدرت عجیب وغریب داؤ کھیل جاتی ہے۔ کہاں امرتسر کا رہنے والا، اس زمانے کے پنجاب کے بہترین سرکاری سکول میں پڑھنے والا، مختلف کتب خانوں تک رسائی رکھنے والا، طرح طرح کی کتابیں پڑھنے والا ذہین وفطین مظفر، کہاں ایک دور افتادہ گاؤں کا رہنے والا اور دیہاتی سکول میں پڑھنے والا مجھ جیسا طالب علم جو کبھی جالندھر بھی نہیں گیا تھا۔ مگر جب میٹرک کے امتحان کے نتیجے کا اعلان ہوا، اتفاق سے مجھے 850 میں 741 نمبر مل گئے۔ یونیورسٹی کے تمام طلبا میں میری پوزیشن پانچویں اور مسلمان طلبا میں پہلی تھی۔ مظفر علی سید کے حصے میں صرف 730 نمبر آئے تھے۔ چنانچہ 1946 میں جب اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہونے والے امیدواروں کی فہرست نوٹس بورڈ پر چسپاں ہوئی، لامحالہ میرا نام سب سے اوپر تھا۔ مظفر علی سید نے سوچا ہوگا: ''یہ کون شے ہے جو مجھ جیسے

لائق فائق شخص سے آگے نکل گئی ہے۔" وہ کلرکوں سے پوچھتا پچھاتا یہ معلوم کرنے میں آسانی سے کامیاب ہو گیا ہوگا کہ میرا رول نمبر کیا ہے، میں کس سیکشن میں پڑھتا ہوں اور میرے مضامین کیا ہیں، مگر وہ خود مجھ تک کیسے پہنچا، مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا۔ ہو سکتا ہے جب میری کوئی کلاس ختم ہوئی ہو، اس نے میرے کسی ہم جماعت کو پکڑا ہو اور اس کے ذریعے مجھ سے ملنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔

بہر حال یہ ملاقات ہوگئی اور اس نے میری زندگی کا پورا ڈھانچا تبدیل کر دیا۔ میں سائنس وائنس چھوڑ کر ادب کے چکر میں پڑ گیا۔

## 64

1946 کے عام انتخابات میں پنجاب میں مسلم لیگ سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اگرچہ 175 ارکان پر مشتمل ایوان میں اس کے اپنے ارکان کی تعداد صرف 73 ہے مگر اسے پانچ آزاد اور دس دیگر ارکان کی حمایت حاصل ہے، یوں اسے اکثریت حاصل ہو جاتی ہے، اس لیے حکومت سازی کی دعوت اسے دی جائے مگر گورنر سر ایوان میری ڈیتھ جنکنز (Sir Evan Meredith Jenkins) کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور اس نے سر خضر حیات ٹوانہ کو دوبارہ وزارت بنانے کی دعوت دے دی۔ اگرچہ یونینسٹ پارٹی کے صرف 20 ارکان منتخب ہو سکے تھے مگر مسلم لیگ کو ناکام بنانے کے لیے آل انڈیا کانگرس کے 51 اور اکالی دل کے 22 ارکان نے اس کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ ہوا کا رخ اور گورنر کے تیور دیکھ کر چند آزاد ارکان بھی اس کے ساتھ جا ملے اور یوں اسے معمولی اکثریت حاصل ہو گئی۔ جن وزرا نے حلف اٹھایا، ان میں مظفر گڑھ کے میاں محمد ابراہیم برق بھی شامل تھے۔

مسلم لیگ اس صورت حال کو ٹھنڈے پیٹوں نہ برداشت کر سکی اور اس نے طویل المدت ایجی ٹیشن کا منصوبہ بنالیا۔ اس کے بڑے بڑے جلوس لاہور شہر کے مختلف حصوں سے نکلنے لگے۔ ایک جلوس سناتن دھرم کالج کے قریب سے گزر رہا تھا (آج کل اس کی عمارت میں ایم اے او کالج قائم ہے) کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تصادم ہو گیا۔ طرفین نے ایک دوسرے پر اینٹیں روڑے اور پتھر پھینکے۔ 23 مارچ 1946 کو کیبنٹ مشن سندھ کے مرکزی شہر کراچی وارد ہوا۔ اس کو کام کا موقع دینے کے لیے قائداعظم اور مسلم لیگ نے ایجی ٹیشن کو معرض التوا میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا، تاہم خضر حیات کی حکومت سے نجات حاصل کرنے کے لیے جنوری 1947 میں دوبارہ ایجی ٹیشن شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ تحریک 36 دن جاری رہی۔ صوبائی حکومت اتنی زچ

ہوئی کہ آخرکار مستعفی ہونے پر مجبور ہو گئی۔

تحریک کے دوران میں اکثر مسلم لیگ کے جلسے موچی گیٹ کے باہر ہوتے رہے۔ ان میں نواب افتخار حسین ممدوٹ، میاں ممتاز دولتانہ، میاں افتخار الدین، بیگم شاہنواز، سردار شوکت حیات، بیگم تصدق حسین خالد [ تصدق حسین خالد اردو میں آزاد نظم لکھتے تھے مگر ان کی بیگم ان سے کہیں زیادہ مشہور تھی ] اور بعض دیگر صوبائی رہنما بڑی پرجوش تقریریں کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں پنجاب کی صوبائی اسمبلی میں خواتین کی علیحدہ نشستیں نہیں ہوتی تھیں۔ یہ اعزاز صرف لاہور کے حصے میں آیا کہ یہاں کی دو خواتین اسمبلی رکن بنی تھیں۔ ان میں ایک تو بیگم تصدق حسین خالد تھیں، دوسری کا نام باجی رشیدہ تھا، انھیں کون منتخب کرتا تھا، مجھے معلوم نہیں۔ ان جلسوں میں حاضرین اتنی زیادہ تعداد میں شامل ہوتے تھے کہ کہیں کھڑے ہونے کے لیے بھی جگہ نہیں ملتی تھی۔ جلسوں کی رونق بڑھانے کے لیے اسلامیہ کالج کے طلبا بھی بڑے ذوق وشوق کے ساتھ کثیر تعداد میں شامل ہوتے تھے۔

جلسوں کے علاوہ ہر روز بڑے بڑے جلوس بھی نکالے جاتے تھے۔ ان میں گلے پھاڑ پھاڑ کر بڑی قوت سے ''لے کے رہیں گے پاکستان'' کے نعرے لگائے جاتے تھے۔ ایک روز ایک جلوس، جو پنجاب سول سیکرٹریٹ کے سامنے سے گزر رہا تھا، میں شامل ایک خاتون اس کے بند گیٹ پر چڑھ گئی اور پیشتر اس کے کہ وہاں معمور حفاظتی عملہ کوئی اقدام کر سکتا، وہ لپک کر چھت پر پہنچ گئی اور اس نے وہاں مسلم لیگ کا جھنڈا لہرا دیا۔ یہ خاتون کون تھی، اس کے بارے میں متعدد عورتیں دعویٰ کرتی رہیں کہ وہ میں تھی مگر وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آخر وہ کون تھی۔

حکومت پنجاب نے اس تحریک کے متعلق خبریں شائع کرنے پر صوبے کے تمام اخبارات پر پابندی لگا دی تھی۔ ایک اخبار نویس میاں محمد شفیع عرف م ش نے اس پابندی کا توڑ کرنے کے لیے ایک عجیب وغریب ترکیب نکالی۔ وہ ادھر ادھر سے خبریں اکٹھا کرتے، انھیں ٹائپ کرتے اور ریلوے سٹیشن پر پہنچ جاتے۔ وہاں وہ دہلی جانے والی کسی ٹرین کے کسی بھلے مسافر کو پکڑتے، اس کے ہاتھ میں ڈاک کا ٹکٹ لگا لفافہ پکڑاتے اور اسے تاکید کرتے کہ اگر ہو سکے، وہ اسے دہلی میں روزنامہ ڈان کے دفتر میں پہنچا دے ورنہ سپرد ڈاک کر دے۔ اخبار شہ سرخیوں کے ساتھ خبر چھاپ دیتا کیونکہ دہلی پنجاب حکومت کے دائرہ اختیار سے باہر تھی۔ اگلے روز جب اخبار صوبے کے مختلف شہروں میں پہنچتا، پنجاب حکومت پیچ وتاب کھا کر رہ جاتی۔ آخر اس کے مخبروں نے اطلاع دی کہ ڈان میں خبریں چھپوانے والا میاں محمد شفیع ہے۔ حکومت نے انھیں پکڑا اور ملتان جیل میں بند کر دیا جہاں سے انھیں قیام پاکستان کے بعد رہائی ملی۔

چونکہ ایجی ٹیشن میں اسلامیہ کالج کے طلبا بڑے ولولے اور جوش و خروش سے حصہ لے رہے تھے، حکومت ان کے خلاف سخت جھنجھلائی ہوئی تھی۔ اس کی ہدایت پر ایک روز پولیس نے اس کے دونوں ہوسٹلوں پر چھاپا مارا اور اس نے وہاں موجود تمام طلبا کو گرفتار کر لیا۔ اتفاق سے میں چند اشیا خریدنے انارکلی بازار گیا ہوا تھا اور یوں گرفتاری اور "شہیدوں" میں شامل ہونے سے بچ گیا۔ جو طلبا پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تھے، انھیں ٹرکوں میں بھرا گیا اور چھانگا مانگا کے جنگل میں چھوڑ دیا گیا۔ اتنے میں سورج غروب ہو چکا اور اندھیرا چھا چکا تھا، چنانچہ ان طلبا کو واپس آنے میں بڑی کٹھنائیاں اٹھانا پڑیں۔ اس زمانے میں ملتان کی طرف بسیں اور ریل گاڑیاں نہ ہونے کے برابر چلا کرتی تھیں۔ یوں آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں، انھیں واپس آنے کے لیے کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ ان میں بیشتر بھوکے پیاسے اور گرتے پڑتے کہیں اگلے روز واپس پہنچ سکے۔

پولیس نے ہوسٹلوں کے طلبا ہی کو نہیں، بلکہ کالج کے ہردل عزیز پرنسپل ملک عمر حیات کو بھی گرفتار کر لیا اور انھیں کوسوں دور گورداس پور کی جیل میں نظر بند کر دیا۔ ملک عمر حیات کیمبرج یونیورسٹی سے ریاضی کی ڈگری لے کر آئے تھے۔ پہلے وہ اسلامیہ کالج پشاور سے منسلک رہے اور پھر اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل تعینات ہو گئے۔ چھ فٹ لانبے اور قدرے بھاری تن و توش کے مالک ملک صاحب ایک زمانے میں بوکسنگ (مکے بازی) بھی کرتے رہے تھے۔ ایک مقابلے میں حریف کا مکا ان کی ناک پر پڑا اور یوں وہ قدرے پچک گئی تھی۔ وہ قواعد کی سختی سے پابندی کرانے والے پرنسپل تھے مگر اس کے باوجود وہ طلبا میں بے حد مقبول تھے۔ اپنی خدمات کی وجہ سے پہلے وہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی، پھر پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے، تین ساڑھے تین سال پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور آخر میں انڈونیشیا میں پاکستان کے اولین سفیر مقرر ہوئے۔

جب پولیس نے انھیں گورداس پور کی جیل میں مقید کر دیا، ان کی رہائی کے لیے اس زمانے کی لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس میاں عبدالرشید کی عدالت میں رٹ داخل کر دی گئی۔ میاں صاحب کا تعلق باغبان پورہ کے مشہور و معروف ارائیں خاندان سے تھا۔ اس خاندان کے دیگر سرکردہ ارکان میں سر محمد شفیع، ان کی صاحبزادی بیگم جہاں آرا شاہنواز، فیصل چوک پر واقع شاہ دین بلڈنگ کے مالک اور ادبی رسالے ہمایوں کے ایڈیٹر میاں بشیر احمد کے والد گرامی جسٹس شاہ دین [جن کا شعر اٹھو ورنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی / دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا، ہمایوں کے سرورق پر چھپتا رہا] میاں افتخار الدین، اور خواجہ منظور حسین کے سسر پروفیسر ایم ایم شریف وغیرہ شامل تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ پاکستان کے

پہلے چیف جسٹس مقرر ہوئے۔ ان کا ایک بہت بڑا وصف یہ تھا کہ وہ نہ ملازمت کے دوران میں اور نہ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد کبھی مجلسی محفلوں میں شریک ہوئے۔ یوں ان کا دامن ہر قسم کی آلائشوں سے پاک رہا۔

میاں عبدالرشید نے پرنسپل عمر حیات ملک کے مقدمے کی سماعت کی اور حکومت کی توقعات کے برعکس انھوں نے انھیں رہا کرنے کا حکم دے دیا۔ رہائی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے کالج میں پھیل گئی۔ بے شمار طلبا گراؤنڈ میں اکٹھے ہو گئے۔ سب نے متفقہ فیصلہ کیا کہ ملک صاحب کو اپنی جلو میں گورداس پور سے لاہور لانا چاہیے۔ چنانچہ ہم سب سٹیشن پر پہنچ گئے اور وہاں جانے والی پہلی گاڑی پر بلاٹکٹ سوار ہو گئے۔ گاڑی میں اتنی بھیڑ ہو گئی کہ ڈبوں میں جگہ نہ ملنے پر بعض طلبا چھتوں پر چڑھ گئے۔ گورداس پور پہنچنے میں ہمیں کتنا وقت لگا۔ مجھے کچھ یاد نہیں تاہم ہم پہنچ وقت پر گئے۔ ادھر ملک صاحب کی رہائی کی سرکاری کارروائی ختم ہوئی، ادھر ہمارا قافلہ وہاں جا دھمکا۔ گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگاتے بصد ادب ملک صاحب کو ان کے ڈبے میں بٹھایا اور خود بھی دوبارہ بلاٹکٹ گاڑی کے اندر اور اوپر سوار ہو گئے۔ ہم سارا رستہ ''ملک عمر حیات زندہ باد''، ''پاکستان زندہ باد''، ''لے کر رہیں گے پاکستان''، ''پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ'' کے نعرے اتنے زور زور سے لگاتے رہے کہ ہمارے گلے بیٹھ گئے۔ [آخری نعرہ اصغر سودائی کی ایک نظم کا ایک مصرع تھا۔ اصغر سودائی کوئی جہاں دیدہ اور منجھا ہوا شاعر نہیں تھا بلکہ ہماری طرح کا ایک طالب علم تھا۔ وہ ہمارے ہی ساتھ ہوسٹل میں رہتا تھا۔ مجھ سے دو سال سینئر تھا۔ ان کی نظم کا یہ مصرع تحریک پاکستان کے دوران میں بے حد مقبول ہوا مگر اب پاکستان کے گلے کی پھانس بن گیا ہے۔ رجعت پسند اس کا سہارا لے کر پاکستان کو قرون وسطیٰ میں دھکیلنا چاہتے ہیں۔]

جب عمر حیات ٹوانہ پنجاب کی وزارت عظمیٰ سے مستعفی ہوئے، صوبے کی فرقہ وارانہ فضا بے حد کشیدہ ہو گئی۔ سکھوں کی جماعت اکالی دل کا رہنما ماسٹر تارا سنگھ تو اتنا برافروختہ ہوا کہ اس نے پنجاب اسمبلی کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی کرپان لہرائی اور پاکستان کا مطالبہ کرنے والوں کو سخت برا بھلا کہا۔ ماسٹر تارا سنگھ اصلاً سکھ نہیں تھے۔ اس زمانے میں ہندوؤں میں ایک عجیب رواج یہ تھا کہ ان کے بعض گھرانے اپنے کسی لڑکے کو سکھ مت میں داخل کرا دیتے تھے تاکہ سکھوں پر بھی ان کا اثر و رسوخ برقرار رہے۔ ماسٹر تارا سنگھ بھی اسی قسم کے سکھ تھے اور شاید اندر سے ہندوؤں کے ایجنٹ۔ [اس قسم کے سکھوں کو خاندانی سکھ بہ نگاہ تحقیر دیکھتے تھے اور انھیں عموماً ''بھاپے'' کہتے تھے۔] اگر وہ اکالی دل کے کرتا دھرتا نہ بنتے تو عین ممکن ہے کہ مسلمانوں اور سکھوں میں کوئی معاہدہ ہو جاتا کیونکہ سکھوں کے ایک اور سرکردہ رہنما گیانی کرتار سنگھ اور مہاراجہ پٹیالہ مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتا کرنے کے حق میں تھے۔ اگر اس قسم کا کوئی سمجھوتا ہو جاتا تو نہ

پنجاب تقسیم ہوتا اور نہ وہ قتل و غارت جو 1947 میں اس کا مقدر بنا۔ مگر ماسٹر تارا سنگھ نے ایک نہ سنی۔ وہ نیم تر بچے تھے اور ساتھ ہی عام سکھ بھی۔ چنانچہ فساد تو ہونا ہی تھا۔

## 65

اپریل 1947 میں جب بہار کی چھٹیاں ہوئیں، میں ایک بار پھر دلی چلا گیا۔ اس زمانے میں دلی یونیورسٹی سے ملحق سکولوں میں میٹرک کی بجائے ہائر سیکنڈری سکول کی پڑھائی ہوتی تھی۔ اس کے امتحان میں بیٹھنے کے لیے سکول میں دس کی بجائے گیارہ سال پڑھنا پڑتا تھا۔ امتحان پاس کرنے کے بعد جب طلبا کسی کالج میں داخل ہوتے تھے، تو تین سال کی تعلیم پانے کے بعد وہ بی اے کا امتحان دے سکتے تھے۔ یوں پنجاب کے برعکس وہاں انٹرمیڈیٹ کی کلاسیں نہیں ہوتی تھیں۔ اس سال ان ہائر سیکنڈری کلاسوں کے لیے یونیورسٹی نے خطیر وظائف کا اعلان کیا۔ ان وظائف کے حصول کے لیے تمام ہندوستان کے طلبا یونیورسٹی کے زیر اہتمام ایک خصوصی امتحان میں بیٹھ سکتے تھے۔ میں نے بھی قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا۔ ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس بہانے ایک بار پھر دلی کی سیر ہو جائے گی۔ بھائی جان پہلے ہی وہاں موجود تھے، اس لیے رہائش کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں نے بڑے چاؤ سے امتحان دیا۔ اس کا نتیجہ اڑھائی تین ماہ بعد مجھے اپنے گاؤں میں موصول ہونا تھا کیونکہ میں نے اپنا پتا وہیں کا دیا تھا۔ دریں اثنا تقسیم کے نتیجے میں سارے صوبے میں افراتفری پھیل گئی اور قتل و غارت کا بازار شروع ہو گیا۔ ہمیں مجبوراً اپنے گھروں کو چھوڑنا اور نکودر کیمپ میں پناہ لینا پڑی۔ یوں مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ میں یونیورسٹی کے معیار پر پورا اترا تھا یا نہیں۔ اگر مجھے یہ وظیفہ مل جاتا، میں مزید پڑھائی کے لیے لازماً لاہور چھوڑ کر دلی چلا جاتا اور تقسیم کے بعد بھی شاید وہیں مقیم رہتا۔

اس مرتبہ دلی کے قیام کے دوران میں برصغیر کی دو عظیم ترین ہستیوں — مہاتما گاندھی اور قائد اعظم محمد علی جناح — کو دیکھنے اور ان کے خیالات سننے کا نادر موقع دستیاب ہو گیا۔ یوں گاندھی جی کا مستقل قیام سابرمتی آشرم میں ہوتا تھا۔ ان کا یہ آشرم، جسے ہریجن آشرم یا ستیاگرہ آشرم بھی کہا جاتا تھا، ان کے آبائی شہر اور گجرات کے صدر مقام احمد آباد کے ٹاؤن ہال سے چار میل دور ایک نواحی قصبے سابرمتی میں دریائے سابرمتی کے کنارے پر واقع تھا۔ یہیں بیٹھ کر وہ سیاسی تحریکیں چلاتے اور برطانوی حکومت سے اپنے مطالبات منوانے کے لیے لمبے لمبے برت رکھا کرتے تھے۔ چونکہ اپنی حکومت مخالف سرگرمیوں کی وجہ سے انھیں

بار بار جیل یاترا کرنا پڑتی تھی، اس لیے یہ آشرم اکثر ویران رہتا تھا اور وہ اتنا زچ ہوئے کہ 22 جولائی 1933 کو انھوں نے اسے مستقلاً بند کرنے کا فیصلہ کرلیا مگر ان کے مداحین آڑے آئے اور انھوں نے اسے جوں کا توں برقرار رکھا۔

1947 میں ہندوستان کی متوقع آزادی کے پیش نظر وہ تقریباً مستقلاً اپنے دہلی آشرم میں قیام پذیر ہو گئے۔ یہاں وہ تقریباً ہر روز اپنے مداحین کو، جو کثیر تعداد میں جمع ہو جایا کرتے تھے، اپنے درشن دیا کرتے، کھلے عام پرارتھنا کیا کرتے اور بھاشن دیا کرتے تھے۔ انھیں وقت کا بہت پاس رہتا تھا۔ ایک مرتبہ خود انھوں نے کہا تھا: ''اگر مجھے اپنی پرارتھنا کے لیے ایک منٹ کی بھی تاخیر ہو جائے، مجھے سخت ناگوار گزرتا ہے۔'' اس معاملے میں وہ ڈپٹی نذیر احمد کے مقلد معلوم ہوتے تھے جو شام جب سیر کو نکلتے تھے تو بقول مرزا فرحت اللہ بیگ لوگ انھیں دیکھ کر اپنی گھڑیاں درست کیا کرتے تھے۔

میں نے ان کے متعلق پڑھا بھی اور سنا بھی تھا کہ وہ دو نوخیز دوشیزاؤں کو دائیں بائیں اپنی بغلوں میں دبائے یا ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھے اپنے آشرم سے برآمد ہوتے تھے۔ وہ رات کو سوتے بھی ان کے ساتھ ہی تھے۔ اس موقع پر وہ خود بھی برہنہ ہوتے تھے اور وہ بھی۔ اپنے دعوی کے مطابق وہ یہ کام اس لیے کرتے تھے کیونکہ وہ اپنے ضبط کا امتحان لینا چاہتے تھے آیا وہ اپنے vital fluid (حیات آفریں سیال) کو ضائع ہونے سے بچا سکتے ہیں یا نہیں۔ وہ اپنے nocturnal emission (احتلام/سبن دوش) کو ہندوستانی معاشرے کے ایک بڑے مسئلے سے منسلک کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ پنڈت جواہر لال نہرو نے جنس کے متعلق ان کے فرمودات (pronouncements) کو "abnormal" (خلاف معمول) اور غیر فطری (unnatural) قرار دیا تھا اور کہا تھا: ''اس قسم کی باتوں کا نتیجہ محض جنسی ناآسودگی (frustration)، جذباتی مدافعت (inhibition)، اعصابی دباؤ اور ہر قسم کے جذباتی اور اعصابی عوارض کی صورت میں نکلتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ جنس کے معاملے میں انھیں اتنا خبط (obsession) کیوں ہو گیا تھا۔'' تاہم خود نہرو کو مختلف عورتوں کے ساتھ جسمانی تعلقات استوار کرنے میں کبھی کوئی عار محسوس نہیں ہوا تھا۔ ان کی اہلیہ کملا تپ دق کی مریضہ تھیں اور عین عالم شباب میں انتقال کر گئی تھیں۔ نہرو نے دوسری شادی تو نہ کی مگر کھل کر وہ خوب کھیلے۔ آزادی کے بعد ان کے پہلے سیکرٹری ڈیسائی نے ایک کتاب لکھی جس میں اس نے انکشاف کیا کہ پنڈت نہرو کا ایک عورت کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا جسے انھوں نے own کرنے کی بجائے جنوبی بھارت کے ایک آشرم کی تحویل میں دے دیا۔ معلوم نہیں بعد میں اس بیچارے کا کیا بنا۔

جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کا وائسرائے اور گورنر جنرل مقرر ہوا، پنڈت نہرو نے اس کی

اہلیہ کو بھی شیشے میں اتار لیا اور وائسرائے کی ناک تلے اس کے ساتھ ہم بستری کرتے رہے۔ ان تعلقات کا نتیجہ پاکستان کو مختلف صورتوں میں بھگتنا پڑا۔ روزنامہ ''ڈان'' کے کالم نگار عرفان حسن کے 20 جنوری 2014 کے کالم میں بتایا گیا ہے کہ لندن کی نواحی بستی ہیمپ سٹیڈ (Hampstead) کے تھیٹر میں تقسیم ہند کے بارے میں ایک ڈراما دکھایا جا رہا ہے جس میں لیڈی ایڈوینا (Edwina) ماؤنٹ بیٹن کی اس حیرت انگیز دھمکی کا انکشاف کیا گیا ہے کہ اگر سرل ریڈکلف پر دباؤ نہ ڈالا گیا اور فیروز پور اور فاضلکا کی تحصیلیں [جن میں مسلمانوں کی خاصی بڑی اکثریت تھی] بھارت کو نہ دی گئیں تو وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر واپس انگلستان چلی جائے گی۔ یوں ایک عورت کی مہربانی سے پاکستان نہ صرف ضلع گورداس پور سے محروم ہوا بلکہ اسے فیروز پور اور فاضلکا کی تحصیلوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ یہی نہیں اس سے بھارت کو کشمیر پر قبضہ مستحکم کرنے اور راوی، بیاس اور ستلج کا پانی راجستھان پہنچانے میں بھی آسان راستہ مل گیا۔

حال ہی میں نیویارک ٹائمز کے ایک سابق ایڈیٹر جوزف Lely veld (لیلی فلڈ) کی گاندھی جی کے بارے میں کتاب "Great Soul: Mahatma Gandhi and His Struggle for India" شائع ہوئی ہے جس میں یہ بے تکا الزام لگایا گیا ہے کہ مہاتما گاندھی gay [ہم جنس: عام فہم الفاظ میں لونڈے باز] تھے۔ لیلی فلڈ کے مطابق جب برہنہ مہاتما گاندھی برہنہ دوشیزاؤں کے ساتھ ہوتے تھے، انھیں ہوشیاری اس لیے نہیں آتی تھی کیونکہ ان کا حقیقی عشق جنوبی افریقہ کے ایک جرمن یہودی ماہر تعمیرات اور تن ساز (body builder) ہرمن کالن باخ (Hermann Kalenbach) کے ساتھ تھا جس کی خاطر انھوں نے 1908 میں اپنی دھرم پتنی کے ساتھ صحبت کرنا چھوڑ دیا تھا۔ انھوں نے ایک مرتبہ کالن باخ کو لکھا تھا: ''تمھاری تصویر ہر وقت میرے پلنگ کے سامنے مینٹل پیس پر رکھی رہتی ہے۔'' ایک اور خط میں انھوں نے تحریر کیا: ''تم نے میرے شریر کو بری طرح اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ یہ بدترین قسم کی غلامی ہے...''

وہ کالن باخ کو ''ایوان زیریں'' (Lower House) اور خود کو ''ایوان بالا'' (Upper House) کہتے تھے اور انھوں نے ایوان زیریں کو قول دینے پر مجبور کر دیا کہ وہ کبھی کسی عورت پر پُرشہوت نگاہیں نہیں ڈالے گا۔'' بھارتی حکومت نے ان خطوط کو پردۂ اخفا میں رکھنے کے لیے 2013 میں تیرہ لاکھ ڈالر میں خرید لیا تھا۔ (بحوالہ ''پاکستان ٹوڈے'' 3 فروری 2013)۔

لیلی فلڈ نے اپنے دعوے کے حق میں ایک اور دلیل یہ دی ہے کہ وہ اپنے خطوط کے آخر میں اپنے دستخطوں کے اوپر "yours sinly" لکھا کرتے تھے تاہم یہاں اس سے چوک ہوگئی۔ sinly کا گناہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اصلاً sincerely کا مخفف ہے اور اس زمانے میں عام استعمال ہوتا تھا۔ یوں اس کے

دعوے کے غبارے سے کافی حد تک ہوا نکل جاتی ہے۔

اپنی تمام تر idiosyncrasies (بوالعجبیوں) اور abnormalities کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایک انتہائی عظیم انسان تھے اور انھوں نے اپنے قول وفعل سے دنیا کے بے شمار لوگوں کو متاثر کیا تھا۔ اسی لیے جب ان کے قتل پر محمد علی جناح نے اپنے تعزیتی پیغام میں انھیں صرف ہندوؤں کا عظیم رہنما کہا تھا، مجھے سخت افسوس ہوا تھا۔ تاہم ان کے متعلق ایک دو باتیں یادرکھنے کی یہ ہیں کہ ان کے اپنے بقول ''میں جبلی طور پر مکمل ہندو'' ہوں۔ انھوں نے اپنے انگریزی رسالے ''ینگ انڈیا'' کی 25 ستمبر 1924 کی اشاعت میں لکھا تھا! ''میں جبلی طور پر مکمل ہندو ہوں۔'' پھر ایک لحاظ سے وہ قدرے منافق تھے۔ وہ ہم سے پرچار تو ہمیشہ آہنسا (non-violence) کا کرتے تھے اور اس پر عموماً عمل بھی کرتے تھے، مگر ضرورت پڑنے پر اقرار کیے بغیر ہنسا کے (violence) کے واقعات سے آنکھیں پھیر لیتے تھے جیسا کہ انھوں نے 1937 میں کانگریسی وزرا کے مستعفی ہونے پر جو پرتشدد واقعات پیش آئے تھے، ان کے متعلق کیا تھا۔

گاندھی جی نے اپنی پرارتھنا کے دوران میں اپنے بھاشن میں کیا فرمایا تھا، مجھے کچھ یاد نہیں، تاہم میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے اس عظیم انسان کے درشن کرنے اور ان کا بھاشن سننے کا موقع مل گیا۔

اپنے دہلی کے اس قیام کے دوران میں جس دوسرے عظیم شخص کو دیکھنے اور ان کی تقریر سننے کا موقع ملا، وہ قائداعظم محمد علی جناح تھے۔ ان دنوں دہلی کے اینگلو عربیک کالج [اب اس کا نام ذاکر حسین کالج ہے] کے لان میں مسلم لیگ کے مرکزی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کا مشترکہ اجلاس (کنونشن) ہو رہا تھا تاکہ ہندوستان کی متوقع آزادی اور تقسیم کے بارے میں کوئی لائحہ عمل طے کیا جا سکے۔ مارچ 1940 میں لاہور کے منٹو پارک میں مسلم لیگ کونسل کا جو اجلاس ہوا تھا اور اس میں جو قرارداد منظور ہوئی تھی، اس میں اگرچہ لفظ ''پاکستان'' استعمال نہیں ہوا تھا [اسے بعد میں اپنایا گیا]، مسلمانوں کے لیے الگ وطن کا مطالبہ ضرور کیا گیا تھا مگر کسی فروگزاشت کی وجہ سے اس میں لفظ state کی جگہ states استعمال ہو گیا۔ اس سے بعض لوگوں کو اشتباہ ہوا کہ شاید مسلم لیگ ایک کی بجائے ایک سے زیادہ مملکتوں کا مطالبہ کر رہی ہے۔ اس غلطی کو درست کرنے کے لیے متفقہ طور پر نئی قرارداد منظور کی گئی۔ تاہم بعض لوگ تب بھی کہتے تھے اور اب بھی کہتے ہیں کہ اس کنونشن کو اس قسم کی ترمیم کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا کیونکہ اصل قرارداد آل انڈیا مسلم لیگ کی جنرل کونسل نے منظور کی تھی اور صرف وہی اس میں ترمیم وتنسیخ کی مجاز تھی۔

مسلم لیگ کی اس کنونشن کے اختتام پر کالج ہی کے احاطے میں جلسہ عام کے انعقاد کا اعلان ہوا۔ میں، بھائی جان اور ان کے چند دوست قائداعظم اور دیگر رہنماؤں کی تقریریں سننے وقت مقررہ پر جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ اس زمانے میں سیاسی جلسوں میں جانے اور رہنماؤں کی تقریریں سننے کا شوق بھی تو بہت ہوتا تھا۔ تقریریں تو وہی تھیں جو مسلم لیگی عموماً کیا کرتے تھے مگر مجھ جیسے لوگ اسی بات پر خوش تھے کہ بڑے بڑے "رہنماؤں" کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے کانوں سے سننے کا موقع مل گیا۔

ایک دن گھومتے گھماتے میں جامع مسجد کے قریب اردو بازار پہنچ گیا۔ وہاں سے میں نے چند کتابیں خریدیں۔ چونکہ ہمارے علاقے کے، مسلمانوں کی بھاری اکثریت کے باوجود، پاکستان میں شامل کیے جانے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا [روزنامہ "ڈان" دہلی نے اپنے ایک اداریے میں اسے پاکستان میں شامل کرنے کی پرزور وکالت کی تھی] اور ہمارا خیال تھا کہ تقسیم کے بعد ہمیں بھارت ہی میں رہنا پڑے گا اور بھارت کی سرکاری زبان ہندی ہوگی، اس لیے میں نے سوچا کہ مجھے ہندی بھی سیکھ لینا چاہیے۔ اتفاق سے مجھے ایک کتاب مل گئی جس میں اردو کی وساطت سے ہندی سکھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں نے جھٹ پٹ وہ کتاب خرید لی مگر ملک کے حالات اتنی تیزی سے بدل رہے تھے کہ مجھے اس کتاب کا دل جمعی سے مطالعہ کرنے کا کوئی موقع نہ ملا۔

میں نے جو دوسری کتابیں خریدیں، ان میں ایک عزیز احمد کا اردو شاعری کا انتخاب تھا۔ کتاب خاصی ضخیم تھی مگر غیر مجلد تھی۔ اس کے ناشر انجمن ترقی اردو ہند نے اسے چھاپا بہت خوبصورت انداز سے تھا۔ باقی نظمیں یا غزلیں کیا تھیں، مجھے کچھ یاد نہیں مگر ایک نظم مولانا ظفر علی خاں کی تھی جس کا آخری مصرع مجھے کبھی بھول نہ سکا۔ مولانا ظفر علی خاں بڑے پائے کے شاعر تھے مگر چونکہ وہ زیادہ تر وقتی موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے رہتے تھے، اس لیے ان کی شاعری زیادہ تر فراموش کر دی گئی ہے۔ وہ بعض اوقات below the belt ہٹ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ عزیز احمد نے اپنے انتخاب میں جو نظم شامل کی [مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر انھوں نے اسی نظم کو کیوں منتخب کیا تھا] اس کا عنوان "چو" کی لفظی تحقیق تھا۔ "چو" پنجابی کا ذومعنی لفظ ہے۔ وہ آبے میں اسے "ندی" کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ [اسے "تھمیں" بھی کہا جاتا تھا۔] اردو اور پنجابی دونوں میں اس کا دوسرا مفہوم "ٹپکنا/رسنا" بھی ہے اور فیلن نے تو اس کے معنی "ماہواری/حیض آنا" بھی بتائے ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے اپنی نظم کی تان اس مصرع پر توڑی ہے "جمی فارسی میں جو ہندی میں چو گئی۔" لیجیے صاحب، "چو" کی لفظی تحقیق مکمل ہو گئی۔

دلی میں میں نے ایک اور کتاب جو خریدی، اس کا عنوان "فاسقانہ کلام" تھا۔ اس کے مصنف

مولانا حسرت موہانی تھے۔ مولانا حسرت موہانی صحیح معنوں میں درویش صفت آدمی تھے۔ وہ بڑے پائے کے شاعر تھے اور سیاسی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے جس کی پاداش میں انھیں اکثر قید و بند کی تکالیف برداشت کرنا پڑتی تھیں۔ ان کے نتیجے میں انھوں نے ایک غزل لکھی جس کے مطلع سے ہر کہ و مہ واقف ہے: ہے مشق سخن جاری، چکی کی مشقت بھی / اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی۔ وہ جب عشقیہ شاعری کرتے تھے تو اپنے حساب سے خاصی بے باک غزلیں کہتے تھے، انھیں وہ "فاسقانہ کلام" کہتے تھے۔ ان کی یہ غزل تو تقریباً ہر غزل خواں گلوکار گا چکا اور گلوکارہ گا چکی ہے: چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے / ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے۔

اس قسم کے چند مزید اشعار دیکھیں:

چھیڑتی ہے مجھے بے باکیٔ خواہش کیا کیا — جب کبھی ہاتھ وہ پابند حنا ہوتے ہیں

تو نے حسرت کی عیاں تہذیب رسم عاشقی — اس سے پہلے اعتبار شان رسوائی نہ تھا

توڑ کر عہد کرم ناآشنا ہو جائیے — بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے

کچھ محو تصور تھا میں اس درجہ کہ حسرت — مجھ کو نہ ہوئی یار کے آنے کی خبر

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا — کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

میرے آنسوؤں نے بجھائی تھی میری تشنگی — اسی برگزیدہ سحاب میں مجھے دیکھنا

اور اس شعر کا حوالہ تو عام دیا جاتا ہے مگر شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ بھی حسرت موہانی ہی کا ہے۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد — جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

بعض دیگر اشعار بھی ایسے ہیں جن کا حوالہ تو بہت لوگ دیتے ہیں مگر بہت کم کو معلوم ہے کہ ان کے مصنف کون تھے:

بھانپ ہی لیں گے اشارہ سر محفل جو کیا — تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

مادھو رام جوہر

آخر گِل اپنی صرف درِ میکدہ ہوئی — پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

جہاں دار شاہ

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک تن درستی ہزار نعمت ہے
قربان علی سالک

مجھ میں اور ان میں سبب کیا جو لڑائی ہوگی یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی
محمد امان نثار

حسرت موہانی ایک زمانے میں ادبی رسالہ "اردوئے معلی" بھی نکالتے رہے تھے۔ سنا ہے کہ انھوں نے "دیوان غالب" کی شرح بھی لکھی تھی۔

## 66

اپریل کی چھٹیاں ختم ہو گئیں اور میں واپس لاہور چلا آیا۔ شہر کی فضا بے حد کشیدہ ہو چکی تھی۔ مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے مابین، جو صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھے رہتے چلے آ رہے تھے اور جن کے مابین انگریزوں کی آمد سے قبل کبھی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا تھا، تعلقات میں دراڑ آ گئی اور یہ دراڑ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ ہم لوگوں پر کس قدر خوف طاری تھا، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ میں انارکلی کی طرف جا رہا تھا، راستے میں نِسبت روڈ پڑتی ہے۔ اس پر ہندوؤں کا ایک ریستوران واقع تھا۔ میرے دل میں یونہی خیال آیا کہ آج اس میں دال بھات کھانا چاہیے۔ میں ریستوران میں داخل تو ہو گیا مگر بیٹھتے ہی واپس چلا آیا کیونکہ میرے دل پر یہ خوف طاری ہونے لگا تھا کہ اگر کسی بیرے کو علم ہو گیا کہ ان کے ریستوران میں ایک "مُسلا" آ گھسا اور ان کے بھانڈے برتن "بھرشٹ" کر رہا ہے، پھر معلوم نہیں وہ میرا کیا حال کریں۔

عبدالعزیز خالد ریواز ہوسٹل میں رہا کرتا تھا۔ شہر کی کشیدہ فضا کے باوجود اس کے کمرے میں ہماری اکثر محفلیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ یہیں میری ملاقات سجاد رضوی سے ہوئی اور تا حیات دوستی کا روپ دھار گئی۔ وہ خالص لاہوریا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر وہ مختلف جگہوں پر ملازمتیں کرتا رہا جن میں صحافت بھی شامل تھی۔ پھر ایک روز وہ لبنان چلا گیا۔ خود وہ اہل تشیع تھا مگر بیروت میں اسے عشق ایک سنی دوشیزہ سے ہو گیا۔ دونوں نے آپس میں شادی کر لی اور دھیرے دھیرے اس نے اپنی دلہن کو بھی شیعیت میں داخل کر لیا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ نومسلموں کی طرح اس کی "نوشیعہ" رفیقۂ حیات عام شیعوں کی نسبت کہیں کٹر

شیعہ ہے۔ اس نے اس کے بطن سے ڈھیر سارے بچے پیدا کیے۔ خود وہ ناشتہ عموماً پاک ٹی ہاؤس میں کیا کرتا تھا اور جواز یہ پیش کرتا تھا کہ ''کم بخت سب کچھ چٹ کر جاتے ہیں، میرے لیے کچھ بھی تو نہیں چھوڑتے۔'' تقریباً دس سال بیروت میں قیام کی وجہ سے اس کی عربی بہت نکھر گئی۔ اس کا فائدہ مجھے بھی پہنچا۔ میں نے جب محمد سلیم الرحمٰن کے ایما پر ایڈورڈ سعید کی معرکہ انگیز کتاب ''فلسطین کا مسئلہ'' کا ترجمہ شروع کیا، مشرق وسطیٰ کے متعدد مقامات اور اشخاص کے ناموں کی اردو میں صحیح منتقلی (transliteration) میں وہی میرے کام آیا۔ لبنان سے واپسی کے بعد وہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ میں ملازم ہو گیا تھا۔ چونکہ وہ شیعیت کا بہت اچھا عالم اور اس پر مستزاد اچھا خاصا مقرر بھی تھا، ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ذاکر بن گیا۔ بھکر اور لیہ جیسے دور دراز مقامات سے بھی اسے مجلسیں پڑھنے کی دعوتیں ملتی رہتی تھیں۔ تاہم ''ذاکریت'' اسے راس نہ آئی اور وہ بہت جلد خالق حقیقی سے جا ملا۔

## 67

گرمیوں کی چھٹیاں آ گئیں۔ فرقہ وارانہ کشیدگی کی وجہ سے تعطیلات معمول سے بہت پہلے مئی ہی میں ہو گئی تھیں۔ لمبی چھٹیوں کے دوران میں اسلامیہ کالج کے طلبا کو لائبریری سے چار کتابیں نکلوانے کی اجازت ہوتی تھی۔ میں نے جو کتابیں منتخب کیں، ان میں ایک مولانا ظفر علی خاں کی ''معرکۂ مذہب و سائنس'' تھی۔ یہ دراصل کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ تھا۔ جب میں کتابیں اٹھا کر کاؤنٹر پر پہنچا، لائبریرین احمد شجاع نے یہ کتاب مجھے جاری کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ فرمایا: ''یہ تمھاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔'' ویسے احمد شجاع بہت بھلے اور نفیس آدمی تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ امریکن سنٹر میں چیف لائبریرین بن گئے تھے۔ لاہور کے اکثر ادیب کسی نہ کسی وقت ان کے دفتر میں بیٹھے پائے جاتے تھے۔ جب میں نے بھی وہاں جانا شروع کیا، میری بھی ان سے ملاقاتیں ہونے لگیں اور یوں ان کے ساتھ ایک قسم کی دوستی ہو گئی۔ وہ امریکا کی یاترا کر آئے تھے اور وہاں کے بڑے مزے دار قصے سنایا کرتے تھے۔

چھٹیاں ہو گئیں۔ میں اپنے گاؤں جانے کے لیے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ متحدہ ہندوستان میں یہ میرا ریل گاڑی کا آخری سفر تھا۔ کشیدہ فرقہ وارانہ فضا کی وجہ سے شہر میں ایک قسم کا سناٹا طاری رہتا تھا۔ اس کا اثر ریل گاڑیوں پر بھی پڑا تھا اور ان میں سوار لوگ آپس میں بہت کم بات کرتے تھے۔ دن کے وقت میل اور ایکسپریس ٹرینیں کم چلا کرتی تھیں۔ میں پسنجر گاڑی میں بیٹھا ہوا ہوں۔ گاڑی ڈھچک ڈھوں کی

رفتار سے چل رہی ہے۔ ڈبے کے اندر معمول سے کہیں کم مسافر سوار ہیں اور اس پر ایک قسم کی مُردنی چھائی ہوئی ہے۔ میرے سامنے ایک ہندو خاندان بیٹھا ہوا ہے اور دوپہر کا کھانا کھا رہا ہے۔ آلو کی بھجیا سے اشتہا آور خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی ہیں۔ نوجوان لڑکے کی ہتھیلیوں سمیت پوری انگلیاں دہی میں ڈوبی ہوئی ہیں اور وہ گردوپیش سے بے نیاز لپڑ لپڑ کھانا کھانے میں مصروف ہے۔ ڈبے میں جو چند ایک مسافر ہیں، وہ تصویر حیرت بنے اسے دیکھ رہے ہیں۔

میں گاؤں پہنچ گیا۔ چوک میں چودھری نیاز علی کا دو منزلہ مکان زیر تعمیر تھا۔ ان کے والد مدتوں پہلے بیوی اور بیٹے کو چھوڑ کر امریکا کی ریاست کیلی فورنیا کے صدر مقام سیکرامنٹو کے قریب مستقلاً آباد ہو چکے تھے لیکن وہ اپنے بیٹے کو اکثر اچھی خاصی رقوم بھیجتے رہتے تھے۔ چودھری نیاز علی نے ان رقوم سے گاؤں میں اچھی خاصی زمین خرید لی تھی۔ خود وہ پٹواری تھے اور گھوڑے پر نو دس میل دور گھوور کے قریب اپنے حلقے تک جایا کرتے تھے [پاکستان کے سابق چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے آباؤ اجداد اسی گاؤں کے رہنے والے تھے]۔ میرا ہم نام عبدالحمید چڑی سر ان کا ہمسایہ تھا۔ معلوم نہیں اس نے چودھری نیاز علی پر کیا جادو کیا کہ ادب کا ذوق نہ ہونے کے باوجود انھوں نے ایک چھوٹی سی لائبریری بنائی اور اس میں کرشن چندر، مہندر ناتھ، اپندر ناتھ اشک، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، شفیق الرحمٰن، کنہیا لال کپور، فیض احمد فیض جیسے اس زمانے کے جدید ادیبوں کی کتابیں بھر لیں۔ میری اور حمید چڑی سرے کی موج ہو گئی۔ فرصت ہی فرصت تھی۔ وہ اور میں سارا سارا دن وہاں بیٹھے اور ان کتابوں کو پڑھتے رہتے تھے اور وہیں شام کو ریڈیو پر منور سلطانہ اور سریندر کور کے گانے اور نظام دین اور سلطان کھوسٹ کا دیہاتی پروگرام سنا کرتے تھے۔ اس زمانے میں دیہاتوں میں ریڈیو اچھی خاصی عیاشی تھا۔ بجلی تو ہوتی نہیں تھی اور cells سے چلنے والے دستی ریڈیو سیٹ ابھی وجود میں نہیں آئے تھے۔ ریڈیو کو بسوں، ٹرکوں وغیرہ کی بیٹریوں سے چلانا پڑتا تھا اور آواز کو اونچا کرنے کے لیے بڑے بڑے بانسوں پر ایریل (aerials) لگانا پڑتے تھے۔ خدانخواستہ اگر کوئی خرابی نمودار ہو جاتی، کوسوں دور جالندھر لے جا کر درست کرانا پڑتی تھی۔ چنانچہ گاؤں کا واحد ریڈیو چودھری نیاز علی ہی کے پاس تھا۔ شام کو وہ ریڈیو اٹھا کر اپنے چوبارے میں لے جاتے تھے اور رات کو نو بجے جب خبروں کا وقت ہو جاتا تھا اس کی آواز اونچی کر دیتے تھے تاکہ ہم لوگوں تک بھی، جو ان کے مکان کے سامنے نیچے کھڑے ہوتے تھے پہنچ سکے۔ پندرہ منٹ انگریزی میں اور پھر پندرہ منٹ "ہندوستانی" میں خبریں سنائی جاتی تھیں۔ یہ ہندوستانی بھی خوب زبان تھی۔ اس میں اردو اور ہندی والوں دونوں کو خوش کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، چنانچہ وزیراعظم کو وزیراعظم نہیں بلکہ "بڑا وزیر" کہا جاتا تھا۔

آل انڈیا ریڈیو صرف اپنی خبریں ہی نہیں بلکہ ساڑھے نو بجے بی بی سی کی ورلڈ سروس کا بلیٹن بھی سناتا تھا، جو برطانیہ کے معیاری وقت کے مطابق شام چار بجے نشر ہوتا تھا۔ یہ خبریں جو انگریز سناتا تھا، اس کی آواز اتنی بلند آہنگ، پاٹ دار اور گھن گرج سے بھرپور ہوتی تھی کہ میرے جیسے دیہاتیوں کی بھی آسانی سے سمجھ میں آجاتی تھی۔ میں نے خود بی بی سی ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی ایسی آواز دوبارہ کبھی نہیں سنی۔

## 68

تقسیم ہند کے اعلان کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن دونوں ممالک کا گورنر جنرل بننے کا خواہش مند تھا مگر آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے اس کی اس خواہش کو پذیرائی بخشنے سے انکار کر دیا اور محمد علی جناح کو پاکستان کا گورنر جنرل نامزد کر دیا۔ مجھے ذاتی طور پر یہ فیصلہ کچھ پسند نہ آیا کیونکہ میں دیانت داری سے سمجھتا تھا کہ گاندھی جی کی طرح محمد علی جناح کی شخصیت اتنی بلند و بالا تھی کہ وہ عہدوں سے مستغنی تھی۔ بعد میں جو واقعات پیش آئے، ان کی روشنی میں میرا کچا پکا ردعمل قدرے درست ہی ثابت ہوا۔ پارلیمانی نظام حکومت میں صدر کی طرح گورنر جنرل کا عہدہ محض نمائشی ہوتا ہے [آسٹریلیا، کینیڈا اور نیوزی لینڈ آج بھی اس کی واضح مثالیں ہیں، عام لوگوں نے وہاں کے وزرائے اعظم کے نام تو سنے ہوں گے مگر گورنر جنرل؟ شاید ہی کوئی شخص بتا سکے کہ وہ کون ہے؟] اصل اختیارات وزیر اعظم کے پاس ہوتے ہیں اور صدر یا گورنر جنرل اس کے مشورے پر عمل کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ اگر انھیں گورنر جنرل بننے کا ہی شوق تھا، وہ بڑی آسانی سے متحدہ ہندوستان کے گورنر جنرل بن سکتے تھے۔ اس سے ملک تقسیم ہونے سے بچ جاتا، تقریباً ایک کروڑ لوگ اپنے آبائی گھر چھوڑنے پر مجبور نہ ہوتے، پچاس ہزار سے زائد عورتیں اغوا نہ ہوتیں، متروکہ املاک پر غیر مستحق لوگوں کی رالیں نہ ٹپکتیں، نو دولتیوں کا طبقہ وجود میں نہ آتا اور متعدد معاشرتی خرابیاں نمودار نہ ہوتیں۔

قائد اعظم کے گورنر جنرل بننے کا نتیجہ یہ نکلا کہ پارلیمانی نظام کی روایات کے برعکس وزیر اعظم کا عہدہ دب گیا اور گورنر جنرل کا عہدہ بہت بڑا ہو گیا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ بعد میں گورنر جنرل کی حیثیت سے پہلے ملک غلام محمد اور پھر سکندر مرزا وزرائے اعظم کو تگنی کا ناچ نچاتے رہے انھیں تنگ میں آ کر بس کرتے اور non-entities (بے حیثیت اور بے وقعت اشخاص) کو وزرائے اعظم مقرر کرتے رہے۔ انجام کار اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنرل ایوب خان، جو بے حد جاہ طلب (ambibous) شخص تھا، موقع مل گیا۔ اس نے اپنا تاج تک دیا اور ملک میں مارشل لا لگا دیا۔

قائداعظم ایوب خاں سے سخت ناراض تھے۔ تقسیم کے بعد جب آبادیوں کا انخلا عمل میں آ رہا تھا، ایوب خاں واہگہ بارڈر پر تعینات تھے، کہا جاتا ہے کہ وہ امیر کبیر ہندوؤں اور سکھوں کو ان کے مال اسباب سمیت سرحد پار کرا دیتے تھے۔ اس لیے قائداعظم نے ان کا تبادلہ مشرقی پاکستان کر دیا تھا۔ ادھر ان کی آنکھ بند ہوئی، ادھر وزیراعظم لیاقت علی نے انھیں کمانڈر انچیف مقرر کر دیا۔ کمانڈر انچیف کے عہدے کی آئینی مدت تین سال ہوتی تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے جانشین اس آئینی پابندی کی سختی سے پابندی کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کی بیٹی اندرا گاندھی نے جنرل مانک شا کو، جس کا بنگلہ دیش بنوانے میں زبردست کردار تھا، فیلڈ مارشل تو بنا دیا مگر اس کے عہدے کی مدت میں توسیع نہ کی اور یوں فوج کو سویلین حکومت پر تغلب حاصل کرنے کا کوئی موقع نہ دیا مگر لیاقت علی خاں اور اس کے جانشینوں نے اس اصول کی دھجیاں اڑا دیں اور ایوب خاں کو توسیع پر توسیع دیتے رہے۔

لیاقت علی جیسے ''لولے'' شخص کو وزیراعظم بنانے کا فیصلہ اچھا ثابت نہ ہوا۔ اردو اخبارات انھیں ''قائد ملت'' کے خطاب سے نوازتے رہتے ہیں۔ پتا نہیں، کس خوشی میں؟ آپ ان کا کوئی ایک کارنامہ بھی تو بتا دیں جس کی وجہ سے وہ اس خطاب کے مستحق ٹھہرتے ہوں۔ اس کے برعکس پاکستان میں جتنی بھی خرابیاں نمودار ہوئیں، ان کا آغاز ان کی ''ذات مبارک'' سے ہوتا ہے۔ بھارت نے 1949 ہی میں اپنا آئین مرتب کر لیا تھا اور اس کے تحت 1950 میں پہلے انتخابات بھی کرا لیے، یوں ملک جمہوری راستے پر چل پڑا۔ لیاقت علی خاں نے آئین بنانے کا نام تک نہ لیا۔ البتہ قرارداد پاکستان ضرور منظور کرائی جو آج تک پاکستان کے گلے کی پھانسی بنی ہوئی ہے۔ جب پنجاب میں وزیراعلیٰ نواب افتخار حسین ممدوٹ کے خلاف میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ نے علم بغاوت بلند کیا، لیاقت علی خاں نے دولتانہ کا ساتھ دیا، صوبائی وزارت اور اسمبلی برخواست کی اور صوبے میں نئے انتخابات کرائے۔ ان انتخابات میں سرکاری پارٹی نے وہ دھاندلی بلکہ دھاندلا کیا کہ اس زمانے کے اخبارات چیخ پڑے۔ وہ اس دھاندلی کو ''جھرلو'' کہتے تھے۔ ''جھرلو'' کی یہ روایت اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ ملک میں آج تک جتنے بھی انتخابات ہوئے ہیں، ان میں سے کسی کو بھی اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا، یہاں تک کہ یحییٰ خاں کے زمانے کو بھی نہیں جن کی اتنی تعریف کی جاتی ہے۔ بھارت اپنا آئین بنانے اور انتخابات منعقد کرانے کے بعد بین الاقوامی سطح پر اپنے آپ کو متعارف کرانے اور اپنا وقار بڑھانے میں مصروف ہو گیا (جس کے نتیجے میں وہ کشمیر پر اقوام متحدہ کی قراردادیں پاؤں تلے روندنے میں کامیاب ہو گیا)، مگر لیاقت علی خاں اسے محض ''مکا'' دکھاتے اور جذباتی قوم کو گمراہ کرتے رہے۔ وہ یہ مکا کس زعم میں دکھاتے تھے، میں تو آج تک سمجھ نہیں پایا۔ اگر کوریا

کی جنگ نہ چھڑتی اور روئی کے نرخ آسمان کو نہ چھوتے، ملک کبھی کا دیوالیہ ہو چکا ہوتا۔ جب یہ چھپّر پھاڑ کر ملنے والی دولت کا سلسلہ ختم ہو گیا، ملک کا معاشی طور پر قائم رہنا مشکل سے مشکل تر ہوتا گیا اور پاکستان کو امریکا کی گود میں بیٹھنا پڑ گیا۔

پاکستان میں لیاقت علی خاں کا کوئی حلقہ انتخاب نہیں تھا۔ جب تقسیم کے نتیجے میں مہاجرین کی جوق در جوق پاکستان میں آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا، صوبائی وزیر بحالیات میاں افتخار الدین نے کابینہ کے ایک اجلاس میں تجویز پیش کی کہ ان مہاجرین کو ضلع وار آباد کر دینا چاہیے تاکہ ان کے آپس میں رابطے قائم رہ سکیں اور ان کے دکھوں کا کچھ مداوا ہو سکے تاہم "evil genius" میاں ممتاز دولتانہ نے، جن کا ذہن عیارانہ اور سوچ جاگیردارانہ تھی، اس تجویز کی شد و مد سے مخالفت کی۔ ان کا استدلال تھا کہ چند ایک مستثنیات کو چھوڑ کر مشرقی پنجاب کے بیشتر لوگوں کا تعلق درمیانے یا نچلے درمیانے طبقے سے ہے۔ اگر پاکستان میں بھی یہ لوگ اکٹھا ہو گئے پھر ہمیں [وڈیروں اور جاگیرداروں کو] ووٹ کون دے گا، ہمارا تو کباڑا ہو جائے گا۔ دولتانہ کے موقف کا نتیجہ یہ نکلا کہ پنجاب میں جاگیرداری پر ضرب لگانے کا جو موقع پیدا ہوا تھا، وہ ضائع ہو گیا اور مہاجرین کی اکثریت کچھ اس طور ایک دوسرے سے بچھڑ گئی کہ انھیں اب بھی اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب سے رابطہ قائم کرنے میں سخت دشواری پیش آ رہی ہے۔

اگر لیاقت علی خاں دور اندیش ہوتے، وہ میاں افتخار الدین کے موقف کی تائید کرتے، یوں ان کے آبائی ضلع کرنال کے لوگ یک جا آباد ہو جاتے اور ان کے لیے محفوظ حلقہ انتخابات فراہم کر دیتے۔ مگر لیاقت علی خاں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی، وہ یو پی اور سی پی کے لوگوں کو شہ دیتے رہے کہ وہ آئیں اور کراچی میں آباد ہو جائیں۔ اس کا جو نتیجہ نکلا، وہ آپ کے سامنے ہے۔ سندھی اپنے بڑے شہروں کراچی اور حیدرآباد سے محروم ہو گئے، ان کی معاشی شہ رگ کٹ گئی اور ان کے اور مہاجرین کے مابین مستقل خلیج حائل ہو گئی۔

لیاقت علی خاں اپنے مخالفین کو قطعاً برداشت نہیں کرتے تھے۔ اگر خود قائداعظم ذرا فراخ پسند ہوتے اور ذاتی پسند اور ناپسند کو بیچ میں نہ لاتے، وہ لیاقت علی خاں کی جگہ حسین شہید سہروردی کو وزیراعظم بنوا دیتے۔ اس سے ملک کی اکثریتی آبادی بنگالیوں کی تالیف قلب ہو جاتی اور شیخ مجیب الرحمٰن کو چھ نکات کا پاکھنڈ کھڑا کرنے کا موقع نہ ملتا۔ چونکہ لیاقت علی خاں اپنا اصل حریف سہروردی کو گردانتے اور انھیں سخت ناپسند کرتے تھے، اس لیے انھیں ان کا وجود قطعاً گوارا نہیں تھا۔ ایک مرتبہ تو انھوں نے مرکزی اسمبلی میں انھیں "کتا" تک کہنے سے گریز نہ کیا۔ یہ اخلاق سے اتنی گری ہوئی بات تھی کہ بنگالیوں میں نفرت تو پیدا

ہونا ہی تھی۔

لیاقت علی خاں کی ایک تعریف یہ کی جاتی تھی بلکہ بعض لوگ اب بھی کرتے ہیں کہ انھیں اقتصادی امور کی بڑی سوجھ بوجھ تھی حالانکہ انھیں اقتصادیات کی ابجد کا بھی علم نہیں تھا۔ انھوں نے 1946 میں متحدہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں جو بجٹ پیش کیا تھا جسے ''غریبوں کا بجٹ'' کہا گیا تھا کیونکہ اس میں سمندری پانی سے نمک بنانے پر محصول ختم کر دیا گیا تھا اور سرمایہ داروں پر ٹیکس بڑھا دیے گئے تھے، اس کو ان کی اقتصادی سوجھ بوجھ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ جو لوگ اس قسم کا دعویٰ کرتے رہتے ہیں انھیں یا تو اصل صورت حال کا علم ہی نہیں یا وہ تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ ان کے سر اس بجٹ کا پیش کرنے کا محض سہرا ہی بندھتا ہے جب کہ اسے بنایا چودھری محمد علی نے تھا جس کے نتیجے میں خوش ہو کر آل انڈیا سروس ( آئی سی ایس ) کے جفادری اور گھاگ بیورو کریٹس [ افسر شاہی کے بے لوچ کارندے ] کو نظر انداز کر کے قائداعظم نے انھیں پاکستان کا سیکرٹری جنرل مقرر کیا تھا۔

## 69

پاکستان کا وجود چودہ اگست کو عمل میں آیا۔ اس روز متحدہ ہندوستان کے آخری گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کراچی آئے اور انھوں نے مرکزی اسمبلی میں نئی مملکت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ پاکستانی اس بات پر بڑی ڈوں کی لیتے ہیں کہ انھیں بھارت سے ایک روز قبل آزادی ملی تھی۔ اصلاً اس کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو اگر بھارت پہلے آزاد ہو جاتا تو ماؤنٹ بیٹن وہاں کے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھال لیتے اور اس حیثیت میں وہ قانونی اور آئینی طور پر پاکستان کو اقتدار منتقل نہیں کر سکتے تھے۔ دوسرے بھارت کے جوتشیوں کی متفقہ رائے تھی کہ آزاد بھارت کے لیے شبھ گھڑی چودہ نہیں پندرہ اگست ہے۔ پاکستان کے متعلق پیش گوئی کی گئی چودہ اگست کو پاکستان کو بھی اپنا قیام راس نہیں آئے گا، یہاں ہمیشہ بے اطمینانی کا غلبہ رہے گا، شورشیں اور ہنگامے بپا ہوتے رہیں گے۔ اس بات کے باوجود کہ ایک زمانے میں میں حافظ شیرازی کے دیوان سے فال نکالا کرتا تھا، مجھے ذاتی طور پر نجوموں، جوتشیوں اور فال گیروں پر کوئی خاص اعتقاد نہیں، تاہم اس حقیقت سے بھی اغماض نہیں برتا جا سکتا کہ پاکستان اور بھارت کے متعلق جو پیش گوئیاں ہوئی تھیں، وہ کافی حد تک صحیح ہی ثابت ہوئی ہیں۔

سترہ اگست کو باؤنڈری کمشن کے فیصلے کا اعلان ہوا۔ جہاں تک انگریزوں کے اپنے ملک کی عدالتوں

کا تعلق ہے، وہ آزادانہ کام کرتی ہیں اور کسی کے دباؤ میں نہیں آتیں۔ اس لیے جنگ عظیم دوم کے دوران میں جب ہٹلر کے جنگی طیارے لندن کے بعض حصوں کی اینٹ سے اینٹ بجا رہے تھے، وزیر اعظم چرچل نے پوچھا: "کیا ہماری عدالتیں کام کر رہی ہیں؟" جواب اثبات میں ملا تو اس نے کہا: "ہمیں کوئی شکست نہیں دے سکتا۔" مگر یہی انگریز جب برصغیر میں آتے تھے، اگرچہ وہ اپنے بنائے ہوئے قوانین کی پابندی خود بھی کرتے تھے اور دوسروں سے بھی کراتے تھے [اسی لیے وہ یہاں محض چھ ہزار سول اور فوجی ملازمین کی مدد سے دو سو سال حکومت کر گئے] مگر جب ضرورت پیش آتی، وہ ڈنڈی مارنے سے بھی باز نہیں آتے تھے۔ 1857 کی تحریک آزادی کو کچلنے کے بعد انھوں نے مغل شہزادوں اور دہلی کے عمائدین سے جو سلوک کیا کہ کسی قسم کی رسمی کارروائی کے بغیر ہی بے شمار لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور رولٹ ایکٹ جیسا سفاکانہ قانون نافذ کیا، وہ اس کی واضح مثالیں ہیں۔ پھر انھوں نے جلیانوالہ باغ کے معصوم لوگوں کو جس سفاکی سے قتل کیا، وہ پنجاب کے لوگ آج تک فراموش نہیں کر سکے۔

قائداعظم آئین پسند آدمی تھے۔ انھوں نے انگریز کے بنائے ہوئے قوانین کی بھی خلاف ورزی نہیں کی تھی اور نہ کبھی کسی غیر آئینی یا غیر قانونی سرگرمی میں حصہ لیا تھا۔ ان کا ایمان تھا کہ انگریز قانون کو باقی ہر چیز پر فوقیت دیتے ہیں، اس لیے بھارت اور پاکستان کے درمیان وہ حد بندی قائم کرتے وقت ڈنڈی نہیں ماریں گے اور انصاف کے تمام تقاضوں کو پیش نظر رکھیں گے۔

نئی سرحدوں کا تعین کرنے کے لیے باؤنڈری کمشن کے قیام کا اعلان ہوا۔ اس کے پانچ ارکان میں دو مقامی مسلم اور دو غیر مسلم جج تھے اور ایک انگریز وکیل سر سرل ریڈکلف اس کا سربراہ بنا۔ وہی جج تو محض برائے بیت تھے کیونکہ ان کی آرا ایک دوسرے سے قطعی متضاد تھیں، یوں حتمی فیصلے کا اختیار ریڈکلف کو مل گیا۔ تقسیم کے لیے جو قواعد متعین ہوئے، ان کی رو سے ایک دوسرے سے ملحق (contiguous) مسلم علاقے پاکستان کو اور غیر مسلم علاقے بھارت کو ملنا تھے۔ اس اصول کی رو سے ضلع جالندھر کی تحصیلیں جالندھر اور نکودر، ریاست کپورتھلہ، ضلع فیروز پور کی تحصیلیں فیروز پور اور فاضلکا، ضلع امرتسر کی تحصیل اجنالہ، جو ضلع لاہور کو ضلع گورداس پور سے ملاتی تھی، ضلع گورداس پور کی تحصیلیں گورداس پور، بٹالہ اور شکر گڑھ پاکستان کے حصے میں آنا چاہیے تھیں مگر شکر گڑھ کی تحصیل کو چھوڑ کر کیونکہ یہ دریائے راوی کے پار واقع تھی، باقی تمام علاقے زبردستی اور بڑی ڈھٹائی کے ساتھ بھارت کو بخش دیے گئے۔ یہی نہیں بلکہ تحصیل قصور کے دو تھانے بھی اس کے حوالے کر دیے گئے تاکہ امرتسر اور ترن تارن کا براہ راست رابطہ قائم ہو سکے۔ اس کے برعکس ایک گاؤں تک، جس میں غیر مسلموں کی اکثریت تھی، پاکستان کے حصے میں نہ آیا۔ قانون کے ساتھ انگریز

کی وابستگی بیچ چوراہے پھوٹ گئی۔ انگریز نے دیدہ دلیری سے یہ ناانصافی کیوں کی، اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ وہ پاکستان اور بھارت کے مابین مستقل عناد کے بیج بونا اور چپقلش قائم کرنا چاہتا تھا جیسے وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر برصغیر پر حکومت کرتا تھا۔ اس کی ایک مثال بابری مسجد ہے۔ اس کا شوشا ایک انگریز ڈسٹرکٹ جج نے چھوڑا تھا کہ جس جگہ یہ مسجد تعمیر ہوئی تھی، اس میں راجہ رام چندر پیدا ہوئے تھے۔ راجہ رام چندر کوئی تاریخی کردار تھا بھی یا نہیں، اس کے بارے میں بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے، مگر انگریز کو اس سے کیا، اس نے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانا تھا، اور اس میں کامیاب رہا، ورنہ کوئی سوچ بھی سکتا ہے کہ بابر جیسا صلح کل اور موسیقی شخص [بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست] جس نے زندگی میں شاید کبھی نماز بھی نہیں پڑھی ہوگی اپنا نچ کل دے گا اور ہندوؤں کا مندر گرا کر وہاں مسجد کھڑی کر دے گا۔

گورداس پور کو بھارت کے حوالے کرنے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اسے کشمیر پر قبضہ کرنے کا سنہری موقع ہاتھ آ گیا۔

باؤنڈری کمشن کے اعلان سے قبل ہی ہمیں قرائن سے اندازہ ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کی بھاری اکثریت کے باوجود ہمارا علاقہ پاکستان میں شامل نہیں ہو سکے گا اور ہم اپنے مقدر پر قانع ہو چکے تھے۔ کمشن کے فیصلے کا اعلان سترہ اگست کو ہوا، لیکن 19 اگست کو گاؤں کی دونوں مساجد سے اعلان ہوا کہ سب لوگ اپنا اپنا رخت سفر باندھ لیں کیونکہ ہمیں اپنے آبائی گھر چھوڑنے اور پاکستان کے لیے روانہ ہونا ہے ورنہ سکھ حملہ کر دیں گے اور ہمیں اپنی جانوں کے لالے پڑ جائیں گے۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ ہمارے ہوش و حواس اڑ گئے۔ غالباً یہ اعلان کسی حکومت نے نہیں کیا تھا کیونکہ آبادیوں کے انخلا کا لیاقت نہرو معاہدہ کہیں بہت بعد میں ہوا تھا۔ پھر لوگوں کو بھاگنے کی کیوں سوجھی، غالباً اس کی وجہ سکھوں کا ڈر تھا۔ ہم گھر بار چھوڑنے پر تیار تو ہو گئے، مگر عام خیال یہی تھا کہ چند دن بعد امن چین قائم ہو جائے گا اور ہم واپس آ جائیں گے چنانچہ ہم نے بعض اشیا مثلاً چینی مٹی کے برتن، جنھیں ہم ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے، اپنے چوہڑے پڑوسیوں کے ہاتھ بطور امانت رکھوا دیں اور خود بزعم خویش عارضی سفر پر روانہ ہو گئے۔

یوں تو بیٹ میں ساون بھادوں کے مہینوں میں اکثر بارشیں ہوتی رہتی تھیں لیکن اگر جمعرات کو مینہ برسنا شروع ہو جاتا، پھر رکنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ اس قسم کی بارش کو پنجابی اور اردو دونوں میں جھڑی کہا جاتا ہے، صرف تلفظ کا فرق ہے۔ [کر شور مور، بگلے جھڑیوں کا مینہ بلا دن / پی پی کرے پپیہا، مینڈک ملار

گاؤں، نظیر اکبر آبادی]۔ جس سال (یعنی 1947) عام لوگوں کے بقول "اجاڑا" پڑا، تین دن مسلسل اتنا مینہ برسا کہ جل تھل ایک ہو گیا۔ دریائے ستلج، جو سردیوں کے دنوں میں سویا پڑا رہتا تھا، بپھر گیا اور اس کا پاٹ ایک میل سے بھی زیادہ ہو گیا۔ دریا کے آر پار تحصیل نکودر اور لدھیانہ کی تحصیل جگراؤں کا آپس میں رابطہ ٹوٹ گیا۔ ان بارشوں کی وجہ سے فصلیں اتنی قد آور اور ہری بھری ہو گئیں کہ انہیں چھوڑتے بیحد افسوس ہو رہا تھا۔ جب ہمارا قافلہ اپنے سفر پر روانہ ہوا، مہت پور سے پہلے جو گاؤں مثلاً پہاڑیاں، بلندہ وغیرہ آتے تھے، وہ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی خالی ہو چکے تھے مگر ارد گرد کے دیگر دیہاتوں کے لوگوں کے قافلے ہمارے قافلے میں شامل ہوتے گئے، یوں ہمارا یہ قافلہ میلوں تک پھیل گیا۔ تا حدِ نگاہ آدمی ہی آدمی یا ان کے چھکڑے نظر آ رہے تھے۔ چونکہ مغربی پنجاب کے سکھ شرنارتھی ابھی پہنچے نہیں تھے اور مقامی سکھ تعداد میں اتنے کم تھے کہ انھیں ہمارے قافلوں پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ ہم لوگ بالکل غیر مسلح تھے۔ بندوق کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، ہمارے پاس تو تلوار بلکہ کلہاڑی تک نہیں تھی۔ اگر کسی کے پاس کچھ تھا تو وہ لاٹھی تھی یا چھکڑوں کے مالکوں کے پاس پرین (تلفظ: پ زے ان بمعنی چھانٹا)۔

قافلے پر کوئی حملہ نہیں ہوا تھا اور ہم گرتے پڑتے اگلے روز تقریباً دوپہر تک نکودر پہنچ گئے۔ وہاں عارضی کیمپ لگ چکا تھا۔ اس میں تحصیل نکودر ہی نہیں، بلکہ تحصیل پھلور، تحصیل جالندھر کے جنوبی حصے، جو نکودر سے ملحق تھا اور دریا پار تحصیل جگراؤں کے لوگ پناہ گزیں ہو چکے تھے۔ تحصیل جگراؤں کے لوگ کشتیوں پر آئے ہوں گے۔ ان میں دوسرے لوگوں کے علاوہ معروف صحافی اور ادیب حمید اختر اور ان کا خاندان بھی شامل تھا۔ وہ اپنی تحصیل کے گاؤں تہاڑا کے رہنے والے تھے اور اپنی کتابوں اور کالموں میں اس کیمپ کا اکثر ذکر کرتے رہتے تھے۔

جب ہمارا قافلہ گاؤں سے روانہ ہوا تھا، ہماری خواتین ہمارے ساتھ نہیں تھیں۔ ہماری پڑوسن بنو کا بیٹا، عبدالکریم بھٹا، جو جنگ عظیم دوم کے اختتام پر فوج سے ریٹائر ہو کر واپس آ چکا تھا اور کام چلاؤ بم بنانے کی ناکام کوشش کر چکا تھا، بہت کام آیا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح اپنے فوجی دوستوں کی مدد سے ایک فوجی ٹرک اور اس کی حفاظت کے لیے چند فوجی جوان منگوانے کا اہتمام کر لیا۔ ہماری گلی میں بھٹوں کے چار پانچ خاندان رہتے تھے۔ اس نے تمام بھٹوں کو اور ہماری خواتین کو اس ٹرک میں سوار کرایا اور بحفاظت لاہور پہنچ گیا۔

نکودر کیمپ کی حفاظت کی غرض سے اس وقت کے بھارت اور پاکستان کے سپریم کمانڈر سر کلاڈ آکنلیک (Claude Auckinleck) نے اس کے گرد گورکھا سپاہی تعینات کر دیے۔ بھارت کو پھر

بھی فوج مل گئی تھی مگر پاکستان کو اس معاملے میں سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ تقسیم کے فارمولے کے تحت فوجیوں اور سول ملازمین دونوں کو یہ اختیار (آپشن option) دیا گیا تھا کہ وہ جس ملک کے لیے چاہیں، اس کے لیے مقررہ فارم میں اپنی ترجیح کا خانہ پُر کر دیں۔ میرے بڑے بھائی عبدالمجید، جو اس وقت نئی دہلی میں ٹیلی فون کے محکمے میں ملازم تھے، اس اختیار کے تحت پاکستان کو اپنی خدمات پیش کر چکے تھے اور ان کا بٹوارے سے خاصا پہلے راولپنڈی تبادلہ ہو چکا تھا، اور وہ وہاں پہنچ چکے تھے۔ متحدہ ہندوستان کے جن مسلمان فوجیوں نے پاکستان کے لیے اپنا آپشن استعمال کیا تھا، وہ ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ مصر، عراق اور جنوب مشرقی ایشیا بشمول سنگاپور وغیرہ تک کے مختلف علاقوں میں بکھرے تھے۔ انھیں اپنے وطن واپس پہنچنے میں خاصا وقت صرف ہوتا تھا، اس لیے مسلمان تارکین وطن کے کیمپوں کی حفاظت کا ذمہ انھیں نہیں سونپا جا سکتا تھا۔ تقسیم کے بعد مشرقی اور مغربی پنجاب میں مسلموں اور غیر مسلموں کے مابین جو فسادات پھوٹے، اس کی ذمے داری زیادہ تر لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر عائد کی جاتی ہے کیونکہ اس نے نتائج و عواقب کا اندازہ لگائے بغیر دونوں ممالک کی آزادی کی تاریخوں میں خواہ مخواہ رد و بدل کر دیا۔ اصلاً یہ آزادی مارچ اپریل 1948 میں ملنا تھی مگر ماؤنٹ بیٹن نے اس کے لیے اگست کی تاریخیں مقرر کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی اور مغربی پنجاب میں جو حکومتیں قائم ہونا تھیں، انھیں تیاری کا مناسب وقت نہ ملا۔ کانگرس اور اکالی دل نے مشرقی پنجاب کے لیے ڈاکٹر گوپی چند بھارگوا اور مسلم لیگ نے پنجاب کے لیے نواب افتخار حسین ممدوٹ کو وزیر اعلیٰ نامزد کیا۔ دونوں ہی کمزور شخصیتوں کے مالک تھے، اوپر سے پولیس بھی دو حصوں میں بٹ چکی تھی، کچھ کی ہمدردیاں بھارت سے اور کچھ کی پاکستان سے تھیں۔ کوئی کسی کی بات نہیں سنتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب پولیس، جس کی پورے ہندوستان میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ وہ ملزموں کو پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالتی ہے، بالکل بے بس ہو گئی اور فسادیوں کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔

اگرچہ بھارت اور پاکستان کی نئی افواج کے کمانڈر انچیف مقرر ہو چکے تھے [یہ دونوں ہی انگریز تھے]، ابھی تک ان فوجوں کی عملاً تشکیل نہیں ہو سکی تھی۔ چنانچہ وقتی طور پر ان کے امور کی دیکھ بھال کے لیے متحدہ ہندوستان کے آخری کمانڈر انچیف سر کلاڈ آکنلیک دونوں فوجوں کے سپریم کمانڈر مقرر کر دیے گئے تھے۔ اگرچہ آکنلیک ہندوستان کی متحدہ فوج کی تقسیم کے سخت خلاف تھے، مگر سپریم کمانڈر کی حیثیت سے انھوں نے اپنے فرائض نہایت محنت اور دیانت داری سے سرانجام دیے۔ تارکین وطن کے دوسرے کیمپوں کا تو مجھے کچھ علم نہیں مگر انھوں نے نکودر کیمپ کی حفاظت کے لیے گورکھا سپاہی تعینات کیے۔ اصلاً نیپال کے باشندوں کو گورکھے کہا جاتا تھا۔ ان کے قد عموماً طور پر چھوٹے ہوتے تھے، شاید اسی لیے انھیں گورکھے

(بونے) کہا جاتا تھا۔ وہ مذہباً ہندو تھے اور اب بھی ہیں مگر تعصب انھیں چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ شاید اسی لیے سرکلاؤ آکنلیک نے انھیں ہمارے کیمپ کی حفاظت پر مامور کیا تھا اور یوں فسادی سکھوں کو اس پر حملہ کرنے کی کبھی جرأت نہ ہوئی۔

آج کل جب کسی خطے کے باشندوں کو اپنے دشمنوں کے حملوں، سیلاب، زلزلے وغیرہ کی وجہ سے ترکِ وطن کرنا پڑتا ہے، ان کی امداد کے لیے آکس فیم (Oxfam) جیسی تنظیمیں، اقوامِ متحدہ کے مختلف ادارے فوراً میدان میں آ جاتے ہیں، خیمے، ادویات، خوراک، نئے پرانے ملبوسات اور ضروریاتِ زندگی کی دیگر اشیا پہنچنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اپنی حکومت ہی نہیں بلکہ بعض غیر ملکی حکومتیں بھی اس کارِ خیر میں شریک ہو جاتی ہیں، مگر جن دنوں میں ہم نکودر کیمپ میں پناہ گزیں بنے، کوئی ہماری مدد کو نہ پہنچا۔ ہمیں اپنے ہی وسائل کا سہارا لینا پڑا۔ ہمارے بزرگوں نے عقل مندی یہ کی تھی کہ اپنے اپنے چھکڑوں میں فوری ضروریات کی اشیا کے علاوہ گھروں میں دستیاب آٹا، گندم کی چند بوریاں اور آٹا پیسنے کی دستی چکیاں بھی ساتھ لے آئے تھے۔ چکی پیسنے کی میری باری بھی آتی تھی۔ حسرت موہانی چکی پیسنے کے ساتھ ساتھ "مشقِ سخن" بھی کرتے رہتے تھے، اپنا یہ خانہ ہی خالی تھا۔ بس اتنا یاد ہے کہ چکی پیستے پیستے ہاتھوں پر چھالے پڑ گئے تھے جن کے نشان مدتوں باقی رہے۔

کیمپ پر سکھوں کے حملوں کا تو کوئی خاص اندیشہ نہیں رہا تھا بلکہ چھکڑوں کے بیلوں کے لیے چارہ قریب کے گاؤں کے سکھوں سے خرید لیا جاتا تھا۔ کیمپ کی حدود میں متعدد کنویں بھی آ گئے تھے، ہم اپنی ضرورت کا پانی بالٹیوں میں بھر کر وہاں سے لے آتے تھے، کبھی کبھار اس سے نہا بھی لیتے تھے مگر انسان کو حوائجِ ضروریہ سے بھی نپٹنا ہوتا تھا اور اس کا کیمپ میں کوئی انتظام نہیں تھا۔ چنانچہ جس کو جہاں خالی جگہ نظر آئی، وہیں بیٹھ کر فراغت حاصل کر لیتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جگہ جگہ غلاظت کے بڑے بڑے ڈھیر لگ گئے اور اس مسموم فضا میں بعض اوقات سانس لینا بھی دشوار ہو جاتا۔ ستم بالائے ستم، ایک روز بارش شروع ہوگئی اور تین دن مسلسل چھاجوں مینہ برستا رہا۔ جائیں تو کہاں جائیں۔ ڈنڈوں پر کھیس ڈال کر جو کام چلاؤ خیمے بنائے تھے، وہ بھی گر پڑے، جسم، کپڑے، غرضیکہ ہر شے پانی سے شرابور ہو گئی۔

وطن کی یاد آدمی کو بری طرح ستاتی ہے۔ ہمارے ساتھ کیمپ میں ایک نوجوان لڑکا تھا، وہ ہر وقت اپنے گھر اور گاؤں کو یاد کرتا تھا اور لوگوں کے منع کرنے کے باوجود وہ دوبارہ اپنا گھر دیکھنے چل پڑا لیکن کبھی واپس مڑ کر نہ آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سکھوں کے ہتھے چڑھ گیا اور انھوں نے اسے قتل کر دیا تھا۔

پھر ان پناہ گزینوں کو، جنھیں مغربی پنجاب کے مقامی باشندے "پناہ گیر" کہا کرتے تھے، پاکستان

پہنچانے کے لیے پاکستان کے فوجیوں کی حفاظت میں ٹرکوں اور بسوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان پر سوار ہونے کے لیے لوگوں کی اتنی بھیڑ ہوتی تھی کہ ان پر جگہ ملنا نا ممکن ہو جاتا۔ اس زمانے میں بسوں کی چھت پر بھی مسافر بٹھائے جاتے تھے اور ان کا سامان بھی وہیں رکھا جاتا تھا [ یہ سلسلہ اب بھی کہیں کہیں نظر آ جاتا ہے ]۔ ان مسافروں کو چھت کے اوپر چڑھانے کے لیے بس کے پیچھے آہنی سیڑھیاں لگی ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ میں نے ذرا پھرتی دکھائی اور ایک بس کی سیڑھیاں چڑھنے لگا مگر کسی دوسرے ضرورت مند نے میری ٹانگیں پکڑ لیں اور مجھے نیچے گھسیٹ لیا۔ میں پھر واپس "آنے والی تھاں" پر آ گیا۔

دن پر دن گزرتے گئے، بسوں ٹرکوں پر سوار ہونے والوں کی بھیڑ چھٹنے لگی اور ایک روز شروع اکتوبر میں مجھے اور میرے چھوٹے بھائی کو ایک ٹرک پر سوار ہونے کا موقع مل گیا۔ بد قسمتی سے اس ٹرک نے ہمیں جالندھر تو پہنچا دیا مگر خود دوسرے ٹرکوں کے ہمراہ مزید لوگوں کو لانے واپس نکودر چلا گیا۔ آسمان سے گرا، کھجور میں اٹکا، ہم ایک بار پھر کیمپ میں پھنس گئے۔ خوش قسمتی سے یہاں بھیڑ زیادہ نہیں تھی کیونکہ یہاں کے بیشتر پناہ گزیں پہلے ہی پاکستان جا چکے تھے۔ یہاں چند ایک خوانچہ فروش کھانے پینے کی مختلف اشیا بیچتے پھر رہے تھے۔ ہماری جیبوں میں جو تھوڑے بہت پیسے تھے ان میں بیشتر یہیں خرچ ہو گئے مگر یہاں زیادہ دیر قیام نہ کرنا پڑا۔ چند دنوں کے بعد پاکستانی فوجیوں کی نگرانی میں چند ٹرک پہنچ گئے۔ ان میں ہمیں آسانی سے جگہ مل گئی۔ ہر وقت دل میں یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ بلوائیوں نے اب حملہ کیا کہ اب کیا، خاص طور پر جب ہمارا ٹرک دریائے بیاس کا پل عبور کر رہا تھا اور امرتسر شہر میں سے گزر رہا تھا، ہمارے اندیشوں میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو گیا۔ امرتسر میں جرنیلی سڑک ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ سڑک کے جنوبی جانب مسلمانوں کا ایک محلہ تھا۔ اس کا نام شریف پورہ تھا۔ اس کے تمام مکان جل کر راکھ کا ڈھیر بن چکے تھے اور ان کے مکین کبھی کے بھاگ چکے تھے، شاید ان میں متعدد ہلاک بھی ہو گئے ہوں گے۔

ہم نے واہگہ سرحد عبور کی اور پاکستان میں داخل ہو گئے اور خدا کا شکر بجا لائے۔ مزید بندوبست ہونے تک بیشتر پناہ گزیں والٹن کیمپ میں قیام کرتے تھے مگر ہمارے ٹرک نے ہمیں ریلوے سٹیشن کے سامنے اتار دیا۔ بھوک کے مارے ہماری آنتیں قُل ھُوَ اللہ پڑھ رہی تھیں۔ ہم سامنے کے گول پارک میں چلے گئے۔ وہاں ایک ایک پیسے کی روٹیاں خریدیں۔ دال حسبِ معمول مفت مل گئی۔ ملتان کی جانب اکا دکا ریل گاڑیوں کے چلنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ہمیں ایک مال گاڑی پر جگہ مل گئی۔ اس پر سوار ہوئے اور نئی منزل کی جانب چل پڑے۔

انگریزوں کا قبضہ ہونے کے بعد دلی شہر پر جو سناٹا طاری ہوا، اس کے متعلق غالب نے اپنے

فقیدالمثال اسلوب میں اپنے جگری دوست ہرگوپال تفتہ کے نام اپنے خط میں لکھا تھا:

''ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط اور نہ انبساط۔''

اپنا، اپنے بیٹ اور وہاں کے لوگوں کا بھی کچھ یہی حال ہوا بلکہ ایک لحاظ سے دلی والوں سے بھی بدتر کیونکہ دلی تو پھر بھی اپنی جگہ قائم رہی اور وہاں کے بیشتر باشندے بھی وہیں مقیم رہے۔ اپنا تو بیٹ نہ صرف اجڑ گیا بلکہ غیروں کے قبضے میں چلا گیا۔

میری عمر اب 87 سے متجاوز ہو چکی ہے [اتنی عمر پانا بھی تجربے سے کم نہیں]۔ اس طویل زندگی میں بہت کچھ دیکھا، بہت کچھ کیا، بہت کچھ سہا، بہت کچھ پڑھا اور بہت کچھ دوسروں کو پڑھایا، پھر بھی سلویا پلاتھ (Sylvia Plath) کے الفاظ میں یہی کہہ سکتا ہوں:

I can never read all the books I want, I can never be all the people I want and live all the lives I want. And what do I want? I want to live and feel all the shades, tones, and variations of mental and physical experiences possible in life. And I am horribly limited.

اور سلویا پلاتھ نے یہ بھی کہا تھا:

If you expect nothing from anybody, you're never disappointed.

اگر اس کی توفیق مل جائے، پھر زندگی کتنی خوشگوار ہو جائے۔

زندگی خواہ عام آدمی ہی کی ہو عام ہو ہی نہیں سکتی۔ پھر شاہد حمید تو عام آدمی بھی نہیں۔ ٹالسٹائی کے
"جنگ اور امن"، دوستوفسکی کے "کرامازوف برادران" اور جین آسٹن کے "تکبر اور تعصب" کے
تراجم انھی کے قلم سے اردو زبان کی زینت بنے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد ادبی اردو تراجم کی تاریخ
ان کے بغیر نامکمل ہے۔ انتظار حسین اور ناصر کاظمی ان کے قریبی دوست رہے ہیں۔ محمد سلیم الرحمٰن اور
دیگر ہم عصر نامور ادیب اور شاعر ان کے کام کے مداح ہیں۔ "گئے دنوں کی مسافت" شاہد حمید سے
باکمال آدمی کی ابتدائی زندگی کی سرگزشت ہے جو انھوں نے کچھ قریبی دوستوں کے پُرزور اصرار پر
قلم بند کی ہے۔ شاہد حمید کی قدیم و جدید عالمی ادب پر گہری نظر ہے۔ علاوہ ازیں سوانحی ادب اور روایتی و
زبانی تاریخ کا وسیع تر مطالعہ بھی ان کا خاصہ ہے جس کی نمایاں جھلک "گئے دنوں کی مسافت" میں نظر آتی
ہے۔ 1928ء میں گورو، جالندھر میں پیدا ہوئے اور جس رچاؤ سے انھوں نے اپنے ساتھ ساتھ اس
زمانے، اپنی زمین اور اپنے لوگوں کی داستان لکھی ہے، نہ لکھتے تو ہم نہ صرف ایک ادب پارے سے بلکہ
زبانی تاریخ کے اس ورثے سے بھی محروم رہ جاتے جو مروجہ تاریخ کا حصہ نہیں ہوتا لیکن کسی خاص
زمانے میں خاص علاقے اور اس کے لوگوں کو سمجھنے میں روایتی تاریخ سے کہیں بہتر کردار ادا کرتا ہے۔
ISBN 978-969-640-072
9789696400721
www.readings.com.pk
Rs. 695
KQ-781-175